باسمہٖ تعالیٰ

زمانہ کی ریگِ رواں پر

کاروانِ شوق کے نقوشِ قدم

منزل بہ منزل

(پرویز)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام (۲۵ بی) گلبرگ لاہور

نام کتاب ——————— منزل بہ منزل

مؤلف ——————— پرویز

ناشر ——————— ادارہ طلوع اسلام، لاہور

پریس ——————— اشرف پریس۔

ایبک روڈ۔ لاہور

ایڈیشن ——————— اوّل۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء

سنگِ میل

تعارف ———— (د)

(۱) بادۂ زندگی ———— (کنونشن ۱۹۵۶ء) ———— ۱

(۲) خُمِ زندگی ———— (کنونشن ۱۹۵۷ء) ———— ۴۱

(۳) پیامِ فصلِ بہار ———— (کنونشن ۱۹۵۹ء) ———— ۷۹

(۴) معمارِ حرم ———— (کنونشن ۱۹۶۰ء) ———— ۱۳۱

(۵) مژدۂ صبح ———— (کنونشن ۱۹۶۱ء) ———— ۱۶۵

(۶) شعلۂ نمناک ———— (کنونشن ۱۹۶۲ء) ———— ۱۸۹

(۷) قیامتِ موجود ———— (کنونشن ۱۹۶۳ء) ———— ۲۲۹

(۸) حرفِ دل نواز ———— (کنونشن ۱۹۶۵ء) ———— ۲۶۹

(۹) رونقِ کاشانہ ———— (کنونشن ۱۹۶۶ء) ———— ۳۰۵

(۱۰) نوائے صبحگاہی ———— (کنونشن ۱۹۶۷ء) ———— ۳۵۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طائرِ پیش رس

ماضی قریب میں جتنی تحریکیں ہمارے برصغیر میں مسلمانوں کی طرف سے اٹھیں، ان کا ایک عمومی جائزہ لینے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ تحریکیں یا تو محض شورش برپا کرنے کے لئے اٹھائی گئیں اور یا کسی ہنگامی مقصد کے حصول کے لیے۔ ان میں تحریکِ پاکستان ٹھوس بنیادوں پر اٹھی تھی۔ اور اس کے پیشِ نظر مقصد بھی بڑا بلند تھا۔ لیکن اس تحریک کی اس قدر اہمیت کے باوجود، یہ حقیقت اپنی جگہ باقی رہتی ہے کہ یہ بھی کوئی فکری تحریک نہیں تھی جس کا مقصد قوم کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا کرنا تھا۔ یہ ایک سیاسی جنگ تھی جسے نہایت حسنِ تدبر سے لڑا اور دیدہ درانہ فراست سے جیتا گیا۔ ماضی قریب تو ایک طرف، جہاں تک ہماری نگاہ کام دیتی ہے، اس قسم کی تحریک صدیوں سے اسلامی ممالک میں نہیں اٹھی۔ افراد نے بلاشک اس باب میں کوششیں کیں اور ان میں سے بعض ایک حد تک کامیاب بھی ہوئیں، لیکن ایک مسلسل تحریک کی شکل میں اس قسم کی کوئی کوشش سامنے نہیں آئی ____ طلوعِ اسلام کی فکری تحریک اس ضمن میں پہلی کوشش ہے۔

'طلوعِ اسلام' کا اجراء، ایک ماہنامہ کی شکل میں، ۱۹۳۸ء میں وجود میں آیا۔ اس وقت اگرچہ اس کا مسلک و مقصد، تحریکِ پاکستان کی تائید تھا لیکن اس کی یہ تائید ایک "سیاسی مقصد" کے حصول کے لئے نہیں تھی۔ اس کا موقف (علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ قرآنی تصور کی ہمنوائی میں) یہ تھا کہ اسلام، ایک دین (یعنی نظامِ حیات) کی شکل میں اسی صورت میں زندہ ہوسکتا ہے جب

مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں قرآنی اصول و اقدار کی حکمرانی ہو۔ بالفاظِ دیگر پاکستان کا خطۂ ارض یا مملکت' اس کے نزدیک' مقصود بالذات نہیں تھا۔ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اور وہی بلند مقصد طلوعِ اسلام کا پیشِ نہاد تھا۔ آپ اُس دور کے طلوعِ اسلام کے فائیلوں کو دیکھئے۔ آپ کو یہ حقیقت نمایاں طور پر نظر آجائے گی کہ اس نے دو قومی نظریہ اور مطالبۂ پاکستان کی تائید میں وہی قرآنی دلائل پیش کئے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اس طرح' یہ حصولِ پاکستان کی سیاسی جنگ کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو ذہنوں میں جاگزیں کرتا چلا گیا کہ اسلام سے مقصود کیا ہے۔ اور دین کا مطمحِ نگاہ کیا۔ وہ کس قسم کا ضابطۂ زندگی اور نظامِ حیات پیش کرتا ہے' اور وہ ضابطہ اور نظام کس طرح دیگر ضوابط و نظامہائے حیات سے منفرد اور بے مثال ہے۔ وہ کیوں کسی اور ضابطہ سے مفاہمت نہیں کر سکتا اور اس میں کیوں کسی اور نظام کا پیوند نہیں لگایا جا سکتا۔ اُس زمانے کے سیاسی بحران میں اتنا ہی ممکن تھا کہ ان تصورات کو اصولی طور پر پیش کیا جاتا۔ تفصیل میں جانے کی اُس وقت فرصت ہی نہیں تھی۔

یہ فرصت تشکیلِ پاکستان کے بعد میسر آئی۔ یوں بھی یہ مسائل اُسی وقت عملی حیثیت اختیار کر سکتے تھے جب ہمیں ایک خطۂ زمین میسر آجاتا۔ لہٰذا' حصولِ پاکستان کے بعد' طلوعِ اسلام نے اپنی توجہ اور سعی و کاوش کا رُخ اس نقطہ پر مرکوز کر دیا کہ اس نظامِ حیات کے خط و خال کیا ہیں' اور بہ حالاتِ موجودہ اس کے قیام کی عملی صورت کیا۔ گزشتہ بیس سال سے یہ اسی راستے پر برابر آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے نہ کبھی کوئی ہنگامہ کھڑا کیا ہے' نہ کوئی شورش برپا۔ حتیٰ کہ اس نے عملی سیاسیات میں بھی کبھی حصہ نہیں لیا۔ یہ ایک خالص فکری تحریک ہے جس کا مقصد' قوم کے قلب و نگاہ میں صحیح قرآنی انقلاب پیدا کرنا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے ہر سیاسی مسلک کا قرآنِ کریم کی روشنی میں جائزہ لیا ہے لیکن اپنی کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنائی۔ اس نے مروجہ اسلام کے ہر گوشے کو' قرآن کی روشنی میں جانچا اور پرکھا ہے لیکن کوئی نیا فرقہ پیدا نہیں کیا۔ وہ پارٹی بازی اور فرقہ سازی کو قرآنِ کریم کی نصِ صریح کی رُو سے شرک سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک' مسلمان اپنی آئیڈیالوجی کی بنا پر' تمام

غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک منفرد "پارٹی" (امت) ہے اور امت کے اندر پارٹی یا فرقہ، دین کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ طلوع اسلام تین نمازوں اور نو دن کے روزوں کی تلقین کرتا ہے، یا منکرِ شانِ رسالت ہے، یہ سب مخالفین کا جھوٹا پراپیگنڈہ اور الزام تراشی ہے۔ یہ ہر اس عقیدہ، مسلک، رسم و رواج، یا نظریہ و تصور کی مخالفت کرتا ہے جو قرآن مجید کے خلاف ہو (خواہ اسے کسی کی طرف سے پیش کیا جائے) اور ہر اس عقیدہ، مسلک، نظریہ یا تصور کی تائید و حمایت کرتا ہے جو قرآن کے مطابق ہو۔ (خواہ وہ کسی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ کی طرف منسوب ہو) اس کی مخالفت اور موافقت کا معیار، خدا کی یہ زندہ و پائندہ کتاب ہے۔ حتیٰ کہ اس کے نزدیک روایات، تاریخ، تفسیر یا فقہی قوانین میں سے بھی وہی صحیح سمجھے جا سکتے ہیں جو قرآن کے خلاف نہ ہوں۔ قرآنی تعلیم کو وہ علم و بصیرت کی رو سے سمجھنا اور عقل و فکر کی رو سے پیش کرنا ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل خدا کی اس آخری اور مکمل کتاب کے علاوہ کہیں اور نہیں مل سکتا۔

شروع شروع میں یہ فکر انفرادی طور پر پھیل رہی تھی لیکن جب اس کے متفقین کا حلقہ وسیع ہو گیا تو تجویز یہ کیا گیا کہ ایک شہر یا بستی کے متفقین اپنے مقامی حالات کے مطابق، اس فکر کو تنظیمی حیثیت سے اجتماعی طور پر آگے بڑھائیں۔ اس تنظیمی ہیئت کا نام "بزمِ طلوع اسلام" ہے۔ ان بزموں کا مقصد اور مشن، طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کو عام کرنا ہے، اور بس۔ یہ نہ سیاسی جماعتیں ہیں، نہ مذہبی فرقے۔ نہ ہی عملی سیاست سے انہیں کوئی سروکار ہے۔

۱۹۵۶ء سے ان بزموں کے ایک سالانہ اجتماع کا آغاز ہوا جسے "طلوع اسلام کنونشن" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان اجتماعات میں، تحریک سے متعلق تنظیمی امور پر بحث و تمحیص کے علاوہ بانی تحریک پرویز صاحب کا ایک خصوصی خطاب مرکزِ توجہ ہوتا ہے۔ اس خطاب میں وہ سال بھر کے اہم افکار و حوادث کا جائزہ لے کر قرآنی روشنی میں ان پر محاکمہ کرتے ہیں اور پھر بتاتے ہیں کہ ان حالات میں قرآن، کاروانِ انسانیت کے لئے کون سے راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ اس اعتبار سے پرویز صاحب کے یہ خطابات، تحریکِ طلوع اسلام کے دائرے میں محدود نہیں رہتے، بلکہ ان کی حیثیت عالمگیر

افادیت کی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خطابات نہایت توجہ سے سنے، اور گہری دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

یہ خطابات اس وقت تک طلوعِ اسلام کے صفحات میں محفوظ تھے۔ لیکن احباب کا تقاضا تھا، کہ انہیں یکجا کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تاکہ، ایک تو ان تک دسترس عام ہو جائے، اور دوسرے حلقۂ طلوعِ اسلام سے باہر کی دنیا کو معلوم ہو جائے کہ یہ تحریک ہے کیا، اس کا مسلک و مقصد کیا ہے اور منتہیٰ و مطلوب کیا۔ یہ افرادِ قوم کے قلب و نگاہ میں کس قسم کی تبدیلی پیدا کرنا چاہتی ہے، اور وہ نظامِ حیات کیا ہے جسے اسلام، انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے جنتِ ارضی اور فردوسِ اُخروی کا ضامن قرار دیتا ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر، ادارۂ طلوعِ اسلام نے احباب کی اس تجویز سے اتفاق کیا اور ان اہم انقلابی خطابات کی اشاعت کا فیصلہ کیا۔

لیکن ان خطابات کو مرتب کرنے وقت، یہ حقیقت سامنے آئی کہ جب تک اس پسِ منظر کو سامنے نہ لایا جائے جس میں یہ خطابات پیش کئے گئے تھے، ان کی افادی حیثیت کما حقہٗ نمایاں نہیں ہو سکے گی۔ بنابریں، ایک خطاب کو پیش کرنے سے پہلے، مختصر طور پر اس کنونشن کی روئیداد کو بھی سامنے لایا گیا ہے جس میں وہ خطاب وجۂ ارتعاشِ قلوب و اذہان ہوا تھا۔ اس طرح، یہ مجموعہ، گویا تحریکِ طلوعِ اسلام کی دس سالہ تاریخ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تحریک کن کن تدریجی مراحل میں سے گذرتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے۔ اس میں ایک بات آپ کو منفرد نظر آئے گی۔ اور وہ یہ کہ جن راستوں سے یہ تحریک گزری ہے وہ کتنے ہی مختلف، اور جو مراحل اس نے طے کئے ہیں وہ کیسے ہی متنوع کیوں نہ ہوں، اس کے سامنے مقصد پہلے دن سے آج تک ایک ہی رہا ہے اور اس کا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا چلا گیا ہے۔ اس نے جو کچھ پہلے دن کہا تھا وہی کچھ آج کہہ رہی ہے۔ نہ اس کے مقصد میں کہیں تبدیلی ہوئی ہے، نہ مسلک میں کوئی تضاد — جو تحریک بھی خالص قرآن کی شمعِ نورانی کو مشعلِ راہ بنا کر جادہ پیما ہوگی، اس کی یہی کیفیت ہوگی۔

ہمیں امید ہے کہ اس مجموعہ کا، حلقۂ طلوعِ اسلام سے باہر بھی، دلچسپی سے مطالعہ کیا جائے گا۔ اس سے جہاں قارئین کو اس تحریک کا صحیح صحیح تعارف حاصل ہوگا، دوسری طرف ان غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہو جائے گا جو اس کے خلاف پھیلائی جاتی ہیں — افادی حیثیت سے قطع نظر، اگر آپ ان

خطابات کو ادبی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھیں گے تو ان میں آپ اپنے بلند اور شستہ ذوق سلیم کی تسکین کا سامان پائیں گے کہ فطرت نے اس داعی انقلاب کو رعنائی فکر کے ساتھ شادابیٔ قلم و شگفتگی بیان کی بخشائش سے بھی فراواں حصّہ عطا کیا ہے۔ اس کی شہادت آپ کو آئندہ صفحات میں ملے گی۔

والسلام!

ناظم ادارہ طلوع اسلام
گلبرگ۔ لاہور

اکتوبر ۱۹۶۸ء

بادۂ زندگی[1]

طلوعِ اسلام کی پہلی کنونشن

منعقدہ لاہور

۱۵ تا ۱۹ نومبر ۱۹۵۶ء

※

(روئداد مطبوعہ طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۵۶ء)

---

[1] خیز و بجامِ تشنہ بادۂ زندگی فشاں

طائرِ پیش رس

مغربی پاکستان کے تاریخی شہر اور دارالسلطنت لاہور میں طلوعِ اسلام کنونشن کا انعقاد پاکستان کی تاریخ میں قرآنی فکر و نظر کی اجتماعی تنظیم کا پہلا نشان تھا، اور بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کی طرف سے جب اس مؤتمر کی تجویز منظرِ عام پر آئی تو ملک کے طول و عرض سے ان تمام حلقوں نے اس کا پُرجوش اور والہانہ خیر مقدم کیا جو کاروانِ ملّت کو قرآنی تصورات کی روشنی میں منزلِ مقصود کی جانب رواں دواں دیکھنے کے آرزومند تھے۔ اس خوش آئند تجویز کے منظرِ عام پر آتے ہی بزمِ طلوعِ اسلام کے دفتر میں خطوں اور تاروں کا تانتا بندھ گیا اور سب نے محسوس کیا کہ ان کی دینی آرزوؤں اور اُمنگوں کی تشکیل کی ساعتِ سعید قریب آ گئی۔

"طلوعِ اسلام" کی مسلسل تین اشاعتوں میں کنونشن کے اغراض و مقاصد، اس کا پروگرام اور ضروری تجاویز ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچا دی گئیں۔ ان وضاحتوں کی روشنی میں ملک کی بزہائے طلوعِ اسلام نے اپنے مندوبین، مبصرین اور تجاویز کی ترسیل سے "بزمِ طلوعِ اسلام لاہور" سے رابطہ پیدا کر لیا۔ کنونشن کی تاریخوں کا انتظار عید کے چاند کی طرح شدت اختیار کر گیا۔ اور لاہور میں مندوبین اور مبصرین کی روانگی کی اطلاعات موصول ہونے لگیں۔

۳ ر نومبر کی دوپہر کو تیز گام سے محترم پرویز صاحب کی قیادت میں[1] ادارہ طلوعِ اسلام کے پہلے قافلے کی

---

[1] پرویز صاحب اُس زمانے میں کراچی میں قیام پذیر تھے۔

آمد آمد تھی۔ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کی مجلسِ عاملہ اور مختلف مکاتیبِ فکر کے ممتاز زعماء نے لاہور ریلوے اسٹیشن پر ان کا شایانِ شان خیر مقدم کیا اور دارالقرآن شالامار ٹاؤن میں (جہاں کنونشن منعقد ہو رہی تھی) ان کے پہنچتے ہی کنونشن کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔

دارالقرآن کے وسیع سبزہ زار میں کنونشن کے پنڈال اور مہمان کیمپ کے انتظامات جاری تھے۔ بزم کے رضاکاروں نے ساری رات اس سلسلہ میں اپنا کام جاری رکھا اور ۱۵ر نومبر کی صبح کو جب فجر کی اذانیں گونج رہی تھیں، رضاکاروں کی سرتوڑ جدوجہد اس سبزہ زار میں ایک خوبصورت پنڈال، مہمان کیمپ اور قیام وطعام کے متعلقہ انتظامات کی تکمیل کر چکی تھی۔

۱۵ر نومبر کی صبح کو طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی کنونشن کے مندوبین اور مبصرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور رات کے نو بجے تک جبکہ کنونشن کا پہلا اجلاس شروع ہو رہا تھا، کراچی سے پشاور اور آزاد کشمیر تک کے مندوبین اور مبصرین کی آمد برابر جاری تھی۔ شمعِ قرآنی کے ان پروانوں میں بڑے بڑے انجینئر بھی تھے اور پروفیسر بھی۔ ڈاکٹر بھی تھے اور ایڈووکیٹ بھی۔ رہ و رسمِ خانقاہی کی مسندوں سے دل برداشتہ سابق گدی نشین اور پیر بھی تھے اور مُلّا ازم کے منبروں کے اعزاز سے روگرداں "مولانا" بھی۔ یہی نہیں! بلکہ ان میں شہروں کے مخلص مزدور بھی تھے اور دیہات کے پاکیزہ فطرت اور ایثار پیشہ زمیندار اور کسان بھی۔ ان میں کوٹ پتلون والے دردمند "صاحب بہادر" بھی تھے اور صاحبِ عزم تہمد پوش بھی۔۔۔ ان سب کے دلوں میں قرآنی فکر کی شمعیں جگمگا رہی تھیں۔ اور ان کی روحیں اخوت اور ربوبیتِ عامہ کی والہانہ تڑپ اور خلش سے مالا مال تھیں۔ باہمی ربط و ضبط کی مخلصانہ کشش انھیں ایک لازوال رشتے میں ہم آویز کئے جا رہی تھی۔ اور اپنی اجتماعی زندگی کے اس پہلے ہی روز وہ دل کی گہرائیوں سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ دارالقرآن کی اثر انگیز فضا میں وہ گویا مدتوں سے ایک ہی بستی کے باشندے اور ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ ان کا رشتہ چولی اور دامن کا رشتہ ہے اور یہ رفاقت زندگی اور موت تک کی رفاقت ہے۔ رات کے اس اولین اجتماع میں ان کی مجلس پر ستاروں کی انجمن کا گمان ہو رہا تھا اور سرزمینِ پاکستان پر یہ انوکھی انجمن قرآنی نظام کی طلوعِ سحر کے جنون میں سرشار ہوئی جا رہی تھی۔

پہلی نشست

——— کنونشن کا پہلا اجلاس باہمی تعارف کے سلسلہ میں تھا۔ اور

کتنا دل نواز تھا وہ منظر جب باری باری تمام مندوبین اور مبصرین اپنے ذاتی تعارف کے ساتھ طلوع اسلام کی کشتِ نوبہار کی روئیداد بیان کر رہے تھے۔ وہ کشتِ نوبہار جسے انھوں نے سنگلاخ زمینوں میں اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ رات کے گیارہ بجے یہ اجلاس اجتماعی امیدوں اور آرزوؤں کے ابھرتے ہوئے دلولوں میں اختتام پذیر ہو گیا۔

دوسری نشست

۱۶ نومبر کی صبح کو کنونشن کی دوسری نشست ٹھیک آٹھ بجے صبح شروع ہوئی۔ تلاوت کلام پاک کے بعد سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی لے ایوان کی پرسکون فضا میں گونجی۔ اس کے بعد اقبالؒ کے اس ترانے

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی

سے ایوان میں تاثر کا ایک سماں بندھ گیا اور ساقی کے حضور میں اقبالؒ کی یہ فریاد حاضرین کے دلوں کی پکار بن کر گونجی۔ اور پھر جب آخر میں یہ کہا گیا کہ —

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
ترے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی

تو دلوں کے سوز و گداز کی کیفیت نہ پوچھئے۔

رپورٹ ادارہ طلوع اسلام

اس کے بعد ناظم ادارہ نے، ادارہ کی اٹھارہ سالہ جد و جہد کا اجمالی خاکہ پیش کیا۔ یہ خاکہ طلوع اسلام کے ارتقائی سفر کی مختصر داستان بھی تھا، اور قرآن کی فکری و نظری اشاعت و تبلیغ کی مجمل تاریخ بھی — انہوں نے آغازِ سفر کے تیس سال قبل کے وہ ایام یاد دلائے جب شملہ کے صندل ہال اور سیکرٹریٹ کی مسجد میں پرویز صاحب نے تند و تیز ہوا میں قرآنی فکر کی قندیل پہلے پہل روشن کی اور پھر بالترتیب بتایا کہ کس طرح یہ مردِ درویش نامساعد حالات کی ظلمتوں میں عزم و ہمت کے ساتھ اس شمعِ نور بیز کو لے کر صراطِ مستقیم پر بڑھتا چلا گیا۔ تحریکِ پاکستان کی شمشیر و سپر بن کر اس نے کس قلندرانہ جرأت سے متحدہ

قومیت کے سومنات کو پاش پاش کیا۔ کانگریس کے زرخرید ملاؤں کے جبّہ و دستار کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور تحریکِ پاکستان کی شاہراہ پر شمعِ قرآنی ہاتھ میں لے کر محترم قائداعظمؒ کے ساتھ دوش بدوش آگے بڑھتا گیا۔

انھوں نے اس کی بھی وضاحت کی کہ اسلامی تصورات کی مردانہ وار حفاظت کی پاداش میں "طلوعِ اسلام" پے درپے مالی خساروں کا شکار رہا اور پرویز صاحب کی جانِ ناتواں انتہائی عزم اور فراخ دلی کے ساتھ ان خساروں کا بارِ گراں برداشت کرتی چلی گئی۔ طلوعِ اسلام نے ۱۹۳۸ء میں صحافت کے خارزار میں اپنا پہلا قدم رکھا۔ اور آج کے دن تک وہ کہیں سے مالی امداد حاصل یا قبول کئے بغیر ملت کی کانٹوں بھری راہ صاف کرتا، قرآنی فکر کی ضوفشانیوں سے ذہنی تاریکیوں کو جگمگاتے رواں دواں منزلِ مقصود کی جانب بڑھا جا رہا ہے۔ اس نے "مذہب" کی بجائے مسلمانوں کو ازسرِنو "دین" کی طرف بلایا۔ اس نے خدا کے کلیسائی تصور کی بیخ کنی کی۔ اس نے "آدمی" کو "انسان" بننے کی دعوت دی۔ قانونِ مکافات کے اثرات و نتائج کا تسلسل نمایاں کیا۔ زندگی کی ابدی و ازلی حقیقتوں کی نقاب کشائی کی۔ مقامِ محمدیؐ کا قرآنی تصور واضح کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے قرآنی اصطلاحات کے مفہوم بھی متعین کئے۔

پرویز صاحب کا انقلاب آفریں خطاب

اس رپورٹ کے بعد محترم پرویز صاحب مائک پر تشریف لائے۔ پروگرام کے مطابق انھوں نے "بادۂ زندگی" کے عنوان سے اپنا اہم خطاب اس اجلاس میں پیش کرنا تھا۔ چنانچہ اسٹیج پر نگہ انتظار کے لئے صبحِ امید کی جگمگاتی ہوئی کرن بن کر نمودار ہوتے اپنے مخصوص حسنِ بیان سے "بادۂ زندگی" کے ساغر لنڈھاتے تشکیلِ نظامِ قرآنی کے عملی کوائف اور ممکناتِ زندگی کے چہرے سے ایک ایک نقاب سرکاتے چلے گئے ان کے عزائم کا پیچ و تاب، سوز و گداز کی گہرائیوں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہا تھا اور ان کے زورِ خطابت کی حقیقت کشائیاں اُن اندھیری راہوں میں فکرِ قرآنی کا نور بکھیرتی جا رہی تھیں جو صدیوں سے کاروانِ ملت کے ذوقِ سفر کے لئے سراپا انتظار بنی جا رہی ہیں۔

دینِ حق کے مفکرِ جلیل پرویز کی خوش نصیبیاں نہ پوچھیے۔ اس نے ذہنوں کی سنگلاخ زمینوں میں

مسلسل تیس برس تک قرآنی تصورات کے بیج بوتے۔ شب و روز انہیں خونِ جگر سے سینچا۔ تیس برس کے بعد اب بتدریج کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ نہیں! بلکہ فکر و نظر کی یہ نرم و نازک کونپلیں اب لہلہاتی ہوئی کشتِ نوبہار میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ کنونشن کے ایوان کا ایک ایک ذرہ انہیں صبحِ بہار کی نمود کی نوید جانفزا سنا رہا تھا۔ چنانچہ مائک کے سامنے آتے ہی اُن کی آواز اس سرور انگیز تصور سے کچھ تھرتھرانے لگی۔ ان کی آرزوؤں کا سوز و ساز اشک بن بن کر آنکھوں سے بہنے لگا۔ انھوں نے چند ہی لمحوں میں حاضرین پر ایک سحر طاری کر دیا۔ اور جب تک ان کا خطاب جاری رہا، سب کی آنکھیں بار بار آنسوؤں سے تر بتر ہوتیں۔ وہ خطاب یہ تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بادۂ زندگی

خطاب بہ رُفقائے سفر

خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

برادرانِ عزیز! السلام علیکم و رحمۃ اللہ!

آج کا اجتماع کس قدر مبارک و مسعود ہے جس میں پاکستان کے دور و دراز گوشوں کے احباب، سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے محض اس مقصد کے لئے یکجا جمع ہوئے ہیں کہ وہ سوچیں کہ خدا کے اس پیغام کو زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچانے کے لئے کیا تدابیر عمل میں لائی جائیں جس کے اتباع میں نوعِ انسانی کی فلاح و سعادت کا راز مضمر ہے اور جو شرفِ انسانیت کی تکمیل کا واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

آں کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم — حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
نوعِ انساں را پیامِ آخریں!
حاملِ اُو رحمۃ للعالمینؐ

اور جمع بھی قرآن ہی کے اس طریق کے مطابق ہوتے ہیں جو اس نے تقسیم کار کے محکم اصول کی رُو سے ایسے امور کے لئے تجویز کر رکھا ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (۹/۱۲۲) کہ ہر مقام کی جماعت سے چند افراد تفقہ فی الدین کے لئے مرکزی مقام میں آئیں اور جو کچھ وہاں سے سیکھیں واپس جا کر باقی ماندہ افرادِ جماعت کو اس سے آگاہ کریں تاکہ اس طرح یہ تمام افراد، زندگی کی خطرناک راہوں سے بچ کر چلیں۔ یہ اجتماع درحقیقت میری زندگی کے دیرینہ خوابوں کے ایک منظر کی تعبیر ہے جسے میں اس شگفتہ و شاداب محفل کی شکل میں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں جس کا ہر گوشہ غالب کے الفاظ میں

دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

حیرت انگیز تبدیلی

جب میں نے آج سے بیس پچیس سال اُدھر، پہلے پہل قرآن کی طرف دعوت دی ہے تو میری آواز، ذہنی جمود و تعطل کی برفانی سِلوں سے ٹکرا کر یکسر ناکام و نامراد واپس آجاتی تھی۔ ہرچند میرا ایمان تھا کہ حق و صداقت کی کوئی آواز صدا بصحرا نہیں رہا کرتی، مجھے اس کی توقع کبھی نہیں ہوتی تھی کہ میری مختصر سی زندگی میں ایسا انقلاب واقع ہو جائے گا کہ ملک کے گوشے گوشے سے اس کی صدائے بازگشت اُبھرنی شروع ہو جائے گی اور یہ فضا قرآن کے نغماتِ جانفزا سے اس طرح معمور ہو جائے گی۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔ (۱۰/۵۸) یہ سب اس مبداءِ فیض کی کرم گستری کا تصدق ہے جس کا قانونِ مکافات ایک ننھے سے بیج کو سرسبز و شاداب تناور درخت میں یوں تبدیل کر دیتا ہے۔ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔ (۴۸/۲۹) جیسے جب شگوفہ پھوٹتا ہے تو اس کی پہلی کونپل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے۔ پھر وہ طاقت پکڑ کر ذرا مضبوط ہو جاتی ہے، پھر اور مضبوط۔ پھر جب اُسکے

خوشوں میں دانے پڑنے کا وقت آجاتا ہے تو وہ اپنی نال پر محکم و استوار طریق سے کھڑی ہو جاتی ہے کاشتکار جب اپنی محنت کو اس طرح ثمر بار ہوتے دیکھتا ہے تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہی چیز اس کھیتی کے مخالفین کے سینے پر سانپ بن کر لوٹ جانے کا موجب بن جاتی ہے۔

آپ کو یہ سن کر حیرت و مسرت ہوگی کہ یہ آواز پاکستان کی چار دیواری تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ یورپ اور امریکہ تک بھی پہنچ چکی ہے۔ چنانچہ ان ممالک کے ایسے ریسرچ اسکالرز جنہیں اسلامیات سے دلچسپی ہوتی ہے، قرآنی فکر و نظام سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے اکثر میرے پاس آتے رہتے ہیں فضا کی یہی وہ سازگاری ہے جس سے میرے حوصلے بلند اور ہمتیں جوان ہو جاتی ہیں اور اس کی امید بندھ جاتی ہے کہ شاید میری یہ آرزو بھی پوری ہو جائے کہ میں مرنے سے پہلے دنیا کے کسی ایک گوشے میں ہی سہی اس قرآنی نظام کی ایک جھلک دیکھ لوں جسے آج سے چودہ سو سال پہلے آسمان کی آنکھوں نے ایک بار خطۂ حجاز میں محمد رسول اللہ والذین معہٗ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے مقدس ہاتھوں سے متشکل دیکھا تھا اور جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ آج تک حیران و سرگرداں ہے۔

کتنی حسین ہے یہ تمنا اور کس قدر تابناک ہے یہ آرزو کہ جس کے تصور سے ذہن انسانی کا یہ عالم ہے کہ

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال

سوچئے کہ جس جانِ بہار کے تصور سے نور و نکہت کی ضیا رپاشیوں اور عنبر فشانیوں کا یہ عالم ہو وہ اگر کہیں لباسِ مجاز میں وجہ شادابی قلب و نظر بن جائے تو کائنات کے اس اُجڑے ہوئے بہشت کا نقشہ کیا سے کیا ہو جائے۔

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی — جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
باز تسکینِ دلِ ناشاد شو — باز اندر سینہ ہا آباد شو
باز در عالم بیار ایامِ صلح — جنگ جویاں را بدہ پیغامِ صلح
شورشِ اقوام را خاموش کن — نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن
باز ایں اوراق را شیرازہ کن — باز آئینِ محبت تازہ کن
سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر — از جبینِ شرمسارِ ما بگیر!

اگر مرنے سے پہلے اُس نظامِ عالمتاب کی ایک جھلک کہیں نظر آجائے تو کس فخر و مسرت سے آسمان سے کہا جا سکے کہ

دیدۂ آغازم۔ انجامم نگر

وَكَانَ ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (۲۳/۱۹)

برادرانِ گرامی قدر! انگریزی میں کہا کرتے ہیں (TRUTH IS STRANGER THAN FICTION) یعنی بعض حقیقتیں افسانوں سے بھی زیادہ تعجب انگیز ہوتی ہیں۔ آپ کسی اجنبی سے کہیئے کہ ایک قوم ہے جس کا یہ ایمان ہے (یعنی محض خیال نہیں بلکہ ایمان) کہ دنیا میں ایک کتاب ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں اُن کی راہ نمائی کے لئے خدا کی طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوئی ہے۔ اس کا ایک ایک حرف محفوظ ہے۔ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی اس کی مثل و نظیر مرتب نہیں کر سکتے۔ یہ کتاب سفرِ زندگی میں اس راستے کی طرف

ایک تعجب انگیز حقیقت

راہ نمائی کرتی ہے جو سب سے زیادہ سیدھا، سب سے زیادہ متوازن اور سب سے زیادہ محکم ہے۔ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے اس دنیا میں بھی عزت و عظمت، شان و شوکت۔ قوت و حشمت اور حکومت و سطوت ملتی ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی سرفرازی و سربلندی۔ انہیں اس کا بھی اعتراف ہے (اور اس اعتراف کا وہ ہر مقام پر اعلان کرتے رہتے ہیں) کہ ان کی ذلت و پستی، نکبت و زبوں حالی بیچارگی و درماندگی کا واحد سبب یہ ہے کہ انہوں نے اس کتابِ عظیم کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ آپ اُس اجنبی سے یہ سب کچھ کہیں اور اس کے بعد اسے بتائیں کہ اس کے ساتھ ہی اُس قوم کی حالت یہ ہے کہ جب کوئی خدا کا بندہ انہیں اس کتاب کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ قوم پنجے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑ جاتی ہے اور اس کی مخالفت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی۔ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا (۷۲/۱۹) اس قوم کے بڑے بڑے راہ نمایانِ شریعت اور ہادیانِ طریقت جگہ جگہ لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ۔ دیکھنا! اس کتاب کا ایک لفظ بھی تمہارے کان میں نہ پڑنے پائے۔ تم نہ اسے خود سننا نہ کسی اور کو سننے دینا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ تم اس آواز کو دلائل و براہین سے دبا نہیں سکو گے۔ اس لئے اسے ناکام بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں دیکھو کہ اس کتاب کا ذکر ہو رہا ہے وَالْغَوْا فِيْهِ۔ بس شور مچانا شروع کر دو۔ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔ (۴۱/۲۶)

اس سے توقع ہو سکتی ہے کہ تم اس دعوت کو ناکام بنا سکو۔ وہ گلی گلی، محلے محلے اس کی تلقین کرتے اور اس آواز کو بلند کرنے والوں کے خلاف بہتان تراشیوں اور دروغ بافیوں سے عوام کے جذبات کو اس طرح بھڑکاتے رہتے ہیں کہ يَكَادُونَ يَسْطُونَ بِالَّذِينَ يَتْلُونَ عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا۔ (۲۲/۷۲) یوں نظر آتا ہے جیسے یہ ان پر بھپرے ہوئے شیر کی طرح حملہ کر دیں گے، اس جرم کی پاداش میں کہ یہ انہیں قرآن کی طرف دعوت کیوں دیتے ہیں؟

کہئے کہ وہ اجنبی اسے سن کر کیا کہے گا؟ کیا یہی نہیں کہے گا کہ واقعی بعض حقیقتیں افسانوں سے بھی زیادہ تحیر انگیز ہوتی ہیں؟ اجنبی تو ایک طرف۔ اس واقعہ کو خود اپنوں سے بیان کیجئے تو وہ بھی اسے بمشکل باور کریں گے۔ وہ بھی یہی کہیں گے کہ نہیں صاحب! بات کچھ اور ہوگی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو لوگ ساری عمر اٹھتے بیٹھتے قرآن، قرآن پکارتے رہتے ہیں، جن کی ہر بات کا آغاز بھی قرآن سے ہوتا ہے اور انجام بھی قرآن پر، وہ دعوت الی القرآن کی اس طرح مخالفت کریں؟ اور تو اور جب تک ذاتی طور پر اسکا تجربہ نہیں ہوا خود میری سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ مسلمان قرآن کی مخالفت کس طرح کر سکتا ہے۔ ہمارے

فرقہ اہل قرآن

ہاں قرآن کی آواز، اسی شہر لاہور سے، اس صدی کے اوائل میں اٹھی تھی، اور اس کی بڑی مخالفت ہوتی تھی۔ لیکن جب میں نے اس دعوت کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان حضرات نے قرآن کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے پیش نہیں کیا تھا، محض فقہی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اور اس میں بھی ان کی ایک بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے یہ حضرات بدقسمتی سے خود ایک فرقہ بن کر رہ گئے تھے (جو اہل الذکر والقرآن کے نام سے متعارف ہے) اس لئے ان کی مخالفت اسی انداز کی تھی جس انداز سے ہمارے مختلف مذہبی فرقے باہمد گر دست و گریباں ہوتے رہتے ہیں۔ یعنی یہ مخالفت پیشہ ورانہ حسد کی بنا پر تھی، قرآن کی تعلیم کی بنا پر نہیں تھی۔ لیکن جب میں نے خود اس آواز کو بلند کیا اور اس پچیس برس کے عرصہ میں اس کی انتہائی کوشش کی (اور اللہ کا شکر ہے کہ میں ابھی تک اس کوشش میں کامیاب ہوں) کہ یہ دعوت ایک نئے فرقہ کا خمیر نہ بن جائے (کیونکہ اس صورت میں یہ قرآن کی آواز ہی نہیں کہلا سکتی۔ قرآن تو فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہے ۳۰/۳۲)، تو میں نے دیکھا یہ کہ اگر آپ قرآن کو محض انفرادی وعظ و نصیحت کے طور پر پیش کریں تو اس کی مخالفت کہیں سے نہیں ہوگی، لیکن جب آپ اسے دین، یعنی اجتماعی نظام کی شکل میں پیش کریں گے تو مخالفت کا ہجوم چاروں طرف سے سیلاب بلا کی طرح امنڈ آئے گا۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قرآن، خدا اور بندے کے درمیان کسی قوت کو حائل نہیں ہونے دیتا۔ وہ اپنے محکم نظام کے ذریعے براہِ راست خدا کے قانون کی اطاعت سکھاتا ہے۔ اس سے وہ تمام قوتیں جو خدا اور انسان کے درمیان حائل

قرآنی نظام کی مخالفت

ہوتی ہیں، یوں ناپید ہو جاتی ہیں جس طرح طلوعِ آفتاب سے رات کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔ اس سے نہ اربابِ شریعت کی خدائی مسندیں باقی رہتی ہیں، نہ ہادیانِ طریقت کی الوہیاتی عظمتیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرات اسے کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ حکومت کی لذت تو ایسی بلا ہے کہ تلیوں کا میٹ اپنی جمعداری نہیں چھوڑنا چاہتا اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ حضرات اپنے اس قسم کے اقتدار کو آسانی سے چھوڑ دیں جس کا تسلط جسموں کے بجائے دل اور دماغ پر ہو۔ اور جسے قائم کرنے اور استوار رکھنے کے لئے نہ فوج اور پولیس کی ضرورت ہو، نہ گولہ بارود کی حاجت۔ لوگ انہیں سجدے بھی کریں اور نذرانے بھی پیش کریں۔ گالیاں بھی کھائیں اور پاؤں بھی دبائیں۔ ان کا ہر حکم خدا کا حکم اور ہر فیصلہ رسول کا فیصلہ مانا جائے۔ جس کی علانیہ خلاف ورزی تو ایک طرف، دل میں بھی اس کے خلاف ذرا سی گرانی، انسان کو دنیا میں رُوسیاہ اور قیامت میں جہنم کا ایندھن بنا دے۔ کہیے کہ اس قسم کی حکومت و سطوت اور عزت و عظمت کو کون آسانی سے چھوڑنے پر آمادہ ہو سکتا ہے؟ اگر آپ کوئی تحریک اس قسم کی پیش کریں جس میں خدا کے ساتھ ان نمایندگانِ خدا کی قوت کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ مطمئن رہتے ہیں۔ اس لئے کہ ایسی تحریک اور اس قسم کے مذہب میں خدا کا نام محض تبرکاً لیا جاتا ہے۔ عملی اقتدار و اختیار سب انہی نائبینِ خدا کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اس قسم کے نظام کی طرف دعوت دے جس میں حکمرانی صرف خدا کے قانون کی ہو تو یہ اس کے تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتے۔

اکیلے خُدا کی اطاعت نہیں

وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۔ (۳۹/۴۵) جب ان لوگوں کے سامنے جو مستقبل کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے (اور جن کے پیشِ نظر صرف اپنا مفادِ عاجلہ ہوتا ہے) تنہا خدا کا نام لیا جائے، یعنی اُن سے کہا جائے کہ اطاعت صرف خدا کے قانون کی ہے اور کسی کی نہیں تو ان کے دل غم و غصہ سے طلسم پیچ و تاب بن جاتے ہیں۔ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۹/۴۵) اور جب خدا کے سوا اوروں کا نام لیا جاوے تو خوشی سے ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۔ (۱۷/۴۶)۔ تنہا خدا کا نام سن کر یہ نفرت و انتقام کے جذبات

سے مغلوب ہو کر منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ۔ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۔ (۱۲/۱۰۶) ان میں سے اکثر خدا پر ایمان اس طرح لاتے ہیں کہ اسکے ساتھ شرک بھی کئے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ایمان کا تو تقاضا ہی یہ ہے کہ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۔ (۴۰/۱۴) خدا کو پکارو تو اس طرح کہ فرماں پذیری اور اطاعت گذاری کے تمام لزوم و تضمنات خالصتہً اُسی کے قانون کے لئے مختص ہو جائیں۔ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ (۴۰/۱۴) خواہ مخالفین، یعنی توحید کے منکرین کو یہ بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

سرمایہ داروں کی طرف سے مخالفت

مذہبی پیشوائیت سے آگے بڑھیے تو قرآنی نظام کی بطشِ شدید، اس کی محکم گرفت، نظامِ سرمایہ داری پر پڑتی ہے۔ اس میں نہ کسی لیڈر کی لیڈری باقی رہتی ہے نہ زمیندار کی زمینداری۔ نہ جاگیردار کی جاگیرداری قائم رہتی ہے، نہ کارخانہ دار کی کرخنداری۔ نہ کسی کے پاس قارون کے خزانے رہتے ہیں نہ شدّاد کا بہشت۔ اس میں اللہ کے عطا کردہ رزق کے سرچشمے اللہ کے بندوں کی ضروریات کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ لہٰذا یہ تمام قوتیں جو رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھی ہوتی ہیں اس آواز کو دبانے کے لئے متحد و منظم ہو جاتی ہیں جو قرآنی نظام کو متشکل کرنے کے لئے اٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے جب اور جہاں کوئی انقلابی آواز اٹھی، مترفین کے طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت سب سے پہلے ہوئی۔ وَمَا اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۴/۳۴) یہ تاریخ کی بیّن حقیقت ہے کہ دنیا کی کسی قوم کی طرف بھی خدائی انقلاب کا پہنچانے والا کوئی ایسا نہیں آیا جس کی مخالفت اس قوم کے سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے نہ ہوئی ہو اور انہوں نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم تمہارے نظام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ مترفین کا طبقہ، بایں ہمہ ساز و یراق اور قوت و دولت، اس انقلابی آواز کے مقابلہ میں نکھر کر سامنے نہیں آتا۔ یہ ہمیشہ مذہبی پیشوائیت کو آگے بڑھاتا ہے۔ ہر فرعون، صاحبِ ضربِ کلیم کے مقابلہ کے لئے ہامان کے لاؤ لشکر کو میدان میں بھیجتا ہے۔ انقلابِ خداوندی کی یہ آواز علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی آواز ہوتی ہے۔ دھاندلی اور جہالت کی آواز نہیں ہوتی۔ اس لئے اس کی مخالفت بھی (جب کرنی ہو) علم و بصیرت اور دلائل و براہین سے کرنی چاہیئے۔ لیکن یہ نظام ایسے واضح حقائق کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے کہ اس کے خلاف

کسی کو دلیل و برہان مل ہی نہیں سکتی۔ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ (۲۳/۱۱۷) لہذا جب مذہبی پیشوائیت سرمایہ داری کی سپرین کر اس انقلابی آواز کے مقابلے کے لئے میدان میں آتی ہے تو ان

اسلاف پرستی

کے پاس اس کے تمام دلائل کا ایک ہی جواب ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۳/۲۴) ہم نے اپنے اسلاف سے ایسی کوئی بات نہیں سنی۔ اور جب وحی خداوندی سے اس کا یہ جواب ملتا ہے کہ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۵/۱۰۴) تو وہ عوام کے جذبات کو یہ کہہ مشتعل کر دیتے ہیں کہ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ (۲۶/۲۵) کیا تم سنتے نہیں ہو کہ یہ تمہارے اسلاف کے متعلق کیا کہتا ہے؟ نظامِ سرمایہ داری کے یہ مقدس محافظ، یہ کہہ کر عوام کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں اور پھر، انقلاب کی آواز بلند کرنے والوں کے خلاف ہر قسم کے کذب وافترا، اور تہمت تراشی و دروغ بافی سے کام لے کر عجیب وغریب من گھڑت باتیں ان کی طرف منسوب کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگوں کی توجہ اصل سوال کی طرف آنے ہی نہ پائے۔ خود میرے لئے یہ تجربہ بالکل نیا اور حیرت انگیز تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، میں نے شروع سے اس کی شدت سے احتیاط برتی ہے کہ قرآن کی اس آواز میں جو طلوعِ اسلام کی طرف سے بلند کی جا رہی ہے، کہیں فرقہ بندی اور گروہ سازی کا شائبہ تک نہ آنے پائے۔ لیکن قرآنی نظامِ ربوبیت کے مخالفین کی طرف سے سب سے پہلی

تین نمازیں اور نو روزے

جو آواز بلند ہوئی وہ یہی تھی کہ لو! اب ایک نیا فرقہ پیدا ہو گیا۔ (یعنی پرانے فرقے سب ٹھیک ہیں۔ ان کے خلاف کوئی اعتراض نہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُن فرقوں کے وجود کو "اسلامی" دستورِ پاکستان میں آئینی طور پر تسلیم کرایا گیا ہے لیکن نیا فرقہ برداشت نہیں کیا جا سکتا؟) اب ان کے سامنے یہ سوال آیا کہ اس آواز کے بلند کرنیوالوں کو فرقہ قرار کیسے دیا جائے کیونکہ یہ تو خود فرقہ پرستی کو شرک قرار دیتے تھے۔ اس کا طریق بہت آسان تھا۔ جب انسان جھوٹ بولنے پر آجائے تو اس کے لئے کوئی بات بھی مشکل نہیں رہتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ مختلف فرقوں کی پہچان بالعموم کس چیز سے ہوتی ہے؟ طریقِ نماز کے اختلاف سے۔ (آپ اس نقطہ پر غور کیجئے کہ قرآن نے جو کہا تھا کہ نظامِ صلوٰۃ کی وحدت سے دین کی وحدت قائم رہتی ہے، یہ نہ رہے تو دین کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ ... (۳۰/۳۱-۳۲)

---

[1] محرم ۱۹۵۶ء

تو یہ کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ تھا) بہر حال، فرقوں کی پہچان بالعموم نماز کے اختلاف سے ہوتی ہے جب قرآنی نظام کے مخالفین نے اس کے داعیوں پر ایک فرقہ کا لیبل لگایا تو ضروری ٹھہرا کہ وہ مشہور کریں کہ ان کی نماز، باقی تمام فرقوں کی نماز سے مختلف ہے. آپ کو معلوم ہے کہ یہ پراپیگنڈہ کس انداز سے کیا جاتا ہے؟ اس کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے. میں گزشتہ موسم گرما میں تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے سوات کے علاقہ میں گیا تھا. اس سے قبل، اس علاقہ میں میرا تعارف کہیں خال خال تھا. لیکن میں نے دیکھا کہ میں جہاں گیا، مجھ سے دو چار روز پہلے طائرانِ پیش رس وہاں پہنچ جاتے اور لوگوں سے کہتے کہ ایک نئے فرقے کا بانی تمہارے ہاں آرہا ہے. ان کے ہاں تین نمازیں ہیں. ہر نماز میں ایک رکعت. اور ہر رکعت میں ایک سجدہ. اور روزے بھی ان کے ہاں نو ہی دن کے ہیں. چنانچہ میرے وہاں پہنچنے پر لوگ دور دور سے آتے اور چپکے ہی چپکے دیکھتے کہ میں نماز کس طرح پڑھتا ہوں. جب وہ اُن سے جا کر کہتے کہ یہ تو ہماری ہی طرح نماز پڑھتا ہے، تو وہ اِن سے کہتے کہ نہیں! یہ باہر اور قسم کی نماز پڑھتا ہے اور کمرے کے اندر اور قسم کی. مجھے یہ باتیں اُن لوگوں نے بتائیں جو آہستہ آہستہ میرے خیالات سے واقف ہو کر بعد میں میرے پاس آنے لگے.

یہ ہے برادران! قرآنی نظامِ ربوبیت کے مخالفین کے پراپیگنڈہ کی پہلی شق. اس کی دوسری شق اس سے بھی زیادہ شدید اور نازک ہے.

منکرِ شانِ رسالت

انہیں معلوم ہے کہ جب کسی مسلمان سے کہا جائے کہ فلاں شخص (خاکم بدہن) حضورِ رسالتمآب کی شانِ اقدس میں گستاخی کرتا ہے تو وہ کس طرح آگ بھبوکا ہو جاتا ہے. اور ایسا ہونا بھی چاہیئے. وہ کون شقی القلب ہے کہ حضورؐ کی شان میں گستاخی سے اُس کا خون نہ کھولنے لگ جائے (یہ الگ بات ہے کہ اس قسم کی دریدہ دہنی کا مؤثر علاج کیا ہے) یہ مخالفینِ نظامِ قرآنی میرے متعلق عوام میں مشہور کرتے رہتے ہیں کہ یہ شخص (معاذ اللہ) منکرِ شانِ رسالت ہے. یہ رسول اللہ کو ایک ہرکارہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا. اس کے نزدیک سیرت نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی کچھ اہمیت نہیں. یہ سب کچھ اس شخص کی بابت کہا جاتا ہے جس کی سیرت نبویؐ پر ہزار صفحہ کی ضخیم کتاب (معراج انسانیت) سینکڑوں برگشتہ نوجوانوں کو شمع رسالت کا پروانہ بنا چکی ہے. اس ضمن میں ان کے پروپیگنڈے کا ایک اور نشتر یہ ہے کہ یہ شخص منکرِ حدیث ہے. یہ آواز آپ کو فضا میں ہر طرف پھیلی ہوتی ملے گی.

منکرِ حدیث

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں ایک طبقہ متشددین فی الحدیث کا ہے جو کتب روایات کو قرآن کی مثل قرار دیتا ہے. ان کے نزدیک تو امام ابوحنیفہ

بھی منکرِ حدیث تھے۔ اس لئے یہ حضرات اگر اس بنا پر کہ میرا عقیدہ اُن کے عقیدہ کے مطابق کیوں نہیں، مجھ پر اعتراض کریں تو مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں (بشرطیکہ وہ اس باب میں میری طرف وہی کچھ منسوب کریں جو میں کہتا ہوں) لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ میرے منکرِ حدیث ہونے کا سب سے زیادہ ڈھنڈورا وہ لوگ پیٹتے ہیں جو حدیث کے متعلق وہی کچھ کہتے ہیں جو میں کہتا ہوں۔ بلکہ ایک جہت سے اس سے بھی کچھ زیادہ - وہ رسول اللہ اور صحابہ کبار کے متعلق ایسی باتیں کہتے ہیں جن کی جرأت میں کبھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو سب سے بڑے حدیث کے ماننے والے اور مجھے منکرِ حدیث مشہور کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ سنیئے۔ کچھ عرصہ کی بات ہے۔ میرے ہاں ایک صاحب آئے اور حدیث کے متعلق باتیں کرتے کرتے کہنے لگے کہ تم رسول اللہ کی اطاعت دائمی اور ابدی نہیں مانتے۔ تم کہتے ہو کہ حضورؐ کے احکام محض وقتی اطاعت کے لئے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ پہلے یہ سن لیجئے کہ اس باب میں میرا نظریہ کیا ہے۔ اس کے بعد فرمایئے کہ آپکا اعتراض کیا ہے۔ (مجھے معلوم تھا کہ وہ کس جماعت سے متعلق ہیں) چنانچہ میں نے ایک کتاب اٹھائی، اور اس میں سے انہیں یہ عبارت پڑھ کر سنائی:

> یہ حقیقت یقیناً ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقصد کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ وہی حالات ہر زمانے اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں ان حالات میں اختیار کی گئی تھیں ان کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور حِکَم کے لحاظ سے ان میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔

یہ سن کر وہ کہنے لگے کہ کیا اس عقیدہ کے بعد بھی آپ کے منکرِ حدیث ہونے میں کوئی شبہ باقی رہ سکتا ہے؟ وہ اسی سُر میں کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے کہ میں نے جلدی سے کتاب اُلٹ کر انہیں دکھائی تو اس پر لکھا تھا: تفہیمات (حصہ دوم) ابو الاعلیٰ مودودی۔ اس کے بعد میں نے ان سے صرف اتنا کہا کہ یہ چیز اسی ایک شق تک ہی محدود نہیں۔ حدیث کے متعلق جو اعتراض بھی آپ مجھ پر وارد کریں میں اس کی تائید میں اسی قسم کے اقتباسات ان حضرات

کی تحریروں سے آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔

وہ اس کے بعد کچھ کھیانے سے ہو کر چلے گئے۔ لیکن دوسرے دن پھر حسبِ معمول ہماری مخالفت میں سرگرمِ جہاد تھے۔ یہ ہے برادران! ان حضرات کی مخالفت کی کیفیت، جو درحقیقت مخالف تو ہیں قرآنی نظامِ ربوبیت کے جس میں نہ ان حضرات کی سیادت باقی رہتی ہے نہ ان کے فتووں سے پروان چڑھنے والے سرمایہ دار طبقہ کی خون آشامیت۔ لیکن چونکہ یہ کھلے بندوں ایسا کہنے کی جرأت نہیں رکھتے اس لئے وہ ان غلط بیانیوں سے کام لے کر لوگوں کو ہم سے متنفر کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ ہماری آواز ہی نہ سنیں۔ دکھ انہیں یہ ہے کہ ہم قرآن کا وہ نظام کیوں پیش کرتے ہیں جو سرمایہ داری کو ختم کر دیتا ہے لیکن وہ سپر ڈھونڈتے ہیں ناموسِ رسالت اور عظمتِ اسلاف کی۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے ہمیشہ یہی کچھ ہوتا رہا ہے جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس گئے کہ وہ بنی اسرائیل کو اپنے پنجۂ استبداد سے رہا کر دے تو وہ بجائے اس کے کہ حضرت موسیٰؑ کی بات کا جواب دیتا اُس نے اُن سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ ہمارے اسلاف کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ (مَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ۲۰/۵۱)۔ مقصد صرف یہ تھا کہ جب یہ اُن کے خلاف کچھ کہیں گے تو میں فوراً عوام میں مشہور کر دوں گا کہ یہ ہمارے اسلاف کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ اس طرح اُن کی توجہ دوسری طرف منتقل ہو جائے گی اور اصل سوال غت ربود ہو جائے گا۔ یہی کچھ شروع سے ہوتا چلا آرہا ہے اور یہی کچھ آج ہو رہا ہے۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

⁂ ⁂ ⁂

ہمارا مسلک

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر مختصر الفاظ میں واضح کر دیا جائے کہ طلوعِ اسلام کا مسلک کیا ہے اور مقصد کیا تاکہ وہ سعید روحیں جو حقیقت کی متلاشی ہوں انہیں معلوم ہو جائے کہ ہم کہتے کیا ہیں؟ ہمارا مسلک یہ ہے کہ

۱:۔ دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کی محکومی اور غلامی میں نہ رہے۔ خواہ یہ غلامی ذہنی اور فکری ہو اور خواہ طبعی اور اقتصادی۔

(۲) قوانینِ خداوندی کی اطاعت ایک نظام کی رُو سے ہو سکتی ہے جسے استخلاف فی الارض (یا نظامِ مملکت) کہتے ہیں۔ قرآن کی رُو سے استخلاف فی الارض کے بغیر دین کا تمکن ہو ہی نہیں سکتا۔

(۳) قرآن نے (بجز مستثنیات) دین کے اصولی قوانین دیئے ہیں اور اسے اس نظام پر چھوڑتا ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے وقت کے تقاضوں کیمطابق جزئیات خود متعین کرے۔

(۴) رسول اللہ نے سب سے پہلے نظام قرآنی قائم کیا اور اپنے رفقائے کار (صحابہ کبارؓ) کے مشورہ سے قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات مرتب فرمائیں۔

(۵) رسول اللہ کے بعد دین کا یہی نظام، حضورؐ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا جو امورِ ملت کو ملت کے مشورہ سے سرانجام دیتے تھے۔ قرآن کے جن اصولوں کی جزئیات اس سے پہلے متعین نہیں ہوئی تھیں انہوں نے ان کا تعین کیا۔ جن میں کسی ردوبدل کی ضرورت تھی ان میں ضروری تغیر و تبدل کیا۔ جن میں ایسی ضرورت نہیں تھی انہیں علیٰ حالہٖ باقی رکھا۔

(۶) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا قرآنی نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا جس میں ہم اس وقت تک مبتلا ہیں۔ اب کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے اسی انداز کا نظام قائم کیا جائے جو امت کو قرآن کے مطابق چلائے۔

(۷) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوتا، امت کے مختلف فرقے، مختلف جزئیات پر جس جس انداز سے عمل پیرا ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کسی قسم کا ردوبدل کرے۔ یہ حق صرف قرآنی نظام کو پہنچتا ہے کہ وہ ان اختلافات کو مٹا کر پھر سے امت میں وحدت پیدا کرے۔ اس دوران میں اتنا ہی کیا جا سکتا ہے کہ دین کے اس تصور کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور جسم میں جو عقاید و رسومات ایسی رائج ہو چکی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں ان کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ جو لوگ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہوں وہ اپنی اصلاح کرتے چلے جائیں۔

(۸) قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا نہ قرآن کے بعد خدا کی طرف سے کوئی اور کتاب آ سکتی ہے، نہ رسول اللہ کے بعد کوئی اور نبی یا رسول۔

(۹) قرآن کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے۔ اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماورا۔ قرآنی حقائق

کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے زمانہ کے علوم و فنون جس حد تک ترقی کر چکے ہیں وہ سب انسان کے سامنے ہوں۔ اور چونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ تمام کائنات، انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لیے کائناتی قوتوں کی تسخیر لاینفک ہے۔

(۱۰) نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرفِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ کی مظہر تھی۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری کتب روایات و تاریخ میں ایسی باتیں شامل ہو گئی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ آپ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن کے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو وہ بات ہمارے نزدیک وضعی ہے اور حضورؐ کی طرف غلط منسوب۔ ضرورت ہے کہ سیرتِ نبوی کے صحن چمن سے ان کانٹوں کو الگ کر دیا جائے۔ جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہے انہیں ہم صحیح مانتے ہیں۔

(۱۱) ہم دین میں فرقہ سازی کو شرک سمجھتے ہیں اس لئے ہم کوئی فرقہ پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ نہ ہی ہم نے کوئی نئی قسم کی نماز ایجاد کی ہے نہ روزوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ نو دن کے ہیں۔ احکامِ اسلامی کے متعلق البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان کی پابندی محض ایک رسم کے طور پر نہیں کرنی چاہیئے بلکہ انکی روح پر بھی نگاہ رکھنی چاہیئے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما ہو جائے تاکہ نوعِ انسانی اس زندگی میں سر اٹھا کر چلنے، اور اس کے بعد کی زندگی میں شرفِ انسانیت کے باقی مراحل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔

(۱۳) قرآنی نظام میں تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوتی ہے۔ اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ وسائلِ پیداوار معاشرہ کی تحویل میں رہیں نہ کہ افراد کی ذاتی ملکیت میں جن میں معاشرہ کوئی دخل نہ دے سکے۔ یاد رہے کہ یہ تصور کمیونزم کے تصور سے یکسر مختلف ہے جس میں انسان کی طبعی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کا تصور ہی نہیں ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کا نظامِ ربوبیت نہ سرمایہ داروں کے لئے خوش آیند ہو سکتا ہے نہ کمیونسٹوں کے لئے۔

یہ ہیں برادران! مختصر الفاظ میں دین کے متعلق وہ نظریات و تصورات جنہیں میں ایک عرصہ سے قوم کے سامنے پیش کرتا چلا آرہا ہوں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ملک میں ایسی فضا تیار کی جائے جو قرآنی نظام کی تشکیل کے لئے سازگار ہو۔ اور جب اس نظام کی ابتدا اس خطۂ زمین میں ہو جائے تو پھر اس کی حدود کو وسیع کرتے جائیں تاکہ اس طرح آہستہ آہستہ ساری زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے" اور جس مقصد کے لئے قرآن دنیا میں آیا تھا وہ مقصد پورا ہو جائے۔

یہ ہے ہمارا مسلک اور مقصد جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ مخالفین کا پراپیگنڈہ ہے جو خاص مقصد کے لئے کیا جا رہا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

فکری طریق

اب برادران! مجھے چند الفاظ اس طریق کے متعلق عرض کرنے ہیں جو میں نے اس تحریک کو عام کرنے کے لئے اختیار کیا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ (دیگر ممالک اسلامیہ کو چھوڑیئے خود) ہندوستان میں گذشتہ ایک صدی میں مسلمانوں کی متعدد تحریکیں اٹھیں۔ ہر تحریک کا آغاز اس جوش و خروش اور ولولہ و طنطنہ سے ہوتا جیسے کوئی سیلاب بلا امڈے چلا آرہا ہو۔ ایسا دکھائی دیتا کہ یہ تحریک، مخالفت کے ہر سنگ گراں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کرلے جائے گی۔ اور اسی برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی اپنی منزل تک پہنچکر دم لے گی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نظر آتا کہ وہ تحریک یوں حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی۔ "کَاَنَّہٗ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا"۔ ان تحریکوں کے مقاصد کی بلندی یا ان میں شریک ہونے والوں کے حسنِ نیت میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے اس طرح ناکام رہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ ان تحریکوں کی بنیادیں خالص جذبات پر رکھی گئی تھیں جن میں فکر و تدبر کا دخل نہیں تھا۔ خالی جذبات پر اُبھری ہوئی تحریکیں درد کی طرح اٹھتی اور آنسوؤں کی طرح بیٹھ جایا کرتی ہیں۔ قرآن نے اپنی تحریک کی بنیاد فکر و شعور پر رکھی ہے۔ وہ انسان کی فکری صلاحیتوں کو اُبھارتا ہے۔ انہیں سوچنے، اور غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ان کی عقل و فکر (REASON) کو اپیل کرتا اور دلیل و برہان کی رو سے اُنکی نگاہ میں آہستہ آہستہ تبدیلی پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ جب وہ اس طرح اس تحریک سے علیٰ وجہ البصیرت ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو پھر اُنہیں آگے قدم بڑھانے کی دعوت دیتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ انسان جو قدم پورے غور و فکر کے بعد علیٰ وجہ البصیرت آگے بڑھاتے، وہ اُسے پھر پیچھے نہیں ہٹایا کرتا۔

چونکہ ہماری تحریک کی بنیادیں قرآنی حقائق پر استوار ہیں اور اس کا مقصد قرآنی نظام کی تشکیل ہے، اس لئے اس تحریک کے عام کرنے کے لئے میں نے طریق بھی وہی اختیار کیا ہے جسے قرآن تجویز کرتا ہے۔ یعنی فکری طریقِ عمل ــــ میں بھی ہر ایک سے باتباع رسالت یہی کہتا ہوں کہ اِنَّمَآ اَعِظُكُمۡ بِوَاحِدَةٍ. میں آپ سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ مَثۡنٰى وَ فُرَادٰى. تم خدا کیلئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوۡا (۳۴/۴۶) اس کے بعد سوچو! اگر تم نے سوچنا شروع کر دیا کہ انسانیت کی منزل کونسی ہے اور ہم کس راستے پر چلے جا رہے ہیں تو تم یقیناً قرآن کی دعوت سے متفق ہو جاؤ گے۔ یہ ہے برادران! وہ طریق جس سے میں گزشتہ بیس پچیس برس سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت سے ارباب فکر و نظر کو دعوت غور و فکر دیتا اور یوں ایک ایک کر کے اپنے رفقائے سفر اکٹھے کرتا چلا جا رہا ہوں۔

غزل سرائیم و پیغام آشنا گوئیم
بایں بہانہ دریں بزم محرمے جوئیم

جو احباب اس طرح ذہنی طور پر اس فکر سے ہم آہنگ ہو جائیں ان کے سامنے اگلا مرحلہ یہ آتا ہے کہ جن حقائق کو انہوں نے ذہنی طور پر صحیح سمجھا ہے ان کے مطابق اپنے قلب میں بھی تبدیلی پیدا کریں اسلئے کہ قرآن اپنی تحریک کی کامیابی کے لئے صرف

ذہنی کے بعد قلبی تبدیلی

ذہنی انقلاب ہی کو کافی نہیں سمجھتا۔ وہ اس کے ساتھ قلبی تبدیلی کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ اسی کا نام سیرت کی پختگی یا انسانی ذات کا استحکام ہے۔ وہ اس طرح تطہیر فکر و نگاہ سے ایسے افراد تیار کرتا ہے جو قرآنی نظام کی بنیادوں کو استوار کریں۔ وہ ان کے داخلی انقلاب سے، خارجی انقلاب عمل میں لاتا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ یہ خارجی انقلاب درحقیقت ان کے داخلی انقلاب کا فطری مظہر ہوتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو عملاً سامنے لاتا ہے کہ

اے کہ منزل را نمی دانی ز راہ!
قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ
نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

لیکن برادران! انقلاب کا یہ طریقہ بڑا صبر آزما اور ہمت طلب ہوتا ہے۔ اس میں فرہادی استقامت اور کوہکنی استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں قدم قدم پر پروانے کی طرح خاموشی سے جل جانے اور اُف

صبر آزما مراحل

تک نہ کرنے کی منزلیں آتی ہیں۔ اس میں نہ نمائش کے مواقع ہوتے ہیں نہ نمود کی گنجائش نہ ذاتی صلہ کی امید نہ ستائش کی توقع۔ یہ راستہ لمبا بھی ہوتا ہے اور پُرخار بھی، غیر مانوس بھی ہوتا ہے اور آبلہ انگیز بھی۔ اس میں لاکھ جی گھبرائے اور ہزار طبیعت اکتائے (SHORT CUT) کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس طریقِ انقلاب کے جاں گسل مراحل کی صبر آزمائی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انقلاب قرآنی کے اوّلین داعی حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی عمر نبوت صرف تیئیس ۲۳ سال تھی۔ اس تیئیس ۲۳ سال کی مدت کو قیامت تک پھیلائیے اور پھر دیکھئے کہ اس کا ایک ایک سانس کس طرح صدیوں پر بھاری تھا۔ لیکن اس تیئیس سال میں سے تیرہ سال کا عرصہ (یعنی قریب چھپن فی صدی) اسی داخلی انقلاب میں صرف ہو گیا۔ غور کیجئے کہ کتنی بڑی ہے یہ قیمت جسے قرآنی انقلاب مانگتا ہے۔ لیکن اس کے ادا کئے بغیر چارہ ہی نہیں۔ اس راہ میں صبر طلبیٔ عشق، بیتابیٔ تمنا کی کوئی پرواہ نہیں کرتی۔ اس لئے کہ فطرت اپنے قوانین میں (جن کی رُو سے اُسنے تخم کاری اور ثمر ریزی کے درمیان ایک متعین وقفہ رکھا ہے) کسی کے لئے تبدیلی نہیں کیا کرتی۔

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

چنانچہ قرآن اس پر شاہد ہے کہ خود نبی اکرمؐ کے دل میں بھی اس کا خیال پیدا ہوتا تھا کہ معلوم ہماری یہ تگ و تاز میری زندگی میں ثمر بار ہو سکے گی یا نہیں۔ اس کے جواب میں آپ سے صاف کہہ دیا گیا کہ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ۔ ان مخالفین کی تباہی و بربادی کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے (کہ ایسا ہو کر رہے گا) ہو سکتا ہے کہ وہ تیری زندگی میں سامنے آجائے۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تیری وفات کے بعد ظہور میں آئے۔ لیکن تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ کب ظہور میں آتا ہے۔ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) تمہارے ذمہ یہی ہے کہ تم اس پیغام کو عام کرتے جاؤ۔ یہ دیکھنا ہمارے ذمے ہے کہ اس سعی و عمل کے نتائج نمودار کب ہوتے ہیں؟ کسان کا کام ہل جوتنا۔ تخم ریزی کرنا۔ کھیت کو پانی دینا۔ اس کی رکھوالی کرنا ہے۔ اس کی کھیتی پکے گی کب؟ یہ چیز ہمارے قانونِ مکافات سے متعلق ہے جس پر کسان کی عجلت اور بے تابی کوئی اثر نہیں کر سکتی۔

یہ ہے برادران! انقلاب آفرینی کا وہ بظاہر خاموش لیکن بہ باطن تلاطم انگیز طریقہ جسے قرآن اپنی تحریک کی کامیابی کے لئے تجویز کرتا ہے۔ وہ طریقہ جس میں محنت طلبی اور شکیب آزمائی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی
ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشاکشِ زم و گرما، تپ و تراش و خراش
زِ خاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی!
مقام بست و کشاد و فشار و سوز و کشید
میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی!

لیکن اس کے ساتھ اسے بھی یاد رکھیے کہ

اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ جن خوش بخت انسانوں نے دل کی پوری جمعیت سے کہہ دیا کہ ہمارا نشو و نما دینے والا اللہ ہے اور پھر اپنے اس دعویٰ پر جم کر کھڑے ہو گئے تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا۔ ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کھاؤ۔ بالکل نہ گھبراؤ۔ وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۴۱/۳۰)۔ تم اس جنت کی بشارتیں لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

یہی ہے برادران! وہ طریقہ جسے خود میں نے اپنے لئے اختیار کیا اور جس کی طرف میں دوسروں کو دعوت دیتا چلا آرہا ہوں۔ اس میں مجھے تقریب بیس پچیس برس لگ گئے۔ اور اگر اس میں اس مدت کو بھی شامل کر لیا جائے جو مجھے غیر قرآنی شریعت کے دلدل اور افلاطونی تصوف کی بھول بھلیوں سے نکلنے میں لگی، تو اس عرصہ کی درازی کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔ یہ لمبا راستہ اور سفر کی تنہائی، یقیناً تھکا دینے کے لئے کافی تھے۔

کوئی دوسرا طریق نہیں

لیکن جس چیز نے میری ہمت کو قائم رکھا وہ اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان تھا کہ اس کے سوا خودگری اور بازآفرینی کا کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں۔

جو احباب قرآنی فکر کے اس راستے میں میرے رفیقِ سفر بننے پر آمادگی ظاہر کرتے ہیں، میں کوشش کیا کرتا ہوں کہ یہ حقیقت ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو جائے کہ یہ راستہ بڑا صبر آزما اور استقامت طلب ہے جس میں خالی جذبات کی ولولہ انگیزی کچھ کام نہیں آتی۔ نہ صرف یہ کہ کچھ کام نہیں آتی بلکہ تخریبی نتائج پیدا کر دیتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ سن کر آگے بڑھتے ہیں لیکن تجربہ نے یہ بتایا ہے کہ ان میں سے اکثر اس حوصلہ شکن مسلک پر زیادہ دیر تک گامزن نہیں رہ سکتے۔ ان کی بیتابیٔ تمنا انہیں رہ رہ کر ہنگامہ خیزی پر اکساتی ہے۔ ان میں سے بعض تنگ آکر میری سست روی پر طعنہ زن بھی ہوتے ہیں لیکن جب وہ اس کے باوجود مجھے اپنی روش بدلنے پر آمادہ نہیں کر سکتے تو ان میں سے کچھ تو یہ کہہ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ

کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک!

اور بعض اپنے جذبات کی تسکین کے لئے دوسری راہیں تراش لیتے ہیں۔ مجھے نہ ان سے کوئی گلہ ہے نہ ان سے شکوہ۔ میں نے یہ داستان دہرائی اس لئے ہے کہ آپ میں سے جو احباب اپنے دل میں اس بادیہ پیمائی کا ولولہ رکھتے ہوں وہ اس مرحلہ کی شکیب آزمائی کا اچھی طرح سے اندازہ کر لیں اور خوب سمجھ لیں کہ دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کام اپنے اندر انقلاب پیدا کرنا ہے۔ پہلے ذہنی انقلاب اور پھر قلبی انقلاب۔ اور جب تک وہ اس مرحلہ سے گذر نہیں جاتے، کوئی دوسرا پروگرام ان کے سامنے نہیں آسکتا۔

اس مقام پر میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس طریقہ سے انقلاب آفرینی کی رفتار درحقیقت اتنی سست نہیں ہوتی جتنی سست وہ بظاہر نظر آتی ہے۔ محسوسات کی خوگر نگاہیں، گھڑی کی رفتار کو سیکنڈ کی سوئی سے دیکھنے کی عادی ہوتی ہیں۔ جس گھڑی میں سیکنڈ (اور منٹ) کی سوئیاں نہ ہوں، صرف گھنٹے کی سوئی ہو، وہ اسے ساعتِ رواں (چلنے والی گھڑی) گنتے ہی نہیں۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ سیکنڈ اور منٹ کی سوئیاں نہ ہونے سے گھڑی کی رفتار پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ صرف ہماری نگاہ کا قصور ہوتا ہے جو ان تیز رفتار سوئیوں کی عدم موجودگی میں گھڑی کی رفتار کو محسوس شکل میں نہ دیکھ سکنے کی وجہ سے اس کے متعلق جامد یا سست ہونے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ اس کی شہادت خود میرے اپنے تجربہ سے مل سکتی ہے۔ میں نے اس تمام

اس کے نتائج

عرصہ میں جو کچھ کیا ہے تنہا کیا ہے۔ نہ میرے پاس سامان و ذرائع تھے نہ اسباب و وسائل۔ نہ کوئی جماعت پیچھے تھی نہ فنڈ۔ نہ کوئی ہم صفیر تھے نہ ہمسفر۔ ہر طرف سے مخالفتوں کا ہجوم اور ان میں گھری ہوئی ایک ننھی سی آواز جس کے اظہار کا ذریعہ ایک ماہوار مجلہ۔ بظاہر

نظر آتا تھا کہ نقار خانہ میں طوطی کی یہ آواز یونہی فضا میں گم ہو کر ضائع جا رہی ہے۔ لیکن اسی ننھی سی آواز کا اثر ہے کہ اس وقت ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اس سے متاثر نہ ہو چکا ہو۔ حتیٰ کہ موافقین تو ایک طرف، مخالفین تک کی یہ حالت ہے کہ وہ اب طلوعِ اسلام کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی تحریر اور تقریر میں اس کے الفاظ اور اصطلاحات بلا تکلف استعمال ہوتے ہیں۔ وہ اس کے پیش کردہ دین کے تصور کو اپنا رہے ہیں حتیٰ کہ وہ قرآن کی آیات کا ترجمہ بھی اسی کے اسلوب و انداز میں کرتے ہیں۔

یہاں تک تو لگا لاتے ہیں ہم رستے پہ زاہد کو
کہ سمجھاتا ہوا اب تا درِ مے خانہ آتا ہے

اس بے سروسامانی کے باوجود، یہ تغیر یقیناً اپنی اہمیت رکھتا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

بہرحال یہ ہے قرآنی انقلاب کے لئے طریق کار کا پہلا گوشہ۔ اس کے بعد میں اس کے دوسرے گوشے کی طرف آتا ہوں جو اس پہلے گوشے سے بھی زیادہ نازک اور لطیف ہے۔ لطیف اتنا کہ بعض اوقات اسے صحیح طور پر سمجھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ گوشہ یہ ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور اس کے ذریعے

بغیر پارٹی بازی کے

معاشرہ میں انقلاب بغیر گروہ بندی اور پارٹی بازی کے برپا کیا جائے گا۔ چونکہ دورِ حاضرہ میں معمول یہ ہے کہ کوئی تحریک بغیر پارٹی کے وجود میں نہیں آتی اس لئے یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ پارٹی بازی کے بغیر بھی کوئی تحریک چل سکتی ہے۔ لیکن برادران! قرآن کریم سے جو کچھ تھوڑی بہت بصیرت میں نے حاصل کی ہے اس کی روشنی میں میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ملت کے اندر تعمیری انقلاب پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ کوئی پارٹی بنائے بغیر ان میں فکری تبدیلی پیدا کرتے جائیں۔ چونکہ (جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے) یہ مسئلہ کچھ مشکل سا ہے اس لئے میں اس کے متعلق ذرا وضاحت سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ قرآن کریم، غیر مسلموں کے مقابلہ میں مومنین کو ایک الگ جماعت، ایک جداگانہ اُمت قرار دیتا ہے۔ لیکن وہ اس اُمت کے اندر فرقہ سازی کو شرک سے تعبیر کرتا ہے۔ میں نے بعض احباب کو کہتے سُنا ہے کہ قرآن مذہبی فرقہ کو شرک قرار دیتا ہے۔ سیاسی پارٹی کو شرک نہیں ٹھہراتا۔ ذرا سوچئے کہ جس اسلام میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہی نہیں اس میں مذہبی فرقہ اور سیاسی پارٹی میں کیا فرق ہو سکتا ہے؟ لہٰذا مذہبی فرقہ ہو یا سیاسی پارٹی — دونوں

تفرق فی الدین ہیں۔

پھر کہا یہ جاتا ہے کہ جو مقصد ہمارے سامنے ہے اس کے لئے اجتماعی کام کی ضرورت ہے انفرادی کوششوں سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگر پارٹی بنانا منع ہے تو یہ اجتماعی کام کس طرح سے ہوسکے گا۔ یہ اجتماعی کام منظم کوشش (ORGANISED EFFORT) سے ہوسکے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ پارٹی بازی اور منظم کوشش میں فرق کیا ہے؟ اس فرق کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ قرآن نے تحزب (پارٹی بازی) کی نفسیات کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے جہاں کہا ہے کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ (۳۲/۳۲) پارٹی کی عمارت تعصب کی بنیادوں پر اٹھتی اور دوسروں سے نفرت کے جذبہ پر استوار ہوتی ہے۔ ایک پارٹی کے ممبر یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھر کی سعادتیں اور حسنات ان کی پارٹی میں جمع ہیں اور پارٹی سے باہر جتنے لوگ ہیں ان میں کوئی خوبی اور نیکی نہیں۔ اس سے اُن کے اپنے اندر نخوت اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ دوسروں کو سخت ذلت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن انہی ذلیل اور حقیر لوگوں میں سے جب کوئی ان کی پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے تو وہ ہر قسم کے شرف و مجد کا حامل بن جاتا ہے۔ پھر اس میں دنیا بھر کی خوبیاں آجاتی ہیں۔ اگر وہ پارٹی کے ساتھ وفا شعار (LOYAL) رہتا ہے تو اس کا ہر عیب، ہنر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر اس نے پارٹی سے قطع تعلق کر لیا تو نہ صرف یہ کہ اس کی ہر خوبی عیب بن جاتی ہے بلکہ دنیا بھر کے عیب اس کی طرف منسوب کر دیئے جاتے ہیں اور اسے جی بھر کے بدنام کیا جاتا ہے۔ یہی وہ ڈر ہے جس کی وجہ سے لوگ پارٹیوں کے ساتھ متمسک رہتے ہیں۔ اپنی پارٹی کی تقویت ہر رکن کا اولین فریضہ ہوتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کا جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنا عین جہاد سمجھا جاتا ہے۔ دوسروں کی بات کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو، وہ اسے کبھی نہیں سنتے۔ اور اگر کبھی مجبوراً سننا پڑے تو اس کا تمسخر اڑاتے اور استہزا کی ہنسی ہنستے ہیں۔ ان کی مجلسوں کا محبوب ترین مشغلہ دوسروں کی تذلیل و تحقیر ہوتا ہے جس میں وہ بڑی لذت لیتے ہیں۔ ان کی ساری ہمدردیاں صرف اپنی پارٹی کے ممبروں تک محدود ہوتی ہیں۔ ان سے باہر کے انسانوں سے وہ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے — وہ اُن سے ملتے ہیں تو محض منافقانہ۔ اُن سے تعلقات وابستہ رکھتے ہیں تو مجبورانہ۔ ورنہ ان کا دِلی تعلق صرف اپنی پارٹی کے افراد تک محدود ہوتا ہے اور (MY PARTY, RIGHT OR WRONG) یہ ہوتا ہے ان کا نصب العین۔ یہ ہیں وہ عناصر جن سے ایک پارٹی ترتیب پاتی اور قائم رہتی ہے۔ لیکن قرآنی نظام کے لئے منظم کوشش کا تصور اس سے یکسر

مختلف ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے قرآنی نظام کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور جن کی آرزو یہ ہے کہ یہ نظام پھر سے ملت میں متشکل ہو جائے، وہ سب سے پہلے اس کی بنیادی خصوصیات خود اپنے اندر پیدا کریں اور پھر اس نظام کے تصور کو دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا میں تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوں اور ان کی مضمر انسانی صلاحیتوں کی مکمل نشوونما ہوتی جائے۔ اس نظام کو متشکل کرنے والوں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیں اور دوسروں کی نشوونما میں اپنی ذات کی بالیدگی اور ارتقا کا راز سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ جو افراد اس مقصد کے حصول کے لیے منظم کوشش کرنے کے لئے اٹھیں، ان میں پارٹی بازی کی لعنتوں میں سے کسی کا شائبہ تک بھی نہیں ہوگا۔ وہ دوسروں سے نفرت نہیں، ہمدردی کریں گے۔ وہ ان کی بہبودی کا سامان مہیا کرتے پھریں گے وہ اس میں اپنے اور پرائے کی کوئی تمیز روا نہیں رکھیں گے۔ وہ اپنے کام کی ابتداء بے شک کسی ایک مقام سے کریں گے لیکن پوری نوعِ انسانی ان کی برادری اور ساری دنیا ان کا گھر ہوگی۔ ان کی مساعی خدا کی صفتِ ربّ العالمینی کی مظہر ہوں گی۔ اس میں ان کے ذمے زیادہ سے زیادہ ایثار اور قربانیاں ہوں گی اور دوسروں کے لیے بیش از بیش نفع بخشیاں اور راحت سامانیاں۔ وہ اپنی عملی زندگی سے اس حقیقت کو نمایاں کر دیں گے کہ

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ!
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ!

اِن افراد کی منظم کوشش کی مثال یوں سمجھئے جیسے کسی وبائی مرض کے زمانے میں شہر کے ڈاکٹر ایک ایسوسی ایشن بنا لیں تاکہ اس تباہی کا مقابلہ اجتماعی انداز سے کیا جاسکے۔ ظاہر ہے کہ ان کا اس طرح سے یک جا ہو کر منظم کوشش کرنا دوسروں سے نفرت کے لئے نہیں بلکہ ان سے ہمدردی کی خاطر ہوگا۔ وہ اگر جراثیم پھیلانے والے عناصر پر پابندیاں لگائیں گے تو اس لئے نہیں کہ انہیں اُن سے دشمنی ہے بلکہ اس لئے کہ اس میں انسانیت کا بھلا ہے۔ وہ ذخیرہ اندوزوں سے دوائیاں باہر نکلوائیں گے تو اس لئے نہیں کہ انہیں نقصان پہنچایا جائے بلکہ اس لئے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ جانیں بچائی جاسکیں۔ وہ اپنے آپ کو کبھی

ان لوگوں سے الگ تصور نہیں کریں گے۔ وہ انہی میں رہیں گے۔ انہی میں چلیں پھریں گے۔ نہ انہیں اپنا حزب مخالف سمجھیں گے نہ خود ان کی مخالف پارٹی بنیں گے۔ لیکن منظم کوشش سے ان کی فلاح و بہبود کے کاموں میں سرگرم عمل رہیں گے۔ پارٹی بنائے بغیر منظم کوشش کی بیّن مثال ہمیں سرسیدؒ کی زندگی میں ملتی ہے۔ اس نے اپنے

سرسیّد کی مثال

حلقۂ احباب کی رفاقت اور منظم کوشش سے ایک ایسا تعمیری کام کیا جس کی نظیر اس دور میں نہیں ملتی۔ لیکن اپنے دامن کو پارٹی بازی کی خباثت سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ میرے پیشِ نظر بھی 'برادرانِ عزیز! کچھ اسی قسم کا نقشہ ہے۔ ہم میں سے جو احباب قرآنی نظام کے اس مقصدِ عظیم سے متفق ہوں وہ باہمی تعاون و تناصر سے اس تصور کو عام کرنے کے لئے منظم کوشش کریں۔ انفرادی کوشش کی مثال شیشے کے بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی سی ہے جن میں سے ہر ٹکڑے میں الگ الگ عکس دکھائی دیتا ہے۔ اگر انہی ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک بڑا شیشہ بنا لیا جائے تو اس میں ایک ہی عکس دکھائی دے گا۔ اس کا نام منظم کوشش ہے۔ اس میں سب سے پہلے ہر فرد کو خود اپنی ذات میں اس تصور کی جھلک پیدا کرنی چاہیئے جسے وہ عام کرنا چاہتا ہے۔ اس کی زندگی ایسی ہونی چاہیئے کہ ہر شخص دور سے پہچان لے کہ قرآنی فکر کو اپنے دل و دماغ پر مستولی کر لینے والوں کی سیرت ایسی ہوتی ہے۔ پھر اسی سیرت و کردار کو لیکر وہ آگے بڑھیں اور دوسروں کو سمجھائیں کہ دین کا مقصود کیا ہے اور قرآنی نظامِ ربوبیت میں معاشرہ کی شکل کیا ہوگی۔ اس میں کس طرح رزق کے سرچشمے تمام انسانوں کی ضروریات کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے، اس میں کس طرح ہر فرد کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان مہیا ہوگا، کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی، کسی پر زیادتی نہیں ہوگی، کوئی کسی کو لوٹنے کا نہیں، کوئی کسی سے کچھ چھیننے کا نہیں۔ ہر ایک کو جنتی آسائشیں نصیب ہوں گی اور اس طرح تمام افراد (تا بحدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کو اپنے اندر منعکس کرتے ہوئے انسانیت کی ارتقائی منزلیں طے کرتے چلے جائیں گے۔ طوبیٰ لھم وحسن مآب۔ وہ اس فکر کو عام کرتے جائیں گے اور اس مقصد کے حصول کے لئے کسی قسم کے ناجائز ذریعے کے استعمال کا تصور تک بھی اپنے دل میں نہ لائیں گے اس میں شبہ نہیں کہ اس تصور کو عام اور اس نظام کو متشکل کرنے کی کوششوں میں، ملوکیت، پیشوائیت، اور سرمایہ دار، تینوں کی طرف سے مخالفت ہوگی اور سخت مخالفت۔ لیکن وہ اس مخالفت کے مقابلہ میں بھی دامنِ حق و صداقت کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں خواہ اس میں (بظاہر) کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔

جو لوگ قرآنی نظام کے اس تصور سے متفق ہو کر یکجا ہوں گے، ظاہر ہے کہ وہ مختلف فرقوں

نماز، روزہ

سے نکل کر ادھر آئیں گے۔ چونکہ یہ حضرات کسی نئے فرقے میں داخل نہیں ہو رہے، اس لئے وہ اپنے اپنے طریق پر نماز روزہ اور دیگر اسلامی شعائر کے پابند رہیں گے اس میں کسی کو دوسرے پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں، ان طریقوں میں تغیر و تبدل کا حق صرف اسلامی نظام کو ہے، کسی فرد یا افراد کے مجموعہ کو نہیں۔ اس طرح برادران! یہ منظم کوشش، اس تصور کو عام کرنے کا مؤثر ذریعہ بن سکے گی۔ باقی رہا یہ کہ ہمارے مخالفین اس منظم کوشش کو بھی نیا فرقہ یا پارٹی قرار دے کر ہمیں بدنام کریں گے، سو ان کا تو کام ہی یہ ہے کہ ہمیں بدنام کریں، ہم ان کی زبان تھوڑا پکڑ سکتے ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ مخالفین اس کے متعلق کیا کہیں گے، اصل سوال یہ ہے کہ آپ اپنی سیرت و کردار اور فکر و عمل سے کیا بن کر دکھائی دیں گے۔

بعض حضرات کہا کرتے ہیں کہ اگر ہم نے اس فکر کو عام بھی کر دیا تو اس سے کیا حاصل ہوگا۔ قرآن کا مقصد تو اس نظام کو عملاً متشکل کرنا ہے۔ کیا اس فکر کی عام نشر و اشاعت سے یہ نظام متشکل ہو جائے گا؟ ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ اب تو خود زمانہ کے تقاضوں نے حالات میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی ہے کہ کسی

آئینی تبدیلی

خیال کے عام کر دینے سے معاشرہ کا نظام خود بخود اس کے مطابق متشکل ہو جاتا ہے یہ زمانہ جمہوریت کا ہے جس میں انقلاب آئینی طور پر (CONSTITUTIONALLY) برپا ہوتے ہیں۔ جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ جس خیال کے حامل زیادہ ہوں اسی کے مطابق نظامِ مملکت متشکل ہو جاتے۔ آپ اس فکر کو عام کیجئے اور پھر دیکھئے کہ کس طرح ایک قطرۂ خون بہائے بغیر یہ انقلاب معرضِ وجود میں آ جاتا ہے۔

ندارد عشق سامانے ولیکن تیشہ دارد
خراشد سینۂ کہسار و پاک از خونِ پرویز است

قرآنی نظامِ ربوبیت خود اپنے اندر اتنی قوت رکھتا ہے کہ دنیا کا کوئی اور نظام یا تصور اس کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے ابھی تک دنیا کے سامنے پیش ہی نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ جو حضرات اسے دوسروں کے سامنے پیش کریں وہ خود اسے اچھی طرح سمجھے ہوئے ہوں۔ اس لئے کہ تجربہ

نادان دوست

نے یہ بتایا ہے کہ اس تحریک کو اتنا نقصان مخالفین کے ہاتھوں سے نہیں پہنچا جتنا اُن موافقین کی طرف سے پہنچتا ہے جو اس کی ماہیت سے خود اچھی طرح

واقف نہیں ہوتے اور لوگوں سے طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ان کی یہی باتیں مخالفین کے لئے اعتراضات کی بنیاد بن جاتی ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ حضرات کی، خود قرآن پر نگاہ ہو۔ ایسی نگاہ کہ اگر کبھی میں بھی غلطی سے کوئی ایسی بات کہہ دوں جو قرآن کے مطابق نہ ہو تو آپ مجھے فوراً ٹوک دیں۔ یاد رکھیئے! دین میں سند اور حجت میرا بھی کوئی قول نہیں ہو سکتا۔ سند اور حجت صرف خدا کی کتاب ہو سکتی ہے۔

٭٭٭

برادران! میں نے آپ سے جو کچھ عرض کرنا تھا کر چکا۔ آخر میں میں پھر اُنہی الفاظ کو دہراتا ہوں جن سے میں نے بات شروع کی تھی۔ یعنی یہ اجتماع کس قدر مبارک اور مسعود ہے جو اس مقصد کے لئے منعقد ہوا ہے کہ سوچا جائے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے کیا کیا مؤثر طریق اختیار کئے جائیں تاکہ اس خطۂ زمین میں قرآن کا نظام متشکل ہو کر سامنے آجائے۔ اس ضمن میں میں اپنی طرف سے اور آپ تمام حضرات کی طرف سے لاہور کے احباب کی خدمت میں ہدیۂ سپاس و تہنیت پیش کرتا ہوں جنہوں نے اس سب سے پہلے اجتماع کا بار اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ کیا عجب کہ ان کی یہی مختصر سی کوشش آئندہ چل کر ایک ایسے شجرِ طیب کا بیج ثابت ہو جس کی جڑیں پاتال میں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ کیا عجب کہ یہی مقام ہماری تاریخ میں وہ موڑ بن جائے جہاں سے، کاروانِ اُمت ایک بار پھر قرآن کے متعین کئے ہوئے جادۂ مستقیم پر گامزن ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا اپنے غلط تصورات اور ناکام نظامہائے زندگی کو آزما کر اس قدر تنگ آچکی ہے کہ وہ صحیح نظامِ زندگی کے لئے بصد حسرت و یاس چاروں طرف تک رہی ہے۔ آپ نے میری تالیف 'انسان نے کیا سوچا؟' میں دیکھا ہو گا کہ

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار
پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدتِ گفتار ہے نے جدتِ کردار
ہیں اہل سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اسی افلاسِ تخیل میں گرفتار
دنیا کو ہے اس مہدیِ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

یہ ہدیٰ برحق قرآنی نظام کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اگر دنیا کے سامنے اِس نظام کی کرن کہیں سے بھی آگئی تو وہ لپک کر اس کی طرف بڑھے گی۔ زمانے کے تقاضے دنیا کو خود قرآن کی طرف کشاں کشاں لئے آرہے ہیں یورپ اور امریکہ کے جو ریسرچ اسکالرز میرے پاس آتے ہیں ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کس طرح قرآنی نظام کے لئے تڑپ رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے لئے السابقون الاولون کی سعادت کسے حاصل ہوتی ہے۔ زمانہ اس قسم کے خوش بخت انسانوں کو آوازیں دے دیکر بلا رہا اور ان سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

خیز و بجامِ تشنہ بادۂ زندگی نشاں
آتشِ خود بلند کن آتشِ ما فرونشاں

اس لئے کہ

مے کدہ تہی سبو حلقۂ خود فراموشاں
مدرسہ بلند بانگ بزمِ فسردہ آتشاں
فکرِ گرہ کشا غلام۔ دیں بروایتے تمام ...
زانکہ درونِ سینہ ہا دل ہے است بے نشاں

آپ حضرات کی کوششیں درخورِ ہزار تبریک و تحسین ہیں جنہوں نے اس مقصد کے لئے اپنا قدم آگے بڑھایا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہم غریب اور نادار ہیں۔ ہم بے بضاعت اور بے سروسامان ہیں۔ لیکن قرآن اس پر شاہد ہے کہ آسمانی انقلاب کی ابتدا ہمیشہ غریبوں اور ناداروں کی طرف سے ہوئی ہے۔ اس لئے کہ اس انقلاب کا پہلا قدم یہ ہوتا ہے کہ رزق کے سرچشمے تارِدنوں کے ہاتھ سے چھین کر قانونِ خداوندی کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ اس لئے قرآنی نظام کی تحریک کو سرمایہ دار طبقہ کی تائید حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا آپ اپنی بے بضاعتی سے بالکل نہ گھبرائیں۔

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم

آپ کے پاس تو قرآن کا وہ عصائے کلیمی ہے جو ساحرین کی نظر فریب رسیوں کو یونہی نگل جائے گا۔ آپ تو عظیم قوتوں کے مالک ہیں۔

بچشم کم مبیں تنہائیم را
کہ من صد کارواں گل در کنارم

قرآن آپ کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشت پرے داری
بیا من با تو آموزم طریق شاہبازی را

لیکن اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھیے کہ قرآنی نظام کی تحریک میں السابقون الاولون کے حصے میں سختیاں ہی سختیاں ہوتی ہیں۔ ان کے ذمے قربانیاں اور قربانیاں ہی ہوتی ہیں۔ انہیں لہو پسینہ ایک کرکے اس بیج کو بونا ہوتا ہے۔ کاٹنا پتہ نہیں کس کے نصیب میں ہو۔ لہذا اس راستہ میں جس قدر محنت درکار ہوگی اس کا اندازہ لگالینا ضروری ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ

تخت جم و دارا سہ راہے نفروشند
ایں کوہ گران است بکاہے نفروشند
با خون دل خویش خریدن دگر آموز

آپ اسے بھی سوچ لیجئے کہ آپ اس آواز کو لے کر اٹھ تو رہے ہیں۔ لیکن اگر آپ کی غفلت یا کم ہمتی سے یہ آواز ناکام رہ گئی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ قرآنی نظام تھوڑے عرصہ تک قائم رہا اور اس کے بعد یہ جنت آدم سے چھن گئی۔ معترضین کا کہنا یہ ہے کہ اگر اس نظام میں چلنے کی سکت ہوتی تو یہ آگے کیوں نہ بڑھتا۔ (میں اس اعتراض کا جواب کئی مرتبہ دے چکا ہوں) صدر اول کے بعد ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ قرآنی نظام کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ اگر یہ آواز ہماری کمزوریوں کی وجہ سے ناکام رہ گئی تو اس نظام کے متعلق سطح بین نگاہوں کا شبہ یقین میں بدل جائے گا کہ اس میں واقعی عملاً قائم ہونے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں۔ اس لئے برادران! آپ سوچ لیجئے کہ اس نظام کے داعی بننے سے آپ کتنی عظیم ذمہ داری اپنے سر پر لے رہے ہیں۔ آپ کی ناکامی، آپ کی ناکامی نہیں سمجھی جائے گی۔ خود اس نظام کی ناکامی قرار پا جائے گی۔ اسلئے آپ یا تو اس کے لئے قدم ہی نہ اٹھائیے۔ اور اگر قدم اٹھانا ہے تو پھر اس قدم کو پیچھے نہ ہٹائیے۔ آپ جو فیصلہ بھی کیجئے، سمجھ سوچ کر کیجئے۔ محض جذبات کی بنا پر نہ کیجئے۔ یہ معاملہ بڑا نازک ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری وجہ سے قرآن کا پیغام بدنام ہو جائے۔ قرآن کا نظام تو بہر حال قائم ہو کر رہے گا۔ اسے کوئی روک نہیں

سکتا۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ جب اس کی تاریخ سامنے آئے تو اس میں ہمارے متعلق یہ درج ہو کہ ان کی وجہ سے اسے ایک اور دھکا پیچھے کی طرف لگا تھا۔ اگر ایسا ہوا تو پھر ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ و ذالک هو الخسران المبين۔

کمیونزم کا سیلاب

لیکن اس کے لئے اگر ہمیں کچھ کرنا ہے تو بہت جلد کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ کمیونزم کا سیلاب بڑی تیزی سے بڑھتا چلا آرہا ہے اور مشرقی پاکستان تو بالکل اس کی زد میں دکھائی دے رہا ہے۔ بلکہ وہاں کی حالت تو کچھ ایسی نظر آرہی ہے گویا — صید خود صیاد را گوید بگیر) اور اس سیلاب فنا کو صرف نظامِ ربوبیت کا بند ہی روک سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ اس نظام سے متعلق لٹریچر یہاں سے وہاں تک پھیلا دیا جائے۔ اور مختلف زبانوں میں اس نظریہ کو عام کیا جائے۔ جو کچھ اس سلسلہ میں اب تک لکھا جا چکا ہے وہ کافی سے بھی زیادہ ہے۔ ضرورت صرف اس کے عام کرنے کی ہے۔ وبیدہ التوفیق!

برادرانِ عزیز! اس وقت تک اس تقریب کی اجتماعی حیثیت کے متعلق گفتگو تھی۔ اب آخر میں چند الفاظ ذاتی حیثیت سے عرض کرنے کی بھی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ حضرات کا یہ اجتماع، اس بلند مقصد کے علاوہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، خود میری روح کے لئے کس قدر رقص آور اور نشاط انگیز ہے اور یہ میری جبینِ نیاز میں چھپے ہوئے سجداتِ تشکر و امتنان کو کس طرح دعوتِ زمین بوسی دے رہا ہے، اسکا اندازہ شاید آپ نہ کر سکیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، میری ساری زندگی ان رفیقوں کی تلاش میں گزری ہے جو میرے سفر کی تنہائیوں میں میرا ساتھ دے سکیں۔ حضرت علامہؒ کے الفاظ میں:

میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

یہ تلاش کس قدر جانکاہ اور یہ جستجو کیسی صبر آزما تھی، اسکا اندازہ مشکل ہے۔ مجھے کئی ایسے مراحل یاد ہیں جب میں اس تنہائی سے تھک کر انتہائی کرب و الم میں پکار اٹھتا تھا کہ:

یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب

یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں

یا چناں کن یا چنیں!

لیکن اس رفیقِ اعلےٰ کی چارہ سازیوں اور عاجز نوازیوں کا تصدق ہے کہ میں آج آپ حضرات کے مجمع کو اپنے سامنے دیکھ کر انتہائی وجد و مسرت کے عالم میں کہہ سکتا ہوں کہ :

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

آپ احباب کی رفاقت میری اُمیدوں کا مرکز۔ میری تمناؤں کا محور۔ میری آرزوؤں کی تکمیل کا ذریعہ۔ میری ہمتوں کا سہارا۔ میرے جینے کی خوشی اور میری موت کا اطمینان ہے۔ میں ایک فقیر بے نوا آپ احباب کے لئے کوئی تحفہ نہیں لا سکا۔ البتہ میری قرآنی فکر میری متاعِ عزیز ہے جس کی میں اس وقت تک تنہا حفاظت کرتا اور چراغِ تہِ داماں کی طرح زمانے کے جھکڑوں سے بچاتا رہا۔ یہ متاعِ عزیز آپ احباب کی خدمت میں حاضر ہے۔

بگیر۔ ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدستِ تو از شاخِ تازہ تر ماند

اسی کے لئے میں تمام عمر دعائیں کرتا رہا کہ :

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوت و انجمن کا گداز
اُمنگیں مری آرزوئیں مری
اُمیدیں مری جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اِسے
لُٹا دے ٹھکانے لگا دے اِسے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

پرویز

(۰)

اس کنونشن میں پرویز صاحب کے دوسرے خطاب کا عنوان تھا: "مقامِ محمدیؐ"۔ (وہ الگ شائع ہو چکا ہے)

پرویز صاحب کی وضاحتی تقریر

۱۷ر نومبر کے دن کے اجلاس میں پرویز صاحب نے ایک وضاحتی تقریر میں فرمایا.

گذشتہ تین دن سے ہمارے اجلاس ایک ضابطہ کی پابندیوں کے ساتھ ہو رہے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اب ہم کچھ دیر کے لئے ضابطے کی پابندیوں سے آزاد ہو کر گھر کی طرح اپنے دکھ درد کی باتیں کریں. وقت تھوڑا ہے اور ابھی بہت سے کرنے کے کام ہیں ؏

بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا

ہم بھی دوسرے مسلمانوں جیسے ہی ہیں

ایک ضروری بات مجھے اس مجلس میں عرض کرنی ہے اور وہ یہ کہ میں کل سے بعض مندوبین کے اس قسم کے اعلانات سن رہا ہوں کہ "میں پچھلے سال سے مسلمان ہوا ہوں۔ میں تین سال قبل مسلمان ہوا" وغیرہ وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ احباب جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ کچھ اور ہے لیکن اس کے لئے یہ الفاظ قطعاً ناموزوں بلکہ گمراہ کن ہیں۔ ہم پہلے بھی مسلمان تھے اور اب بھی مسلمان ہیں۔ ویسے ہی مسلمان جیسے ملت کے دیگر افراد مسلمان ہیں۔ ان میں اور ہم میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں کہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ خدا نے جو دین ہمارے لئے تجویز کیا تھا اس کے حقیقی خط و خال کیا تھے اور اب وہ اس خطہ زمین میں کس طرح عملاً رائج ہو سکتا ہے۔ اس سے ہم باقی مسلمانوں سے کسی صورت میں بھی نہ مختلف ہو سکتے ہیں نہ کسی حیثیت سے افضل۔ باقی رہا اس دعویٰ کا معنوی پہلو کہ "ہم اتنے برس سے مسلمان ہوئے ہیں" تو یہ بھی صحیح نہیں۔ اس لئے کہ مسلمان ہونا کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے

اور ـــ

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

حضرت علامہؒ نے دوسری جگہ اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلات لآ الٰہ را

تو پھر بتایئے کہ ہم میں کون ہے جو یہ دعوٰے کر سکے کہ معنوی نقطۂ نظر سے ہم واقعی مسلمان ہیں۔ میرا یہ دعوٰی ہے کہ اگر ہم چند آدمی ہی جو یہاں موجود ہیں مسلمان بن جائیں تو نظامِ عالم میں ایک انقلابِ عظیم آجائے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

سوچیئے کہ ایسی صورت میں ہمارے یہ مسائل و مشکلات باقی رہ سکتے ہیں؟ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ اگر تم مسلمان ہو تو اقطار السموٰت و الارض سے بھی آگے بڑھتے چلے جاؤ گے۔ اگر ہم واقعی تین سال سے صحیح معنوں میں مسلمان بن چکے ہوتے تو آج تقدیرِ عالم بدل چکی ہوتی۔ ہمیں ایسا دعویٰ معنوی طور پر نہیں کرنا چاہیئے جس کی تائید ہماری سیرت و کردار کی رو سے ثابت نہ ہو۔

نماز کی اہمیت

میں نے ایسی باتیں بھی سنی ہیں کہ بعض اراکینِ بزم یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اب جو اسلام کو سمجھا ہے، اس کی بنا پر نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا "طلوعِ اسلام" نے آپ کو یہی تعلیم دی ہے کہ نماز نہ پڑھنے پر فخر کرو؟ آپ نے غیر قرآنی روشِ زندگی کو تو نہ چھوڑا، اور اس کے بجائے اس قسم کی باتیں کرنے لگ گئے۔ اور ستم بالائے ستم کہ اپنے آپ کو طلوعِ اسلام کی تحریک سے وابستہ ظاہر کر کے ایسی باتیں کرنے لگے۔ طلوعِ اسلام پر آخر یہ کتنا بڑا الزام ہے جو آپ نے عاید کر دیا۔

ذاتی طور پر مجھ میں بھی کمزوریاں ہیں اور میں ہمیشہ اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ لیکن یہ انتہائی ظلم ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کے لئے جواز کی صورتیں تلاش کرنے لگ جائیں۔ آپ قرآنی نظریات کیخلاف سب کچھ کر رہے ہیں۔ تجارت، کاروبار، شادی، رشتے ناطے سب کچھ ہو رہا ہے۔ بینک بیلنس برابر قائم ہیں۔ قرآن کے مطابق انہیں بدلنے کے لئے آپ کے ذہن میں کبھی کچھ نہیں آیا، پھر نماز کے بارے میں ایسا کیوں ہے؟ (بعض گوشوں سے آوازیں آئیں کہ یہ بھی ہمارے مخالفین کا پروپیگنڈہ ہے جو طلوعِ اسلام کی تحریک سے وابستگی ظاہر کر کے اس قسم کی باتیں مشہور کرتے رہتے ہیں۔ محترم پرویز صاحب نے سلسلۂ کلام

کو جاری رکھتے ہوئے کہا) ہم معاشرے میں اصلاح کا آغاز اپنے گھروں سے ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر پہلے خود ہی نماز روزہ چھوڑ دیں تو پھر اصلاح کس طرح ہوگی؟ خدارا اپنے قول و عمل کو بصیرت علم اور خلوص پر مبنی رکھیے۔ مقدس بہانے تلاش نہ کیجیے بلکہ اعتراف کیجیے اپنی کمزوریوں کا۔ ہم نے قرآنی معاشرہ قائم کرنا ہے جو صرف نیک اور پاکباز زندگی بسر کرنے سے قائم ہو سکے گا۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے دین کا تصور یوں سمجھا ہے اور جب یہ متشکل ہو جائے گا تو یوں کچھ ہوگا لیکن اس کے لئے آپ بہت سی باتیں اب بھی شروع کر سکتے ہیں۔ مثلاً وعدے کا ایفا۔ سچ بولنا اور دغا نہ کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے لئے آپ نظامِ قرآنی کے عملاً قیام تک کا انتظار کیوں کر رہے ہیں؟

آپ کی یہ باتیں میرے سامنے آئیں اور میں نے اصل حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھی۔

غلط ذرائع

مجھے آپ کی قرار دادوں کے متعلق کچھ نہیں کہنا لیکن میں آپ سے یہ کہوں گا کہ میں نے اپنے خونِ جگر سے ایک چھوٹا سا دیا جلایا ہے اور میری آرزو ہے کہ یہ دیا اسی طرح جلتا ہوا آگے چلے لیکن یہ محض روپے کے تیل سے ہی نہیں جلے گا۔ کیوں کہ جس خونِ جگر سے اسے جلایا گیا وہ سونے کے تیل سے زیادہ قیمتی ہے۔ اسے جلائے رکھنے کے لئے اندر کی حرارت اور چنگاریوں کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کسی فکر کو عام کرنے کے لئے روپے کی ضرورت بھی ناگزیر ہے۔ لیکن روپیہ ہی سب کچھ نہیں۔ حضرت علامہ کے الفاظ میں:

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اس مقدس کام کے لئے غلط ذرائع اور وسائل کا خیال تک دلوں میں نہ لائیے۔ کیونکہ حق کی راہ میں باطل طریق پر اٹھایا ہوا ایک قدم سب کچھ غارت کر دیتا ہے۔

غلط ذرائع کے ساتھ نور السموٰت والارض کا دیا نہیں بنے گا۔

ہماری تحریک کا ہر رکن ایسا مبلغ ثابت ہو کہ لوگ دیکھتے ہی پکار اٹھیں کہ وہ دیکھیے قرآنی فکر کا جیتا جاگتا پیکر آ رہا ہے۔ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلم سے جب حضورؐ کی صداقت کی دلیل طلب کی گئی تو کفار کے چیلنج کے جواب میں کہا ہی گیا کہ:

قَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶)

میں نے اس سے قبل اپنی ساری عمر تمہارے اندر بسر کی ہے کیا تم اس
سے نہیں اندازہ لگا سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟ میرے دعویٰ کی صداقت
کی دلیل خود میری زندگی ہے۔

اس حقیقت کو یاد رکھیئے کہ قرآنی راہ پر چلنے کی دعویدار گی دشمنوں کے ہجوم میں ایک بلند بانگ دعویٰ ہے۔ خارجی وسائل سے یہ کٹھن راہ طے نہ ہوگی۔ ہماری تحریک کے بیج دلوں کی گہرائیوں سے ابھریںگے۔ اور ان کے برگ و بار سب کو بتا دیں گے کہ نظامِ ربوبیت کیا ہے؟ محض لٹریچر کی اشاعت کبھی کچھ نہ کر سکے گی۔ آدم سے کہا گیا تھا وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ؁ زمین ہمارا ٹھکانا ہے ہم اس کے سہارے ضرور لیں گے۔ لیکن ان سہاروں کی نوعیت کشتی کے لئے پانی کے سہارے کی سی ہونی چاہیئے۔ وہی پانی جب سیلاب بن کر کشتی پر مسلط ہو جاتا ہے تو آپ جانتے ہیں کہ کشتی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس لئے مالی سہاروں کو سیلاب کی طرح اپنی جدّوجہد کے سفینے پر مسلط نہ ہونے دیجئے ایمانی قوت کو ان سہاروں پر غالب رکھیئے۔ قرآنی انقلاب کو محسوس شکل میں دنیا کے سامنے لانے کے لئے عزم و ہمت، خلوص و ایثار اور سچے ولولوں سے کام لیجئے اور یقین رکھیئے۔"

پرویز صاحب کی اس تقریر کے بعد اجلاس نمازِ ظہر کے لئے ملتوی ہوگیا۔

الوداعی تقریر

۱۸ ر نومبر کی صبح پرویز صاحب نے اپنی الوداعی تقریر میں فرمایا۔

یہ سوال بار بار دہرایا جاتا ہے کہ اُس معاشرے سے جسے قرآن متشکل کرتا ہے انسان کو کیا ملیگا؟ اور وہ نظام جسے "نظامِ ربوبیت" کہتے ہیں انسانی زندگی میں کس قسم کی خوشگواریاں پیدا کرتا ہے؟ آج کے اجلاس میں اس امر کی وضاحت کرنا بڑے کام کی بات ہوگی کہ بالآخر انسان کو آخر اس نظام سے ملے گا کیا؟ لیکن اس کے لئے آپ پہلے یہ سوچیئے کہ وہ کونسی چیز ہے جس کے لئے انسان کے سینے میں تڑپ اور خلش برپا ہے؟ اقوامِ عالم کی تاریخ پر نظر ڈالئے۔ ایک ایک واقعہ اس امر کی شہادت دے گا کہ انسان کی انتہائی آرزو ہر دور میں یہی رہی ہے کہ اسے آزادی مل جائے۔ جب بھی کسی قوم نے آزادی

حاصل کی گئی کے چراغ جلائے گئے اور خوشی کے شادیانے بجے۔ انسان آزادی کی خاطر جینا چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں بھی کرنا ہے۔ لیکن آج تک آزادی کے صحیح مفہوم کا تعین نہ ہوسکا قرآن آیا اور اس نے آکر بتایا کہ نبی کی آمد کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ کہا کہ ویضع عنھم اصرھم و الاغلال التی کانت علیہم یعنی رسول اللہ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت جن زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی وہ انہیں توڑ دے تاکہ انسانیت سرفرازی سے چلنے کے قابل ہوسکے لیکن یہ سوال پھر بھی قائم رہتا ہے کہ آزادی کسے کہتے ہیں؟

قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ کسی معاملہ کو تشنۂ تکمیل نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ اس نے آزادی کا مفہوم واضح کرتے ہوئے اعلان کیا

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ
لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ
بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۔ (۳/۷۹)

(کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اللہ اسے کتاب، حکومت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میری غلامی اختیار کرو۔ اسے کہنا چاہیئے کہ تم سب ربانی بن جاؤ اس کتاب کے ذریعے جس کی تعلیم کو تم اپنے دلوں پر نقش کرتے ہو۔) قرآن نے آزادی کی تعریف کر دی اور اس کا دائرہ متعین کر دیا۔ اس نے بتایا کہ آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان سے صرف خدا کے قانون کی اطاعت کرائی جائے۔ کسی انسان کی اطاعت نہ کرائی جائے۔

---(۰)---

محترم پرویز صاحب نے حضور رسالتمآبؐ، صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے دور کی مثالوں سے واضح کیا کہ اسلام اس حقیقت کا علمبردار ہے کہ نہ تو انسان کی آزادی کسی جانب سے مجروح ہونے پائے اور نہ اُسے اس قدر کھلا چھوڑ دیا جائے کہ وہ بے باکیوں پر اتر آئے۔ اس ضمن میں سیرت نبی اکرمؐ کے ایسے درخشندہ اور تابناک گوشے وجہ شادابی تاب دنظر ہوئے جن سے بصیرت کی فضائیں جگمگا اٹھیں۔ اس کے بعد پرویز صاحب نے مندوبین کو بالخصوص مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں نے قرآنی فکر کا ایک چھوٹا سا دیا جلایا تھا اور کئی سالوں سے اسے ہاتھوں میں اٹھائے آگے بڑھ رہا ہوں۔ اس دیئے کو روشن رکھنا

اب آپ کا کام ہے۔ اس کے لئے سینوں کی حرارت کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ روشنی آپ کے دلوں کی حرارت سے پھیلتی چلی جاتی گی۔

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات

آپ اپنی بے سروسامانیوں پر نہ جائیے۔ اسلام کی روشنی میں دنیا کا انقلاب عظیم ان مجاہدوں کے ہاتھوں برپا ہوا جن کے پاس میدان جنگ میں جانے کے لئے سواری تک نہ تھی۔ قرآن کا یہ پیغام زبان اور الفاظ کے زور پر نہیں پھیلے گا۔ آپ کی زبان خاموش ہو لیکن دیکھنے والے آپ کو دیکھ کر کہیں کہ وہ دیکھئے قرآن کے نظامِ ربوبیت کا علمبردار آ رہا ہے۔

آپ کے متعلق بہت کچھ مشہور کیا جا رہا ہے۔ بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں لیکن آپ اپنے عمل سے ثابت کر دیجئے کہ آپ نہ کوئی مذہبی فرقہ ہیں اور نہ سیاسی پارٹی۔ ہم ملت کی کشتی میں دوسرے بھائیوں کے ساتھ ہی سوار ہیں اور اگر (خدانخواستہ) یہ کشتی ڈوبی تو ہم بھی سب کے ساتھ ہی ڈوبیں گے۔

ہماری خوش نصیبی ہے کہ اسلامی نظام کے لئے ہمیں ایک خطۂ زمین حاصل ہو گیا۔ اس خطۂ زمین اور اس کے حصول کی تحریک سے "طلوع اسلام" کی وابستگی اس بنا پر تھی کہ دین کا تمکن خطۂ زمین کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ خطۂ زمین مل گیا۔ اب ہماری جدوجہد یہ ہے کہ وہ دین اس سرزمین پر متشکل ہو جائے۔ آپ کی طرف سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہیں ہونی چاہیئے جس سے پاکستان کے خطۂ زمین کو کسی قسم کا ضعف پہنچے۔ اس کی حفاظت آپ کا اولین فریضہ ہے خواہ اس کے لئے اپنی جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑ جائے۔

آخر میں پرویز صاحب نے خدا کی بارگاہ میں دعا کرتے ہوئے انتہائی سوز کے عالم میں کہا۔

"اے خدائے کائنات! ہم جذبۂ صادق کی پونجی لے کر تیری بارگاہ میں حاضر ہوئے ہیں اسے قبول فرما۔"

اُن کی آنکھوں سے عجز و خلوص کے آنسو بہ نکلے اور اُن کی آواز جوشِ تأثر سے بھرا گئی۔

☼ ☼ ☼

تین دن کی پُر بہار سرگرمیوں اور سوز و گداز کی حرارتوں سے معمور یہ اجتماع اس طرح ختم ہوا اس کے بعد جب یہ تمام رفقائے سفر ایک دوسرے سے گلے مل کر رخصت ہو رہے تھے تو وہ سماں بڑا ہی درد انگیز اور رقت آمیز تھا۔ ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو اور لب پر پُرخلوص دعائیں تھیں۔ ایسا نظر آتا تھا کہ محبت اور خلوص کا بحرِ بے پایاں ہے جو یہاں سے وہاں تک ٹھاٹھیں مارتا چلا جا رہا ہے۔ محترم پرویز صاحب نے

ایک ایک رفیق کو گلے مل کر رخصت کیا۔ اُن کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی جھڑی رواں تھی اور ملنے والوں کے دل بھی پانی بن کر آنکھ کے چشموں سے اُبلتے جا رہے تھے۔ چنانچہ ہزاروں دعاؤں اور دوبارہ اسی طرح ملنے کی لاکھوں تمناؤں کے ساتھ یہ اجتماع دو دیر کے بعد اختتام پذیر ہوا۔ اس آرزو کے ساتھ کہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد

ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

لاہور کی سرزمین نے ہزاروں اجتماعات دیکھے ہوں گے۔ لیکن اس انداز کا اجتماع اس سے پہلے اس کی نظروں سے شاید ہی گزرا ہو گا۔ اس لئے کہ اس میں خلوص اور محبت اور قرآن سے والہانہ شیفتگی اور ذاتِ رسالتمآب سے بے پناہ عشق کا جذبہ کچھ اس انداز سے آئینہ پاش تھا کہ ساری فضا نور و نکہت کا حسین پیکر بن رہی تھی۔ خدا اس سرزمین کو اس قسم کے اجتماعات بار بار دیکھنے کی سعادت نصیب کرے۔

خُمِ زندگی[۱]

طلوعِ اسلام کی دوسری کنونشن

مُنعقدہ راولپنڈی

۱۸ تا ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء

روئیداد ـــــــ ماخوذ از طلوعِ اسلام ـــــــ دسمبر ۱۹۵۷ء

بصدائے دردمندے بنوائے دل پذیرے

خُمِ زندگی کشادم بہ جہانِ تشنہ میرے

ابتدائیہ

طلوعِ اسلام کی پہلی کنونشن نومبر ۱۹۵۶ء میں، لاہور میں منعقد ہوئی تھی۔ دوسری سالانہ کنونشن کا انعقاد راولپنڈی میں ۱۸۔۱۹۔۲۰ ؍ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو ہوا۔

کراچی سے مندوبین اور مبصرین کا قافلہ (جو تقریباً بیس احباب پر مشتمل تھا) محترم پرویز صاحب کی معیت میں ۱۵؍ اکتوبر کی سہ پہر، تیزگام سے روانہ ہوا۔ جو احباب کسی وجہ سے کنونشن میں شریک ہونے سے معذور تھے، وہ اس کاروانِ شوق کو الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ان کی آنکھوں میں ڈبڈباتے ہوئے آنسو ان کے قلبی اضطراب اور محرومیٔ تمنا کے احساس کے غماز تھے۔ ۱۶؍ اکتوبر کی شام رہ نوردگانِ منزلِ شوق کا یہ کارواں، راولپنڈی پہنچ گیا۔

اجتماع کا انتظام ڈھیری حسن آباد میں کیا گیا تھا۔ یہ مقام شہر کے ہنگاموں سے دور، لال کرتی کے باہر، فطرت کی کھلی فضا میں واقع ہے۔ جلسہ گاہ ایک مکان نہیں بلکہ (یوں سمجھئے کہ ایک) قلعہ ہے جس کی فصیل کے اندر نہایت فراخ رہائشی مکان، چاروں طرف کھلے احاطے اور تمام ضروریات کے سامان موجود تھے۔ ان کھلے احاطوں میں تقریباً تین سو مہمانوں کے قیام اور کنونشن کے اجلاس کا انتظام، بطریقِ احسن کیا گیا تھا۔ اسی احاطہ کے اندر ایک مسجد بھی ہے۔ اس سے نماز کے لئے الگ انتظام کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔

تعارفی محفل | جمعرات ۱۷؍ اکتوبر کی صبح سے، مہمانوں کی آمد آمد شروع ہو گئی۔ یہ کہکشانی سلسلہ

دن بھر جاری رہا اور بعد نماز عشاء (پہلا) تعارفی اجلاس منعقد ہوا۔ (سال گذشتہ کی طرح) یہ اجلاس دلچسپ بھی تھا اور رقت آمیز بھی۔ خلیج فارس سے لے کر بنوں اور کوہاٹ، اور ریاست سوات سے لیکر کراچی تک مختلف مقامات کی بزموں کے نمائندگان اور مدعوکردہ مبصرین دور دراز کی منزلیں طے کر کے، محض اس جذبے کے ماتحت یکجا جمع ہوتے تھے کہ یہ سوچا جائے کہ اللہ کی کتاب کی تعلیم کو عام کرنے کے لئے کیا کیا مؤثر ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ مختلف بزموں کے ترجمان اسٹیج پر آتے اور اپنی اپنی بزم کے نمائندگان اور مبصرین کا تعارف کراتے۔ ان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان بھی تھے اور ہل چلانے والے کسان بھی۔ کالجوں کے پروفیسر بھی تھے اور مذہبی مکاتب کے فارغ التحصیل معلم بھی۔ (وضع قطع کے اعتبار سے ٹھیٹھ) مغربی تہذیب کے مظہر بھی تھے اور قدامت پرستی کے پیکر بھی۔ دفاتر کے ارباب حل وعقد بھی تھے اور مساجد کے ائمہ وخطیب بھی۔ ان میں پنجابی بھی تھے اور سندھی بھی، سرحدی بھی تھے اور بلوچ بھی۔ "مہاجر" بھی تھے اور "انصار" بھی۔ سید بھی تھے اور مرزا بھی، خان بھی تھے اور شیخ بھی۔ لیکن وہ اس شامیانے کے نیچے، ان تمام امتیازات وتفریقات کو خیر باد کہہ کر اور اعنانی نسبتوں اور علامتوں کو الگ رکھ کر، صرف **مسلمان** کی حیثیت سے جمع ہوئے تھے اور اپنے تعارف میں ان امتیازی علامات کا شائبہ تک بھی نہ آنے دیتے تھے۔ حتیٰ کہ ان میں سنی بھی تھے اور شیعہ بھی۔ حنفی بھی تھے اور اہل حدیث بھی۔ دیوبندی بھی تھے اور بریلوی بھی۔ لیکن اب وہ ان فرقہ وارانہ امتیازات کو بھی اپنی طرف منسوب نہیں ہونے دیتے تھے۔ کس قدر سرور انگیز اور کیف بار تھا یہ حسین اجتماع جس میں تمام افراد خون، رنگ، نسل، زبان، وطن، حتیٰ کہ مذہبی فرقہ وارانہ امتیازات سے بلند ہو کر، ایک خدا کی محکومی کا جذبہ دل میں اور ایک مقصد کے حصول کا سودا سر میں لے کر، ایک بلند عالمگیر برادری کی حیثیت سے ایک دوسرے سے متعارف ہو رہے تھے، اور زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ

تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!

تقریب گیارہ بجے شب، یہ پُرکیف محفل برخاست ہوئی۔ محفل تو برخاست ہو گئی لیکن اس سے جذبۂ شوق کی سیرابی کیسے ہو سکتی تھی؛ چنانچہ خوابگاہ کے شامیانوں کے نیچے، یہاں وہاں، مختلف حلقے بن گئے اور باہمدگر تفصیلی تعارف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آخر شب ذرا آنکھ جھپکی تھی کہ الصَّلوٰۃ خیرٌ من النوم کی خواب شکن اور سحر پاش صدائے نورانی نے پیغام بیداری دے دیا۔

پہلی نشست

جمعہ ۱۸ راکتوبر۔ چاشت کے وقت کنونشن کا پہلا باقاعدہ اجلاس شروع ہوا۔ اور استقبالیہ اور ناظم ادارہ کی رپورٹوں کے بعد تبریک و تہنیت کی زمزمہ پاشیوں میں محترم پرویز صاحب اسٹیج پر تشریف لائے اور اپنا وہ خطاب ارزانی فرمایا جسے سننے کے لئے سامعین ایک سال سے منتظر اور ہمہ تن شوق تھے۔ سال گزشتہ ان کے خطاب کا سرعنوان تھا۔

خیز و بجاکِ تشنہ

بادۂ زندگی

فشاں

امسال وہ اس سے ایک قدم آگے بڑھے اور اپنے خطاب کو 'خمِ زندگی' سے تعبیر کیا۔ چنانچہ اِس مرتبہ سرعنوان یہ شعر تھا:

بصدائے دردمندے بنوائے دلپذیرے

خمِ زندگی

کشادم بہ جہانِ تشنہ میرے

اور یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں خطابات میں وہی فرق تھا جو بادہ اور خُم میں ہوتا ہے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جن لوگوں کی تحریریں زوردار ہوتا ہے' ان کی تقریر کمزور ہوتی ہے۔ جن کی تقریر پُرشکوہ ہوتی ہے اُنھیں لکھنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔ لیکن پرویز صاحب ان خوش بخت انسانوں میں سے ہیں جنہیں مبدا فیض کی کرم گستری نے قلم اور زبان دونوں کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ جیسی پُرشکوہ اور شگفتہ تحریر' ویسی ہی ولولہ انگیز اور شاداب تقریر۔ بلکہ تفاصیل میں جائیے تو اکثر اوقات ان کی تقریر' تحریر سے بھی مؤثر نظر آتی ہے۔

قریب ڈیڑھ گھنٹہ تک ان کی تقریر جاری رہی جو اس حقیقت کی شاہد تھی کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

وہ تقریر آئندہ صفحات میں آپ کے پیشِ خدمت ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خُمِ زندگی

پیام بہ یارانِ طریق

غزل سرا و نواہائے رفتہ باز آور
بایں فسردہ دلاں حرفِ دلنواز آور

کنشت و کعبہ و بُت خانہ و کلیسا را
ہزار فتنہ ازاں چشمِ نیم باز آور

برادرانِ عزیز! السّلامُ علیکم و رحمۃُ اللہ۔

آپ میں سے جو احباب سال گزشتہ کی کنونشن میں شریک ہوئے تھے انہیں وہ سماں اب تک یاد ہوگا جب آخری دن، تمام افراد کارواں، ایک دوسرے سے گلے مل کر رخصت ہو رہے تھے۔ اُس وقت کیفیت یہ تھی کہ فضا میں ہر طرف خلوص و محبت کی شمعیں فروزاں۔ ذہن، گذشتہ تین دن کی شبانہ روز محفلوں کی کیف آور یاد سے فردوس بداماں۔ سینوں میں پاکیزہ جذبات کا تلاطم۔ قلوب میں حسین تمناؤں کا ہجوم۔ آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو اور لبوں پر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا یہ الوداعی پیغام :

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

للہ الحمد کہ ایک سال کے انتظار کے بعد، خمکدۂ قرآن کے یہ پیمانہ بردار، اس عزم کے ساتھ پھر باعثِ گرمیٔ محفل اور وجہ نشاطِ انجمن ہوتے ہیں کہ

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم

چناں نالیم اندر مسجدِ شہر کہ دل در سینۂ ملّا گدازیم

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (۱۰/۵۸) میں اپنی طرف سے اور آپ تمام احباب کی طرف سے بزمِ طلوعِ اسلام راولپنڈی کے باہمت اور پُر اخلاص کارکنوں کا سپاس گذار ہوں کہ انھوں نے اس اجتماع کے انتظامات کو اپنے ذمہ لیکر، اس کاروانِ راہِ محبت و عزیمت کی دوسری منزل کو بھی (پہلی منزل کی طرح) آسان اور پُر آسائش بنا دیا۔

برادرانِ گرامی قدر! اس قسم کے اجتماعات درحقیقت جماعتوں کی زندگی میں یوم الحساب (یعنی

احتسابِ خویش

احتسابِ خویش کا دن) ہوتے ہیں جس میں اس امر کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ ہم نے پچھلے اجتماع میں جس پروگرام کو اپنے سامنے رکھا تھا اُسے کس حد تک پورا کیا ہے اور اب اس کے بعد ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیئے۔ یاد رکھیئے! جو راہ رو، کسی مقام پر رُک کر یہ نہیں دیکھ لیتا کہ اس کا قدم صحیح راستے پر اٹھ رہا ہے یا نہیں، اُسے منزلِ مقصود تک پہنچنے کا کبھی یقین نہیں ہو سکتا جو کاروباری وقتاً فوقتاً اپنی متاع و بضاعت کا جائزہ نہیں لیتا اور نفع و نقصان کا اندازہ نہیں لگاتا، وہ کبھی حتم و یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی تمام تگ و تاز اور سعی و کاوش اسے کس سمت لیجا رہی ہے۔ ان دو دنوں میں آپ کو بھی یہی کچھ کرنا ہوگا۔ لیکن جیسا کہ میں نے پچھلے سال بھی عرض کیا تھا، جو جماعت قرآنی نظامِ ربوبیت کی تشکیل کا عزم لے کر اٹھتی اور اپنے اللہ سے بیع و شریٰ کا معاملہ کرتی ہے، اس کے نفع اور نقصان کے ماپنے کے پیمانے اور اندازے دوسری جماعتوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ عام جماعتوں کو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انھوں نے کتنے ممبر بھرتی کئے، کسقدر روپیہ فراہم کیا۔ کتنے جلسے کئے، کتنے جلوس نکالے۔ مخالفین کو دبانے کے لئے کون کونسے حربے استعمال کئے اور اس طرح انتخابات میں کتنی نشستیں حاصل کیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قرآنی نظام کی داعی جماعت کے افراد کو دیکھنا یہ ہوگا کہ انھوں نے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا کی ہے۔

داخلی انقلاب

ان کا قلب و دماغ کس حد تک قرآنی تصورات سے ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ ان کی سیرت و کردار کہاں تک قرآنی قالب میں ڈھل چکے ہیں۔ انکی آرزوئیں اور ارادوں کے محرکات کس حد تک قرآنی مقاصد ہیں۔ وہ اپنی ذات، اپنے اعزّہ و اقارب اور دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں قوانینِ خداوندی کی کس قدر نگہداشت کرتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی تو پھر آپ نے دوسرے معیاروں کے مطابق کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلی

ہو، قرآن کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ لیکن اگر ہمارے کردار اور تصورات میں یہ انقلاب پیدا ہو چکا ہے تو یہ کامیابی بڑی کامیابی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اپنے مقصد کے حصول کے لئے خارجی اسباب و ذرائع اور طریق و ترتیب سے بے نیاز ہیں اور ان کی طرف توجہ دینے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ قرآن اس سازو یراق کی تابحد استطاعت فراہمی کی تاکید کرتا ہے۔ (وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ ...... ۸/۶۰)۔ اس لئے حصولِ مقصد کے لئے اسباب و ذرائع کا ہونا بھی ضروری ہے۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ہم میں وہ داخلی تبدیلی پیدا ہو جائے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے تو خارجی اسباب و ذرائع کی کسی حد تک کمی کے باوجود ہم کامیاب و کامران کہلائیں گے۔ اور خدا کا کائناتی قانون ہماری مدافعت میں کھڑا ہو کر معترضین اور مخالفین سے کہہ دے گا کہ

چشم کم منگر عاشقانِ صادق را
کہ ایں شکستہ بہایاں متاعِ قافلہ اند

لیکن اگر ہم اس داخلی انقلاب کے بغیر صرف خارجی سہاروں کے زور پر آگے بڑھنا چاہیں گے تو وہی قانون ہمیں یہ کہہ کر دھتکار دے گا کہ

بہ جہانِ دردمنداں تو بگو چہ کار داری
تب و تاب ناشناسی ؛ دلِ بے قرار داری
چہ خبر ترا ز اشکے کہ فرو چکد ز چشمے
تو بہ برگِ گل ز شبنم دُرِ شاہوار داری

اور یہ ظاہر ہے کہ جو اُس بارگاہ سے دھتکارے جائیں، اُنھیں کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

مَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ۔ (۹/۷۴)

مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ قرآنی فکر اور نظام کے متعلق بات تو ہم سمجھ گئے ہیں لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ داخلی تبدیلی پیدا کس طرح سے ہوتی ہے؟

داخلی انقلاب پیدا کیسے ہو؟

ایک لفظ میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ پیدا ہوتی ہے ایمان سے۔ لیکن تجربہ نے بتایا ہے کہ فقط اتنا کہہ دینے سے بات سمجھ میں نہیں آتی بس مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

گتھی سلجھتی نہیں۔ اس لئے کہ ہم میں سے ہر شخص اس کا مدعی ہے (اور وہ پوری دیانتداری سے ایسا سمجھتا ہے) کہ وہ صاحبِ ایمان ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُس کے اندر یہ تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں کہ ایمان کہتے کسے ہیں؟ اگر اسے سمجھ لیا جائے تو ہو نہیں سکتا کہ ایمان پیدا ہو اور داخلی تبدیلی پیدا نہ ہو۔ یا یہ تبدیلی پیدا نہ ہو اور اس کے باوجود ہم اپنے آپ کو اطمینان دے لیں کہ ہم صاحبِ ایمان ہیں۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ فرض کیجئے آپ کو دو تین دن کا فاقہ ہے آپ بھوک سے نڈھال ہو رہے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص آپ کے سامنے گرم گرم پلاؤ کا قاب لاکر رکھ دیتا ہے۔ اس کی خوشبو سے آپ کی جان میں جان آجاتی ہے۔ آپ اس کی طرف لپکتے ہیں۔ نہایت بیتابی سے نوالہ اٹھاتے ہیں۔ آپ کا ہاتھ منہ کے قریب جاتا ہے کہ اتنے میں وہ شخص کہہ دیتا ہے کہ اس پلاؤ میں ویسے تو ہر چیز خالص اور عمدہ ہے لیکن باورچی نے غلطی سے اس میں نمک کی جگہ سنکھیا ڈال دیا ہے۔ آپ کہیئے کہ یہ سن کر آپ اُس لقمہ کو منہ میں ڈالیں گے یا زمین پر پھینک دینگے؟ ظاہر ہے کہ آپ بھوک سے لاکھ بیتاب ہوں، اس قاب میں سے ایک دانہ بھی چکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ آپ کی طبیعت اس سے کیوں اِبا کرتی ہے؟ ابھی آپ اس کی طرف لپکے تھے۔ پھر آپ کے اندر یکایک یہ تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی کہ آپ اُس سے یوں بھاگنے لگے؟ محض اس لئے کہ آپ کو اسکا یقین ہے کہ اس سے آپ کی موت واقع ہو جائے گی۔ اسے برادران! ایمان کہتے ہیں۔ اب سمجھنے کی بات یہ

ایمان کسے کہتے ہیں؟

ہے کہ اگر یہ کہنے کے بجائے کہ اُس پلاؤ میں سنکھیا پڑا ہے، یہ کہہ دیا جاتا کہ وہ مالِ حرام سے تیار ہوا ہے تو کیا اس وقت بھی ہماری طبیعت کا ردِ عمل ایسا ہی ہوتا؟ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اس پر تو ہمارا **ایمان** ہے کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے لیکن اس پر ہمارا **ایمان** نہیں کہ مالِ حرام بھی مہلک ہوتا ہے۔ اگر اس پر بھی ہمارا ویسا ہی یقین ہوتا جیسا کہ سنکھیا کے متعلق ہے تو ہو نہیں سکتا تھا کہ اس کے خلاف ہمارا وہ ردِ عمل نہ ہوتا جو سنکھیا کے خلاف ہوا تھا۔ اس مثال کو سامنے رکھیئے اور پھر سوچیے برادران! کہ کیا قرآنی اقدار پر ہمارا ایمان ایسا ہے کہ ہمیں یقین ہو کہ ان کی خلاف ورزی سے ہماری انسانیت کی اُسی طرح موت واقع ہو جائے گی جس طرح ہمیں اس پر یقین ہے کہ سنکھیا کھانے سے ہماری طبعی موت واقع ہو جائے گی؟ اگر ان اقدار کے متعلق ہمارا اس قسم کا ایمان نہیں تو پھر ہم میں وہ داخلی تبدیلی کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔

جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے؛ اور اگر ان پر ایمان ہے تو پھر ہو نہیں سکتا کہ اس کے بعد ہمارے اندر یہ انقلاب پیدا نہ ہو جائے۔

ایمان کیسے پیدا ہو؟

اس پر یہ پوچھا جاتا ہے کہ قرآنی اقدار کے متعلق اس قسم کا ایمان کیسے پیدا ہو؟ اس کے لئے پہلے یہ سمجھئے کہ سنکھیا کے متعلق اس قسم کا ایمان کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اس کی حسب ذیل شکلیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) ہم نے سنکھیا کھانے والے کو خود مرتے دیکھا ہو۔

(۲) یا ہم خود، ایک ڈاکٹر یا سائنٹسٹ کی طرح لیبارٹری میں سنکھیا کا تجزیہ کر کے علمی طور پر اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ یہ واقعی قاطع حیات ہے۔

(۳) اگر ہم خود اتنی مشقت نہیں اٹھانا چاہتے تو کسی ایسے محقق سے سمجھ لیں جس نے اس قسم کا تجزیہ کیا ہو۔

(۴) اور اگر اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو پھر اس کی بات پر ویسے ہی یقین کر لیں جیسے ہم طب کی کتابوں میں یہ پڑھ کر کہ فلاں چیز مضر ہے، اس کے مضر ہونے پر یقین کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد تجربہ ہمیں خود بتا دے گا کہ کہنے والے نے سچ کہا تھا یا نہیں۔

اس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے کہ سنکھیا قاطع زندگی ہے یہی طریقے ممکن ہو سکتے ہیں۔ اب آپ طبعی زندگی سے انسانی ذات کی طرف آئیے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسانیت (یا انسانی ذات) کی ہلاکت، جسمانی موت کی طرح محسوس شکل میں ہمارے سامنے نہیں آسکتی۔ اس لئے اس کے متعلق آنکھوں سے دیکھ کر یقین حاصل کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری صورت خود تحقیق کرنے کی ہے۔ سو ہم میں سے کتنے ہیں جو اس کو وہ کسی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینے کے لئے آمادہ ہو سکتے ہیں؟

تیسری شکل یہ ہے کہ ہم کسی سمجھے ہوئے سے سمجھ کر اپنا اطمینان کر لیں۔ اسے افہام و تفہیم کا طریق یا فکری انداز کہا جاتا ہے۔ یقین اور ایمان پیدا کرنے کا یہ فکری طریق وہ ہے جس کی قرآن میں اس قدر تاکید آئی ہے۔ اس موضوع پر طلوع اسلام اور میری تصانیف میں اتنا کچھ آپ کے سامنے آچکا ہے کہ میرے خیال میں اس وقت اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس طریق کار

سے نہ کسی کی عقل وفکر کو ماؤف کر کے حقیقت کو منوایا جاتا ہے اور نہ ہی جور و استبداد سے اُسے اس کے ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (۲/۲۵۶) کے یہی معنی ہیں۔ یہی ہے برادران! وہ طریقِ عمل جس سے آپ کے دل میں بھی ایمان پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ

ایمان خود پیدا کیا جاتا ہے

کہ ایمان کوئی ایسی چیز نہیں جسے کوئی دوسرا شخص آپ کے دل میں پیدا کر سکتا ہے۔ دوسرا شخص زیادہ سے زیادہ آپ کو حقیقت سے آگاہ کر سکتا اور جس بات کا آپ کو علم نہ ہو اسے آپ کو سمجھا سکتا ہے، آپ کے اندر ایمان داخل نہیں کر سکتا، خواہ وہ کتنا ہی کیوں نہ چاہے۔ اور تو اور خود نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن میں ہے کہ اِنَّکَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ...... (۲۸/۵۶) تو کسی شخص کو راستہ پر لگا نہیں سکتا خواہ تو کتنا ہی کیوں نہ چاہے۔ راستہ پر وہی لگ سکتا ہے جو اللہ کے قانون کے مطابق اس پر خود لگنا چاہے اور اللہ کا وہ قانون یہ ہے کہ جو شخص تفقہ اور تدبر سے کام نہیں لیتا اور یوں زندگی کے صحیح راستے سے پھر جانا چاہتا ہے، اُسے اُس راستے سے پھرا دیا جاتا ہے .... ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ (۹/۱۲۷)۔ آپ نے غور کیا برادران! کہ صحیح راستہ پر چلنے (یعنی ایمان اور ایمان کی رُو سے اپنے اندر "داخلی انقلاب" پیدا کرنے) کے لئے تدبر و تفکر کی شرط کس قدر بنیادی ہے؟ اس سے ظاہر ہے کہ جس شخص کے دل میں اس قسم کا ایمان پیدا نہ ہو، اُسے جان لینا چاہیئے کہ یا تو وہ اس حقیقت کو سمجھا نہیں کہ قرآنی اقدار کے خلاف زندگی بسر کرنے سے ہلاکت یقینی ہے اور اگر اس نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے (اور اس کے باوجود وہ ایمان پیدا نہیں ہوا) تو وہ شخص ہلاکت سے محفوظ رہنا نہیں چاہتا۔ ایسے شخص کے لئے حقیقت کا سمجھنا اور نہ سمجھنا برابر ہے۔ جو شخص زندگی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اس کے لئے یکساں ہے کہ اسے یہ بتایا جائے یا نہ بتایا جائے کہ کھانا زہر آلود ہے۔ سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۲/۶)

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ابتدا ہی میں کہہ دیا ہے کہ یہ ضابطۂ ہدایت صرف ان لوگوں کی راہ نمائی کر سکتا ہے جو زندگی کی ہلاکتوں سے محفوظ رہنا چاہیں۔ (هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ (۲/۲) نبی اکرمؐ نے تعلیم کتاب و حکمت سے زندگی کی ان دونوں راہوں کو واضح کر کے بتا دیا اور اچھی طرح سمجھا دیا۔ جن لوگوں نے اسے سمجھ لیا اور سمجھ لینے کے بعد فیصلہ کر لیا کہ انہیں ہلاکت سے بچنا ہے' اُن کے اندر ایمان اس انداز سے

پیدا ہوا کہ دنیا کی سخت سے سخت تکلیف یا بڑے سے بڑا لالچ انھیں اس راستے سے ہٹا کر دوسرے راستے پر چلنے کے لئے آمادہ یا مجبور نہ کر سکا۔ اور یہ چیز بالکل بدیہی اور فطری ہے۔ جو شخص موت سے بچنا چاہتا ہے وہ زہر آلود کھانے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کے لئے تیار نہ ہوگا خواہ اُس کی چمڑی تک بھی کیوں نہ ادھیڑ دی جائے یا دولت کے انبار اس کے سامنے کیوں نہ رکھ دیئے جائیں۔ اس کی زبان سے کوڑے کی ہر ضرب کے ساتھ (حضرت) بلال رضؓ کی طرح یہی نکلے گا کہ اَشْہَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ اور زر و سیم کی ہر پیشکش کو نگاہِ استحقار سے ٹھکراتے ہوئے وہ (حضور رسالتمآبؐ کی اتباع میں) بلا توقف کہہ دے گا کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیا جائے تو بھی میں اپنے اس طریق سے نہیں ہٹوں گا۔ اس لئے کہ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ (۶/۱۵) میں جانتا ہوں کہ اس راستے سے ہٹنے کا نام ہلاکت اور تباہی ہے۔

یہ ہے برادران! وہ علیٰ وجہ البصیرت ایمان جو انسان کے اندر ایسا انقلاب پیدا کر دیتا ہے جس سے اُس کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ اقدار کی نوعیت بدل جاتی ہے، زندگی کے راستے بدل جاتے ہیں حیات کے تصورات بدل جاتے ہیں۔ مقصود بدل جاتا ہے۔ منتہیٰ بدل جاتا ہے اور (قرآن کے الفاظ میں) یہ زمین بدل جاتی ہے۔ آسمان بدل جاتا ہے۔ اور اس دنیائے کہن کی جگہ ایک جہانِ تازہ اپنی پوری زیبائیوں اور رعنائیوں کے ساتھ منصۂ شہود پر آجاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اس سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ قرآن، زندگی کی ساری عمارت کو ایمان کی بنیادوں پر کیوں استوار کرتا ہے اس لئے کہ اس کے بغیر اُس عمارت کی کوئی اینٹ بھی صحیح رُخ پر نہیں رکھی جا سکتی۔ نہ ہی اس کے بغیر انسان کے سینے میں کردار کا جوش اور عمل کا ولولہ بیدار ہو سکتا ہے۔ یہ ایمان ہی کا کرشمہ ہے کہ جس سے انسان کے سر میں وہ سودا پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ — کبھی یورپ کے کلیساؤں میں، اور — کبھی افریقہ

کے تپتے ہوئے صحراؤں میں یہ کہہ کر اذانیں دیتا پھرتا ہے کہ

غزل سرائیم و پیغام آشنا گوئیم
بآں بہانہ دریں بزم محرمے جوئیم

اس ایمان سے اس کے دل میں وہ قوت (سلطان) پیدا ہو جاتی ہے جس سے یہ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۔ (۵۵/۳۳) سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

لہٰذا برادران! اگر کوئی اس کی شکایت کرتا ہے کہ اُس کے سر میں یہ سودا کیوں نہیں پیدا ہوتا اور اُس کے دل میں اس تپش و خلش اور سوز و گداز کی نمود کیوں نہیں ہوتی۔ اُس کی خاکستر سے ایسا شعلہ بے باک کیوں نہیں اُٹھتا۔ اور اُس کی آرزوئیں عمیق اور ہمتیں بلند کیوں نہیں ہوتیں۔ تو اس سے کہو کہ:

یقیں پیدا کر اے غافل! کہ مغلوبِ گماں تو ہے

اب میں برادران! ایک اور گوشے کی طرف آنا چاہتا ہوں۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ ۔ کیا یہ لوگ نظامِ خداوندی کے علاوہ کوئی اور نظام اختیار کرنا چاہتے ہیں؟ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا ۔ وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۳/۸۲) حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کوئی بھی ہے وہ خدا کے قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہے۔ اور اُن کا ہر قدم اُسی کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ اس آیۂ جلیلہ میں ایک عظیم حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے (انسانوں سمیت) قانونِ خداوندی کے سامنے جھکتی ہے (۹۲/۹) جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے وہ اس قانون کے سامنے طوعاً (بہ طیبِ خاطر) سجود ریز ہے۔ چنانچہ سورۂ حٰمٓ سجدہ میں ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (زمین کی تخلیق و تحسین کے بعد) خدا نے فضائی کروں کی طرف توجہ دی۔ اور وہ اُس وقت ہنوز گیس کی حالت میں تھے۔ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۔ اس نے زمین اور آسمان سے کہا کہ

دینِ خداوندی

ثم طوعًا او کرھًا تمہیں اس طرف بہرحال آنا ہوگا۔ قَالَتَا اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ (۴۱/۱۱) ان دونوں نے کہا کہ کرہًا کیوں؟ ہم بہ طیب خاطر ادھر آتے ہیں۔ اب رہے انسان، سو ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو قانونِ خداوندی کو طوعًا (بہ طیب خاطر) دل کی پوری رضامندی سے اختیار کر لیتا ہے لیکن دوسرا گروہ وہ ہے جسے اس کے سامنے کرھًا جھکنا پڑتا ہے۔ یعنی خدا کا مکافاتی قانون (کہ جسے عام طور پر زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے) انہیں اس کے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

طوعًا و کرھًا

قرنِ اول کی جماعت مومنین نے قرآنی نظام کو بطیب خاطر قبول کیا۔ اور چند دنوں کے اندر اندر دنیا میں ایسا انقلاب برپا کر دیا جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے اس سے قبل نہیں دیکھی تھی۔ بعد میں آنے والوں نے اس ضابطۂ خداوندی کو چھوڑ کر انسانوں کے خود ساختہ قوانین و ضوابط کی اطاعت اختیار کر لی اور رفتہ رفتہ ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (۳۹/۴۵) جب اُن لوگوں سے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے کہا جاتا ہے کہ وہ (انسانوں کے خود ساختہ منہاج و مسلک کو چھوڑ کر) صرف قانونِ خداوندی کی اطاعت اختیار کریں تو اُن کے قلوب غم و غصہ سے طلسمِ پیچ و تاب بن جاتے ہیں۔ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا۔ وہ نفرت و انتقام کے جذبات سے مغلوب ہو کر منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ مُعْرِضِيْنَ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ (۱۷/۴۶) مُّسْتَنْفِرَةٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (۷۴/۵۰-۵۱) جیسے بدکا ہوا گدھا شیر سے ڈر کر بھاگ اٹھتا ہے کہ وہ کہیں اُسے کھا نہ جائے۔ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۹/۴۵) لیکن جب خدا کے سوا اوروں کا نام لیا جاتا ہے تو خوشی سے ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ اس ہزار سال میں قرآن کے متعلق جو ہمارا طرزِ عمل رہا ہے، ان آیات میں اس کی صحیح صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ جس گوشے سے سنیے، اس قسم کی آوازیں سنائی دیں گی کہ "تنہا قرآن سے دین کی تکمیل نہیں ہوتی" (حالانکہ قرآن بھیجنے والے کا اعلان ہے کہ

قرآن سے بُعد و مغائرت

مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ (۶/۳۸) دین کے متعلق کوئی بات ایسی نہیں جس کی اس کتاب میں کمی ہو۔ "یہ کتاب مبہم ہے" (حالانکہ اس نے اپنے آپ کو كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ کہا ہے۔ ۲۷/۱) "غیر واضح ہے" (حالانکہ اس کا دعوٰی ہے کہ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ (۴۱/۳) یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات کو نکھار کر، الگ الگ کر کے، بیان کیا گیا ہے۔) "ناقابلِ فہم ہے" (حالانکہ خدا نے کہا ہے کہ وَلَقَدْ

يَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّكۡرِ (۵۴/۱۷) اور یہ حقیقت ہے کہ ہم قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنایا ہے)، غیر قرآنی فیصلے اس کے احکام کو منسوخ کر سکتے ہیں" (حالانکہ اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۶/۳۴) احکام خداوندی کو کوئی بدلنے والا نہیں) غرضیکہ کوئی تہمت ایسی نہیں جس سے ہم نے اس کتاب عظیم و جلیل کو متہم نہ کیا ہو اور کوئی حربہ ایسا نہیں جسے ہم نے، لوگوں کو اس سے دور رکھنے کے لئے اختیار نہ کیا ہو۔ ماضی کی سرگذشت سے قطع نظر، خود ہمارے زمانے میں مسلمانوں کی طرف سے قرآن کی آواز کی جس قدر مخالفت ہو رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ وہ کون سی تدبیر ہے جو اس آواز کو دبانے کی خاطر نہیں کی جاتی؟ وہ کون سا جھوٹ ہے جو اس "ثواب عظیم" کے لئے بولا نہیں جاتا؟ وہ کون سا بہتان ہے جو اس "جہادِ اکبر" کے لئے تراشا نہیں جاتا؟ لیکن اس کے باوجود برادران! آپ دیکھئے کہ وہ جو قرآن نے کہا تھا کہ جو لوگ خدا کے قانون کے سامنے طوعاً نہیں جھکتے انہیں اس کے حضور کرہاً جھکنا پڑے گا، وہ کس قدر صحیح ہے۔ ابھی دو چار سال ادھر کی بات ہے کہ جب قرآنی نظامِ ربوبیت کے داعی طلوعِ اسلام کی طرف سے یہ آواز بلند کی گئی کہ رزق کے سرچشمے انفرادی ملکیت کے بجائے نظامِ خداوندی کی تحویل میں رہنے چاہئیں تاکہ وہ نوعِ انسانی کی عام پرورش کا ذریعہ بن سکیں تو اس کے خلاف چاروں طرف سے مخالفتوں کا طوفان اس تلاطم انگیزی سے اُبھرا گویا يَكَادُوۡنَ يَسۡطُوۡنَ بِالَّذِيۡنَ يَتۡلُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا (۲۲/۷۲) وہ اس قانونِ خداوندی کو پیش کرنے والوں پر جھپٹ پڑینگے۔ لیکن اب انہی مخالفین کو زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر یہ کہنا پڑا ہے کہ

اور مخالفت

مجبوراً جھکنا پڑتا ہے

> میرے خیال میں اس بارے میں پہلے گروہ (یعنی قدامت پسند طبقہ) کو بھی کوئی اختلاف نہیں ہوگا کہ بنیادی ضروریات پیدا کرنے والے ذرائع و عاملین کو کم از کم موجودہ حالت میں کچھ دنوں تک حکومت کے قانونی ہاتھوں میں رہنا چاہیئے جس کی گنجائش کتاب و سنت میں موجود ہے۔ (مجلہ رحیق۔ بابت جون ۱۹۵۷ء)[۵]

یعنی طلوعِ اسلام تو پھر بھی ان ذرائع کو قرآنی نظام کے ہاتھ میں دینے کی تجویز کرتا تھا، یہ حضرات انہیں

---

۵ یہ جماعت اہلحدیث کا آرگن تھا۔

موجودہ حکومت کے قانونی ہاتھ میں دینے کی گنجائش کتاب وسنت میں پا رہے ہیں۔ آپ نے چیلنج ملاحظہ فرمایا؛

یا مثلاً جب طلوع اسلام کی طرف سے اس حقیقت کا اعلان ہوا کہ قرآن کی رو سے سرمایہ داری اور زمینداری کا نظام قطعاً باطل ہے تو قدامت پرست طبقہ کی طرف سے ہنگامہ برپا کر دیا گیا کہ یہ کمیونزم ہے۔ دہریت ہے۔ دین میں فتنہ انگیزی ہے۔ چنانچہ اس کے خلاف تقریریں کی گئیں، کتابیں لکھی گئیں۔ پمفلٹ شائع کئے گئے۔ انہی حضرات کو اس قانونِ خداوندی کے سامنے کس طرح گرھا جھکنا پڑا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ انہوں نے حال ہی میں اپنی ایک کانفرنس میں حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا ہے۔

> اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی ہر چیز انسان کے لئے پیدا کی ہے اور اصل نقد وقیمت سرمایہ کی نہیں انسان کی ہے۔ اس لئے ایک اسلامی مملکت میں ملک کی دولت اور کاروبار کو عام شہریوں کی ترقی اور خدمت کے لئے وقف ہونا چاہیئے۔ رائج الوقت نظام نے اس دنیا کے تمام ذرائع معاش پر ایک محدود گروہ کا تسلط قائم کر دیا ہے اور سرمایہ کو انسان کا خدا بنا رکھا ہے اس لئے ملک کی تمام دولت اور کاروبار اس مخصوص گروہ کی اجارہ داری بن چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ صورتِ حال سراسر ظالمانہ ہے اور ہم اسے ایک ایسے نظام میں بدل دینا چاہتے ہیں جس میں ملک کی دولت اور کاروبار پر اجارہ داری ختم ہو جائے اور عوام کو رزق حاصل کرنے اور دولت کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے کے مساوی مواقع حاصل ہوں۔ اس نظریہ کو بروئے کار لانے کے لئے جماعتِ اسلامی موجودہ معاشی نظام میں حسب ذیل تبدیلیاں" انتھیٰ ہے ... بڑی بڑی ملکیتوں اور دولت کے ذخیروں کو اسلامی قانون کے مطابق عوام میں پھیلانے کا کام بلا تاخیر شروع کیا جائے ....

(جماعت اسلامی کی لیہ کانفرنس میں پاس شدہ ریزولیوشن۔ بحوالہ انجام کراچی بابت ۲۸ ہے ۵۵ء)

یا مثلاً جب طلوع اسلام نے کہا کہ اسلام میں فرقہ بندی شرک ہے اور امت میں اختلاف خدا کا عذاب تو ایک ہنگامہ برپا کر دیا گیا کہ یہ حدیث کا انکار ہے۔ سنتِ نبوی کی مخالفت ہے۔ کیونکہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ

اختلاف امتی رحمۃ۔ لیکن اب حدیث کے سب سے بڑے متبعین کی طرف سے اعلان ہو رہا ہے کہ

اختلاف امتی رحمۃ کا جملہ بالکل بے اصل اور غیر مستند ہے اور قطعاً اس لائق نہیں
کہ اس کو حدیث سمجھ کر دلیل و برہان کے طور پر استعمال کیا جائے۔
(الاعتصام۔ بابت ۲۰ اگست ۱۹۵۷ء)

للہ الحمد۔ حوریاں رقص کناں سجدۂ شکرانہ زنند۔

آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے سابقہ کنونشن میں کہا تھا کہ طلوع اسلام کی آواز کا اثر یہ ہے کہ اس کے مخالفین خود طلوع اسلام کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر میں اس کے الفاظ و اصطلاحات بلا تکلف استعمال ہوتے ہیں حتیٰ کہ وہ قرآن کی آیات کا ترجمہ بھی اسی کے اسلوب و انداز میں کرتے ہیں۔ اس کے بعد میں نے کہا تھا کہ

یہاں تک تو لگا لاتے ہیں ہم رستے پہ واعظ کو
کہ سجھا تا ہوا اب تا در میخانہ آتا ہے

لیکن اس ایک سال میں "واعظ" کے مشرب میں جس قدر نمایاں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور جس کی کچھ مثالیں میں نے ابھی پیش کی ہیں، اس کے پیش نظر میرا خیال ہے کہ اب ایک قدم آگے بڑھ کر یہ کہنا چاہیئے کہ

سنا ہے شیخ نے بھی بیعت پیر مغاں کر لی
غنیمت ہے کہ بھولا صبح کا ہنگام شام آیا

اور مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب پیر میخانہ نو وارد توبہ شکنوں کا تعارف کچھ اس قسم کے الفاظ سے کرائے کہ

شریف مکہ رہا ہے کئی برس اے شیخ
یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

وَكَانَ ذَالِكَ عَلَى اللهِ يَسِيْرًا (۳۳/۱۹)

حقیقت یہ ہے برادران عزیز! (اور میں اسے بحضور رب العزت جھکی ہوتی نگاہوں، لرزتے ہوتے

لہ یہ بھی جماعت اہل حدیث کا آرگن ہے۔

ہونٹوں اور ڈبڈبائی آنکھوں سے بطورِ تحدیثِ نعمت عرض کرتا ہوں نہ بہ غرضِ فخر و مباہات) کہ اس مختصر سے عرصہ میں قرآنی تصورات زندگی اور نظریاتِ حیات کی شمعِ نورانی پر مدتوں سے پڑے ہوئے پردے جس تیزی سے اُٹھتے چلے گئے ہیں، ہم اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ شاید نہ لگا سکیں. کیونکہ یہ روشنی ہماری آنکھوں کے بہت زیادہ قریب ہے. لیکن آنے والی نسلیں جب اس دور پر نگہ، بازگشت ڈالیں گی تو وہ فکر و نظر کے اس انقلاب کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکیں گی۔

دعا دینگے مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے ہیں میرے ساتھ منزل کے

لاء کمیشن قرآنی فکر کی اس مخالفت کی ایک بیّن مثال وہ شور و شغب ہے جو لاء کمیشن[1] میں میری شمولیت پر مچ پایا گیا. (جیسا کہ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۵۷ء میں بتایا گیا ہے) کمیشن میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے متعلق ان مخالفت کرنے والوں کا فتویٰ یہ ہے کہ وہ قرآن تک کے منکر ہیں (واضح رہے کہ میں کمیشن کے اراکین کے متعلق کسی قسم کا اظہارِ خیال نہیں کر رہا. صرف ان مخالفین کے الزامات کو دہرا رہا ہوں). اس میں ایسے لوگ بھی ہیں (یعنی میرے علاوہ) جن کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ وہ منکرِ حدیث ہیں. لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان لوگوں کا نام تو محض ایک آدھ مرتبہ لیا گیا اور وہ بھی برائے وزنِ بیت. لیکن مخالفت کے طوفان کا سارا رُخ "خانہ انوری" (یعنی اس خاکسار) کی طرف رہا. یہاں تک کہ اس کمیشن کا نام ہی انہوں نے "پرویزی کمیشن" رکھ دیا. ظاہر ہے کہ اگر یہ مخالفت اس اصول پر مبنی ہوتی کہ کمیشن میں ایسے لوگوں کو کیوں شامل کیا گیا ہے جو (بقول ان کے) قرآن یا حدیث کے منکر ہیں، تو ان تمام اراکین کی (جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے) یکساں مخالفت ہونی چاہیئے تھی. لیکن ان سب کو چھوڑ کر تمام تیروں کا نشانہ جو صرف ایک کو بنا لیا گیا تو یہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ اس مخالفت کی بنیاد حدیث کی محبت نہیں کچھ اور ہے. میرا جرم یہ ہے کہ میں انسانی زندگی کے معاملات کے تصفیہ کے لئے

---

[1] دستورِ پاکستان (۱۹۵۶ء) کے تحت حکومت نے ایک اسلامک لاء کمیشن متعین کیا تھا جس میں پرویز صاحب کو بھی ایک رکن کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا. ۱۹۵۸ء میں اس دستور کی تنسیخ کے ساتھ یہ کمیشن بھی کالعدم قرار پا گیا. (طلوعِ اسلام)

اللہ کی کتاب کو سب سے اوپر رکھتا ہوں اور صحیح اور غلط کا معیار اسی کو قرار دیتا ہوں۔ حدیث کے متعلق جو میرا مسلک ہے میں نے اس کی وضاحت سال گذشتہ کی کنونشن کے خطاب میں، ان الفاظ میں کر دی تھی!

جو روایات نہ قرآن کے خلاف ہیں اور نہ ہی ان سے حضورؐ کی سیرت مقدسہ پر
کسی قسم کا حرف آتا ہے انہیں ہم صحیح مانتے ہیں۔ (بادۂ زندگی)

اگر ایسا عقیدہ رکھنے والے کو منکرِ حدیث کہا جاتا ہے تو پھر معاف رکھیئے

نہ من تنہا دریں مے خانہ مستم
جنید و شبلی و عطار ہم مست

اس صورت میں اس الزام سے تو کوئی بھی نہیں بچ سکتا۔ باقی رہی حدیث کی قانونی حیثیت سو اس کے متعلق ہم نے دوسرے مقام پر تفصیل[1] سے گفتگو کی ہے جس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔

اس مخالفت کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ لاء کمیشن کا فریضہ صرف اتنا ہے کہ مروجہ قوانین کو کتاب وسنت کے مطابق مدون کرنے کی سفارشات کرے۔ یعنی اس کا کام صرف سفارش کرنا ہے۔ اس سے زیادہ اسے کوئی اختیارات حاصل نہیں۔ کمیشن کی یہ سفارشات مجلس قانون ساز (لیجسلیٹو اسمبلی) کے سامنے پیش ہوں گی جو انہیں قانونی حیثیت دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کرے گی۔ یعنی اس مجلس کو قانون سازی کا اختیار ہوگا۔ یہ کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اس مجلس (یعنی لیجسلیٹو اسمبلی) میں ــــ اس آئین کی رُو سے جسے یہ مخالفین حضرات اسلامی آئین قرار دے چکے ہیں، یا کم از کم اُسے تسلیم کر چکے ہیں ــــ مسلمان ممبروں کے دوش بدوش غیر مسلم ممبرز (یعنی ہندو اور عیسائی) بھی موجود ہیں اور انہیں اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ کون سا قانون کتاب وسنت کے مطابق ہے اور کون سا نہیں، ووٹ دینے کا برابر کا حق حاصل ہے۔ اب آپ سوچئے کہ جس مجلس نے اسلامی قوانین کے متعلق آخری فیصلہ کرنا ہے اس میں غیر مسلموں کی شرکت تو ان "حامیانِ دینِ متین" کے نزدیک قطعاً قابلِ اعتراض نہیں لیکن اُس کمیشن میں جس کا کام صرف سفارش کرنا ہے، ایک ایسے مسلمان کی شرکت جو روایات کے بارے میں ان کا ہمنوا نہیں، ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ اور ان کا یہ طرزِ عمل اُس شخص کے متعلق ہے جو آج تک یہ پکارتا چلا آرہا ہے کہ جس مجلسِ قانون ساز میں غیر مسلم بھی ہوں وہ قطعاً اسلامی

---

[1] ملاحظہ ہو ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "اسلام میں قانون سازی کا اصول"۔

(طلوعِ اسلام)

نہیں کہلا سکتی۔

مخالفت کی وجہ

لیکن برادران! پیغامِ خداوندی کی یہ مخالفت کوئی نئی چیز نہیں قرآن بتاتا ہے کہ شروع سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ (۳۴/۳۴) یہ تاریخ کی بین حقیقت ہے کہ دنیا کی کسی قوم کی طرف خدائی دعوت کا پہنچانے والا کوئی ایسا نہیں آیا جس کی مخالفت اس قوم کے مترفین کی طرف سے یہ کہہ کر نہ ہوئی ہو کہ ہم اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اُن کی اس مخالفت کی وجہ کیا تھی، اس کے متعلق تاریخ کی شہادت قابلِ غور ہے۔ جہاں تک انبیاءِ سابقہ کا تعلق ہے حضرت عیسٰیؑ کے سلسلہ میں اس مخالفت کی شدت اپنی انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ مخالفت کا یہ طوفان ہیکل کے متولی اور یہودی شریعت کے علمبردار، علماء اور مشائخ (احبار و رہبان) کی طرف سے برپا کیا گیا تھا جو ان کے قتل تک کے درپے ہو گئے تھے۔ وہ آپ کے اس قدر شدید دشمن کیوں تھے، اس کی وجہ اور تفصیل حضرت مسیحؑ کے ایک حواری، جناب برنباس نے اپنی انجیل کی فصل ۲/۱۴۲ میں ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

> تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے؟ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت تو یہ ہماری تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا (لیکن جب اسے حکومت حاصل ہو گئی) تو اس کے ماتحت ہمارا انجام کیا ہو گا؟ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ اُس وقت ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے اور ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔ حالانکہ اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی بابت کچھ پروا کرنے والے نہیں۔ اور اسی سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں وہ کر لیں پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے بنسر بانی اور روزے کے ساتھ اُسے راضی کر لینا ممکن ہے۔ مگر جب کہ یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی کیا جا سکے گا جب تک یہ اللہ کی اطاعت ایسے ہی ہوتے نہ دیکھے جیسی کہ موسیٰ نے لکھی ہے۔

یہی بات ساری یہ تھی کہ انھیں نظر آتا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ انہیں خدا کے احکام کے مطابق چلائیں گے جس سے ان کی پیشوائیت ختم ہو جائے گی اور ان کی اولاد کو خود کما کر روٹی کھانی پڑے گی اور چونکہ کمانے کا ڈھنگ انہیں آتا نہیں اس لئے انہیں مطیہ کے طور پر روٹی مانگنی پڑے گی۔ یہی مسئلہ سارا اپنے اقتدار اور معاش کا تھا۔ جسے تحفظِ ناموسِ شریعت کے نقاب میں چھپایا جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے، برادران اس تاریخی شہادت کے بعد اس ضمن میں اس کے سوا اور کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

اب میں عزیزانِ من! آپ کی توجہ ایک اور گوشے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ہم سمجھے بیٹھے تھے کہ جونہی پاکستان بن گیا ہماری تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ پاکستان بن گیا، لیکن مشکلات ویسی کی ویسی ہی رہیں۔ پھر ہم سے یہ کہا گیا کہ جب ہمارا دستور بن جائے گا تو ہمارا پاپ کٹ جائے گا۔ چنانچہ وہ دستور بھی بن گیا جس کے بننے پر یہ فتوے دے دیا گیا کہ للہ الحمد! اب ہماری مملکت مسلمان ہو گئی ہے[1]۔ لیکن ہمارے حالات کا سدھرنا تو ایک طرف، وہ پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئے۔ اب ہم یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ جب اسلامی قوانین مرتب ہو جائیں گے تو پھر حالات سنور جائیں گے۔ یاد رکھیے! جس طرح محض پاکستان بن جانے اور موجودہ آئین مرتب ہو جانے سے ہمارے حالات نہیں سدھر گئے اسی طرح مروجہ قوانین کے "کتاب و سنت" کے مطابق مدون ہو جانے سے بھی ہماری عقدہ کشائی از خود نہیں ہو جائے گی۔ اس کے لئے دو شرطیں ضروری ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ ہمارے دستور کو فی الواقعہ اسلامی ہونا چاہیئے۔ اسلامی دستور کی رو سے مملکت کی غرض و غایت بلکہ وجہ جواز (JUSTIFICATION FOR EXISTENCE) یہ ہوتی ہے

مشکلات کا حل

اسلامی مملکت کے بنیادی خطوط

(۱) وہ تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی پوری پوری ذمہ دار

---

[1] سنہ ۱۹۵۶ء کے دستور کے نفاذ پر جماعت اسلامی نے ایسا کہا تھا۔ (طلوعِ اسلام)

ہو۔ اور

(۲) وہ تمام ایسے اسباب و ذرائع فراہم کرے جن سے افرادِ معاشرہ کی مضمرانی صلاحیتیں پورے طور پر نشو و نما پاتی رہیں اور اس میں چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز نہ ہو۔

(۳) اس میں انصاف بلاقیمت اور بلارعایت ملے۔ اور کوئی فیصلہ حدود اللہ سے نہ ٹکرائے اگر کسی مملکت میں ایک متنفس بھی رات کو بھوکا سو جاتے (حضرت عمرؓ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر گیا تو عمرؓ سے اس کی بابت قیامت میں بازپرس ہوگی) اگر اس میں ایک فرد بھی بغیر کپڑے کے رہ جاتے۔ اگر کوئی ایک خاندان بھی چھت سے محروم ہو، اگر کوئی ایک بچہ بھی صحیح تعلیم و تربیت کے بغیر رہ جاتے، اگر کوئی ایک مریض بھی بلاعلاج کے مرجائے۔ اگر کسی غریب سے غریب انسان کی جان، مال، عزت، آبرو، محفوظ نہ رہے (یاد رہے کہ میں غریب سے غریب کا لفظ موجودہ معاشرتی حالات کے مطابق استعمال کر رہا ہوں ورنہ اسلامی مملکت میں کوئی غریب ہو نہیں سکتا) اگر لوگوں کو انصاف حدود اللہ کے مطابق بلاقیمت نہ ملے ۔۔۔ غرضیکہ جس مملکت میں کوئی فرزندِ آدم اپنے آپ کو کسی ضمن میں بھی کسی دوسرے کا محتاج پاتے یا اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے تو اس مملکت کو قطعاً حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو اسلامی مملکت اور اپنے آئین و قوانین کو قرآنی قرار دے سکے۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

دوسری شرط یہ ہے کہ اس مملکت کے سربراہ اِن بنیادی تصورات پر دل سے یقین رکھیں، انہیں بروئے کار لانے کا عہد کریں اور خود اپنی زندگی حدود اللہ کی چار دیواری کے اندر بسر کریں۔

ہماری مملکت کے تصور میں یہ تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک افرادِ معاشرہ میں یہ احساس بیدار نہ ہو جائے کہ جو حکومت ان اسلامی تقاضوں کو پورا نہ کرے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہہ سکیں کہ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ۔ (۴۱-۴۰/۷۰) ہم قانونِ خداوندی کی رو سے اس پر قادر ہیں کہ تمہاری جگہ ایک بہتر حکومت کو لے آئیں اور تمہاری کوئی قوت ہمیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتی۔ یہی ہے برادران وہ صحیح جمہوریت جسے قرآن سکھلانے کے لئے آیا تھا۔

لیکن عوام میں یہ احساس بیدار نہیں ہو سکتا جب تک اس قرآنی فکر کو اس طرح عام نہ کیا جائے کہ ساری فضا اس سے متاثر ہو جائے۔ اور یہی ہے وہ فریضہ جسے برادرانِ من! آپ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ یہ فریضہ کس قدر اہم، اور یہ کام کس قدر مشکل اور وسیع ہے۔ اگر آپ واضح تر الفاظ میں سننا چاہتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان کا مستقبل اور اس میں قرآنی نظام کا قیام صرف آپ احباب کی سعی و عمل کے ساتھ وابستہ ہے۔ میں نے **صرف** کا لفظ یونہی زور دینے کے لئے استعمال نہیں کیا۔ ایک امرِ واقعہ بیان کرنے کے لئے کیا ہے۔ اور وہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت قرآنی فکر کی یہ آواز آپ کے اس مختصر سے حلقہ کے سوا اور کہیں سے نہیں اٹھ رہی۔ اس حلقہ کو چھوڑ دیجئے تو فضا میں چاروں طرف سے آپ کو یہ آواز سنائی دے گی کہ ؎

ہماری ذمہ داری

عرب کہ باز دہد محفلِ شبانہ کجا است ؟
عجم کہ زندہ کند رودِ عاشقانہ کجا است ؟
بزیرِ خرقۂ پیراں سبوچہ ہا خالی است ؟
فغاں کہ کس نہ شناسد مئے جوانہ کجا است ؟

اس کے بعد آپ خود سوچ لیجئے، برادرانِ عزیز! کہ اگر ہماری کسی کوتاہی یا کم ہمتی، سہو یا لغزش سے یہ آواز دب کر رہ گئی تو فطرت کی عدالت میں ہمارا یہ جرم کس قدر سنگین اور اس کی تعزیر کس قدر سخت ہو گی ــــ وہ ستم رسیدہ اور محروم تمنا انسانیت جسے ہم اس وقت پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ تمہاری مصیبتوں کا علاج اگر کہیں ہے تو اسی "قرآنی" مبنا سے فکر و تصور میں ہے، جب ہماری کوتاہی عمل سے اس کا رشتۂ امید منقطع ہو جائے گا تو وہ شاہراہِ زندگی پر ہمارا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے گی۔ اور ہمارا گریبان پکڑ کر پوچھے گی کہ

تھی اگر مے سے صراحی تیری خالی ساقی
تو چراغِ درِ میخانہ جلایا کیوں تھا؟
یوں اگر شورشِ ایام سے دب جانا تھا
کوچۂ عشق میں کیا کام تھا آیا کیوں تھا؟

سوچئے برادران! کہ اس وقت ہمارے پاس اپنی مدافعت کے لئے کیا جواب ہوگا؟ لہٰذا جسے اس پیغام رسانی کے فریضہ میں شریک ہونا ہے اسے سمجھ سوچ کر قدم اٹھانا چاہیئے کہ اس کی ناکامی کی زد بہت دور تک پہنچے گی۔ نیز اسے یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ (جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے) قرآنی نظام کی طرف دعوت دینے والوں کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ اس دعوت کو دوسروں تک پہنچانے سے پہلے اپنے اندر تطہیرِ فکر اور تعمیرِ سیرت پیدا کریں۔ جب تک خود ہماری فکر میں یہ تبدیلی پیدا نہیں ہو جاتی اور اسکی شہادت ہمارا کردار نہیں بہم پہنچا دیتا، ہم اس کے اہل ہی نہیں بن سکتے کہ دوسروں کو اس انقلاب کی طرف دعوت دیں۔ میں نے سالِ گذشتہ بھی کہا تھا اور اسے پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ انقلابِ قرآنی کا مرحلہ بڑا صبر آزما اور ہمت طلب ہوتا ہے۔ یہ صرف فکر و نظر کی پاکیزگی اور سیرت و کردار کی پختگی کے سہارے کٹتا ہے۔ اس میں نہ نمائش کے مواقع ہوتے ہیں، نہ نمود کی گنجائش۔ نہ ذاتی صلہ کی امید ہوتی ہے نہ ستائش کی توقع۔ اس میں نہ عام پارٹیوں کی طرح عہدوں کی مسندیں ہوتی ہیں نہ مناصب کی لذتیں۔ بزمِ طلوعِ اسلام کسی پارٹی کا نام ہی نہیں۔ یہ بزمیں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا منظم ذریعہ ہیں اور بس۔ اسی قرآنی فکر کی محسوس و مشہود شکل کا نام قرآنی نظامِ ربوبیت ہے۔ آپ جتنی جلدی اس فکر کو عام کر دیں گے اتنی ہی جلدی یہ نظام متشکل ہو جائے گا۔ یوں تو عام حالات میں بھی کون نہیں چاہتا کہ یہ نظام جتنی جلدی ہو سکے وجہِ شادابیٔ کائنات بن جائے۔ ہم میں سے کون ہے جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر باچشمِ نم یہ دعائیں نہیں مانگتا کہ

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

کمیونزم کا سیلاب

لیکن ملک کے حالات جس تیزی سے بگڑ رہے ہیں، اس کے پیشِ نظر اس نظام کے قیام کے لئے ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں ہونی چاہیئے۔ ملک، بھوک اور افلاس کے عذاب میں ایک مدت سے مبتلا چلا آ رہا ہے لیکن اب گرانی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ جنہیں پہلے روٹی مل جاتی تھی، وہ بھی پریشان ہیں کہ اس نہج سے گذارہ کیسے چلے گا۔ یہی ہیں وہ حالات جو کمیونزم کو بڑھ بڑھ کر آوازیں دیا کرتے ہیں۔ اس سیلابِ بلا کو صرف نظامِ ربوبیت روک سکتا ہے۔ اس وقت تک پاکستان کے مسلمان صرف اتنا سننے کے لئے تیار ہیں کہ اگر کوئی نظام ان کی روٹی کے

مسئلہ کو حل کر دے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کا دین بھی محفوظ ہے تو وہ نظام کمیونزم کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ لیکن اگر ایک دفعہ کمیونزم کا نظام چھا گیا تو مجھے خطرہ ہے کہ پھر مسلمان اس قسم کی کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ پھر وہ (سنٹرل ایشیا کی مسلمان ریاستوں کی طرح) زیادہ سے زیادہ یہ مطالبہ کرے گا کہ اسے نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جائے اور قرآن کی تلاوت سے روکا نہ جائے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس وقت ہم تاریخ کے کس نازک دوراہے پر کھڑے ہیں اور زمانے کے تقاضے ہم سے پکار پکار کر کس چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ الحاد اور بے دینی کا جو آتشیں طوفان ہماری طرف امنڈے چلا آرہا ہے، افسوس ہے کہ ہمارے ارباب شریعت کو اس کا قطعاً احساس نہیں۔ وہ خود بھی شیعہ، سُنی۔ مقلد، غیر مقلد۔ دیوبندی، بریلوی۔ اہل حدیث، اہل قرآن کے جھگڑوں میں الجھے ہوتے ہیں اور اُمت کو بھی اسی میں الجھائے رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ انہی مسائل کے حل میں جہادِ عظیم سمجھتے ہیں کہ

ابنِ مریم مرگیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جُدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

وہ الٰہیات و معتقدات کے ان ترشے ہوئے لات و منات کے طواف میں مصروف ہیں اور خدا فراموشی کی ابلیسی قوتیں اپنے کارندوں کو تاکید پر تاکید کئے جا رہی ہیں کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

تاکہ ——— ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں ——— دوسری طرف اہل سیاست ہیں۔ ان کے متعلق اس سے زیادہ (اور بہتر) اور کیا کہا جا سکتا ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ـ جَهَنَّمَ .... (۱۴/۲۸) کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنھوں نے خدا کی نعمت کی ناسپاس گذاری کی اور اپنی قوم کو تباہی

کے گھر میں جا اتارا، یعنی جہنم میں۔ یہ ہمارے میر کارواں، قوم کو جہنم کے عمیق گڑھے میں دھکیل کر خود آتشِ رقص میں مصروف ہیں۔ انھیں اس سے کیا غرض کہ یہاں کفر کا غلبہ ہوتا ہے یا اسلام کا۔ ان کی حالت تو یہ ہے کہ

بادہ نرسیدی خدا چہ می جوئی!

ان حالات میں، برادران! سوچیے کہ آپ کی ذمہ داریاں کس قدر شدید اور عظیم ہو جاتی ہیں۔

اس مقام پر مجھے ایک الجھن کا ذکر کرنا ہے جو اکثر احباب کے دل کو طلسم پیچ و تاب بنائے رکھتی ہے اور جس کے متعلق وہ اکثر و بیشتر مجھ سے دریافت کرتے رہتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ملک کی دوسری تحریکیں بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں اور ہماری تحریک کی رفتار بڑی سست ہے۔ یہ درست ہے لیکن اس ضمن میں یہ حضرات اُس بنیادی فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو عام تحریکوں میں اور دعوتِ انقلاب میں ہوتا ہے۔

ایک بنیادی فرق

دنیا میں جو شخص ان عقاید و نظریات کی تائید کے لئے اُٹھتا ہے جو لوگوں میں رائج ہوتے ہیں (بغیر یہ تحقیق کئے کہ وہ صحیح ہیں یا غلط) اس کے لئے زندگی کی راہیں بڑی آسانیوں اور خوش خرامیوں کی راہیں ہوتی ہیں۔ ہر وادی کہکشاں بار اور ہر گوشہ زعفران زار۔ وہ جب پہلے دن اپنی آواز بلند کرتا ہے تو لاکھوں کروڑوں انسانوں کو اپنا ہم نوا پاتا ہے۔ وہ، جب اور جہاں، اپنے سامعین سے خطاب کرتا ہے تو ان میں سے ہر شخص

یہ سمجھتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

وہ جب ان متوارث رسوم و مسالک کی تائید میں (بزعم خویش) دلائل پیش کرتا ہے ــــ اور دنیا میں کون سا عقیدہ اور تصور ایسا ہے جس کے حق میں عقلِ حیلہ جُو دلائل نہیں تراش سکتی ــــ تو عوام کا گروہ عظیم اُسے اپنے عہد کا سب سے بڑا مفکر قرار دیتا ہے۔ وہ جس طرف سے گزرے ہزاروں انسان اس کے پیچھے چلتے ہیں۔ اس طرح وہ ان کا مسلمہ لیڈر بن جاتا ہے۔ عقیدت منداس کے لئے دیدہ و دل فرشِ راہ کرتے اور اس کے حضور سرِ نیاز خم کرتے ہیں۔ ہر طرف سے اس پر پھولوں کی بارشیں ہوتی ہیں۔ ہر سمت سے "زندہ باد" کے فلک بوس نعروں سے استقبال کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے دنیا بھر کے سامانِ راحت و

آسائش مہیا کئے جاتے ہیں۔ متبعین اس کے جلو میں اور خدام اس کی بارگاہ میں دست بستہ ایستادہ رہتے ہیں۔ اس کے سب کام بلا مزد و معاوضہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر معتقد اس کی خدمت کو موجب ہزار ثواب و سعادت سمجھتا ہے۔ وہ جس شخص یا گروہ کو اپنا حریف خیال کرتا ہے اسے کچلنے کے لئے اسے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرنا پڑتا کہ وہ عوام کو یہ کہہ کر مشتعل کر دے کہ یہ فتنہ پرداز تمہیں تمہارے اسلاف کے راستے سے برگشتہ کرنا اور اس طرح ایک نئے دین کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کی مخالفت "جہاد فی سبیل اللہ" کا درجہ رکھتی ہے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لئے دولت کے ڈھیر اس کے قدموں میں لگ جاتے ہیں اور رضا کاروں کی جماعتیں اس کے اشارہ پر جان تک دینے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ جو شخص عوام کے معتقدات اور نظریات کی تائید کے لئے اٹھتا ہے، عزت، آسائش، دولت، قوت، امارت کی فتوحات اس کے حصے میں آتی ہیں اور اس کی تحریک جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہے۔

اس کے برعکس اس تحریک پر غور کیجئے جو عوام کی رَو میں بہنے کی بجائے زمانے کے دھارے کا رُخ صحیح سمت کی طرف موڑنے کے لئے اٹھتی ہے۔ وہ مروجہ عقاید اور موروثی نظریات میں سے ایک ایک کو لیتی ہے اور انہیں ایک غیر متبدل معیار پر پرکھ کر حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دیتی ہے۔ اس تحریک کا داعی جب عوام کے کسی غلط عقیدہ یا مسلک کے خلاف لب کشائی کرتا ہے تو بھری محفل میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اس کا کوئی محرم اور کوئی ہم نوا نہیں ہوتا۔ اسے کوئی ایک ساتھی بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اس کی تائید کے لئے اس کے ساتھ کھڑا ہو جائے۔ وہ اپنے پیغام کو لے کر کو بہ کو، دہ بدہ، قریہ بہ قریہ پھرتا اور ہر ایک سے کہتا ہے کہ

بیا ور ید گر ایں جا بود سخندانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

لیکن کوئی اس کی آواز پر کان نہیں دھرتا۔ وہ تھک کر بیٹھ جاتا ہے اور ایک گہری سوچ میں ڈوب کر اپنے آپ سے کہتا ہے۔

کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

لیکن اس کے پیغام کی صداقت اور اس صداقت پر اس کا یقین اُسے آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا۔

وہ پھر اُٹھتا ہے اور باندازِ دگر اپنا پیغام لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ کچھ لوگ اس کے قریب آتے ہیں اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ لیکن وہ یہ جانتے ہوئے کہ یونہی سطحی طور پر کسی انقلابی دعوت کی تائید کرنے والے اپنے آپ کو اور خود اس دعوت کو کس قدر نقصان پہنچاتے ہیں، ان سے کھُلے الفاظ میں کہتا ہے کہ

زمرغانِ چمن نا آشنا یم
بشاخ آشیاں تنہا سرا یم
اگر نازکت دلی از من کراں گیر
کہ خونم می تراود از ندایم

وہ اپنے پیغام کو اسی طرح دُہرائے چلا جاتا ہے تا آنکہ وہ (پیغام) فضا میں اپنے نقوش مرتب کرنے شروع کر دیتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کو خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ جو اس کی اس انقلابی دعوت میں اپنی مفاد پرستیوں کی ہلاکت دیکھتے ہیں وہ اس کی مخالفت میں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ مخالفتوں کے اس ہجوم کے مقابلہ میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے اور اپنے اللہ سے دعا کرتا ہے کہ

با پرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغِ من بریز

یہ ہے وہ تحریک جسے لے کر آپ اُٹھے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ یہ اس قدر سخت کام کیوں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کو تو اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھنا چاہیئے کہ اس بے سروسامانی کے عالم میں اور اس تھوڑے سے وقت میں یہ تحریک ایسے خوشگوار نتائج کی حامل ہو گئی ہے ورنہ ایسی تحریکوں میں تو اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ اس کا داعی تنہا آتا ہے، تنہا رہتا ہے اور یہ کہہ کر تنہا یہاں سے چلا جاتا ہے کہ

چو رختِ خویش بر بستم ازیں خاک
ہمہ گویند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود

یعنی یوں تو اس کے گرد جاننے پہچاننے والوں کا ایک جمگھٹا رہتا ہے لیکن ان میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اسکا پیغام کیا ہے۔

یہ ہیں وہ لوگ جن کے متعلق جرمن شاعر (RILKE) نے کہا ہے کہ

EACH TORPID TURN OF THE WORLD
HAS SUCH DISINHERITED CHILDREN,
TO WHOM NO LONGER WHAT'S BEEN, AND
NOT YET WHAT IS COMING BELONG.

یعنی جب دنیا جمود و تعطل کے بعد ایک نیا موڑ مڑنے لگتی ہے، تو وہاں کچھ ایسے "محروم الارث یتیم" نظر آتے ہیں جو حاضر و موجود کو از خود تیاگ دیتے ہیں اور جو کچھ اس کی جگہ متشکل ہونے والا ہوتا ہے وہ ہنوز ضمیر کائنات میں پہلو بدل رہا ہوتا ہے اور اس کے آب و تاب سے موزوں ہونے میں ابھی وقت ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اس سے بھی بہرہ یاب نہیں ہو سکتے۔ لہذا وہ ماضی اور مستقبل دونوں کے ترکہ سے محروم رہتے ہیں۔ یہ حالت ہوتی ہے اس داعیِ انقلاب کی جس کے نزدیک مروّج و موجود غلط قرار پائے اور اس کی جگہ جن اقدار کے متمکن ہونے کے لئے وہ صرفِ جدوجہد رہے وہ اس کی زندگی میں وجود پذیر نہ ہوں۔ وہ دنیا میں تنہا آتا ہے اور تخمِ انقلاب کی آبیاری کر کے تنہا دنیا سے چلا جاتا ہے کہ بعد میں آنے والے اس کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوں۔ اسے اس کا افسوس نہیں ہوتا کہ اس نے اپنی جانفشانیوں کے نتائج اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھے۔ اب آپ نے سمجھا برادران! کہ آپ کی تحریک سست گام کیوں ہے؟

بزمِ طلوعِ اسلام

اب میں برادران! چند الفاظ آپ کی اس تنظیمی کوشش یا تحریک کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں جسے بزمِ طلوعِ اسلام کہتے ہیں اور جس کا دوسرا سالانہ اجتماع اس وقت منعقد ہو رہا ہے۔ میں اس قرآنی فکر کو جو مجلہ طلوعِ اسلام اور اس کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کے ذریعے آپ تک پہنچ رہی ہے، ایک عرصہ دراز تک انفرادی طور پر پھیلاتے چلا جا رہا تھا۔ جو احباب اس فکر سے متفق تھے وہ بھی اپنی اپنی جگہ انفرادی طور پر اس کی مزید نشر و اشاعت کی کوشش کرتے تھے۔ چند سال اُدھر کا ذکر ہے کہ مردان کے احباب نے لکھا کہ ہم نے اپنے ہاں طلوعِ اسلام کی ایک

بزم بناتی ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ اس قرآنی فکر کو باہمی افہام و تفہیم سے اچھی طرح سمجھا جائے اور پھر اس کی نشر و اشاعت کی اجتماعی کوشش کی جاتی ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ یہ خیال نیک ہے اور یہ ارادہ مبارک، لیکن اس کی سخت احتیاط برتئے کہ آپ کی یہ اجتماعی کوشش کہیں پارٹی کا رنگ نہ اختیار کر جائے۔ اس لئے کہ اگر ایسا ہو گیا تو ہم اس اصل و بنیاد ہی کے خلاف چلے جائیں گے جس پر قرآنی فکر و نظام کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس طرح برادران! پہلی بزم طلوعِ اسلام وجود میں آئی۔ اس کے بعد بعض دیگر مقامات کے احباب نے بھی (از خود) اسی قسم کی بزمیں قائم کر لیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ بزمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں تھیں کہ جو مقامی احباب اس فکر سے متفق تھے وہ مل بیٹھ کر تبادلۂ خیالات کرتے اور اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کی تجاویز سوچتے۔ ان بزموں کے نہ کوئی قواعد و ضوابط تھے نہ دساتیر و منشور۔ نہ رسمی کارروائیاں تھیں نہ آئینی حدود بندیاں۔ چند دوستوں کی نجی نشستیں تھیں جن میں قرآنی نظام کی حقیقتِ منتظر کو لباسِ مجاز میں دیکھنے کی تڑپ اور خلش کے پُرخلوص مظاہرے ہوتے تھے۔ جب بزموں کا یہ سلسلہ زیادہ پھیل گیا تو (سالِ گزشتہ) لاہور کے احباب نے یہ تجویز کیا کہ بزموں کے احباب کا باہمی تعارف ہونا چاہیئے تاکہ اس ربط و ضبط سے کام آگے بڑھایا جا سکے۔ اس طرح طلوعِ اسلام کی پہلی کنونشن کا انعقاد ہوا۔ جو احباب اس میں شریک ہوئے تھے وہ اس کے شاہد ہیں کہ یہ اجتماع اپنے انداز کا بالکل نرالا اور اپنے رنگ کا بیکر انوکھا اجتماع تھا۔ یوں نظر آتا تھا جیسے ایک خاندان کے افراد اپنے گھر میں بیٹھے محبت اور پیار کی باتیں کر رہے ہیں اور گھر کی بہبود اور خوشحالی کی تجاویز سوچ رہے ہوں۔ اس اجتماع کی سادگی میں ایک عجیب انداز کا حسن اور اس کے حسن میں ایک خاص وضع کی پاکیزگی تھی۔ یہ سب کچھ تھا لیکن مجھے رہ رہ کر یہ خدشہ (یا اس خدشہ کا وہم) ستا رہا تھا کہ خدا نہ کرے اس میں پارٹی بازی کا کوئی شائبہ آ جائے۔ میرے بعض دوست مجھ سے کہا کرتے ہیں کہ تم اس باب میں بہت زیادہ وہمی واقع ہوئے ہو۔ میں اس کے جواب میں اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ

کے تو انم دید زاہد جام صہبا بشکند
می پرد رنگم حبابے گر بدریا بشکند

یہی وہ (حقیقی یا وہمی) خدشہ تھا جس کے پیشِ نظر آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے سالِ گذشتہ کے خطاب میں اس بات پر کس قدر زور دیا تھا کہ اس تنظیمی کوشش میں پارٹی بازی کا رنگ نہ آنے پائے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کنونشن کی کامیابی نے اس فکر و نظام کے مخالفین کو بہت زیادہ متردد و بیچین کر دیا اور انہوں نے اس کی تخریب کے لئے ایک نیا پروگرام تجویز کیا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب اہل کتاب کی تمام کوششیں اسلام کی انقلابی تحریک

زیر نقاب مخالفت

کو نقصان پہنچانے میں ناکام رہ گئیں تو انہوں نے اپنا پینترا بدلا اور اس کی مخالفت کے لئے ایک نیا حربہ اختیار کیا۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۳/۷۲) تم یوں کرو کہ صبح کے وقت ان مسلمانوں سے کہو کہ ہم بھی ایمان لاتے ہیں۔ دن بھر ان میں مسلمان بن کر رہو۔ اس طرح ان کے اندر داخل ہو کر، ناصح مشفق کے لباس میں، ان سے ایسی باتیں کرو جن سے ان کے دلوں میں شکوک و شبہات اور ان کی تنظیم میں تشتت وانتشار پیدا ہو جائے۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جب تم شام کو کفر کی طرف لوٹو تو تمہارے ساتھ ان میں سے دس بیس ادھر آجائیں۔ یہ تھے وہ لوگ جن کی اس سازش سے بچنے کے لئے قرآن کریم کی آخری دو سورتوں میں اس قدر تاکید آئی ہے۔ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ۔ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ۔ (۱۱۴/۴-۶) ان میں تمہارے جانے پہچانے لوگ بھی ہوتے ہیں، اور اجنبی بھی۔ وہ تمہاری جماعت میں داخل ہو جاتے ہیں شکاریوں کی طرح دبے

وسوسہ انگیزی

پاؤں آکر، چپکے چپکے کانوں میں کچھ پھونک دیتے، اور چوروں کی طرح پچھلے پاؤں لوٹ جاتے ہیں۔ وہ ان وسوسہ انگیزیوں سے تمہارے عزائم کو کمزور کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (۱۱۳/۴) اور اُن کی تخریبی سازشوں کا جذبۂ محرکہ حسد ہوتا ہے۔ وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (۱۱۳/۵)۔

یہی تھا وہ فیصلہ جو شرآنی فکر کے مخالفین نے سال گزشتہ کیا۔ چنانچہ سال کے دوران مختلف مقامات سے جو اطلاعات ہم تک پہنچتی رہیں وہ اس حقیقت کی صاف صاف غمازی کر رہی تھیں کہ یہ مخالفین، ناصحین مشفق اور ہمدردان غمخوار کے نقاب میں طلوع اسلام کی بزموں میں آگئے ہیں اور اپنی تخریبی کارروائیوں میں مصروف

سال گذشتہ میں مخالفت

ہیں۔ جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے ہمارے ہاں کوئی راز نہیں، کوئی پس پردہ اسکیم نہیں۔ ہم کمروں کے اندر اپنی نجی محفلوں میں بھی وہی کچھ کرتے ہیں جو عام پبلک میں پیش کرتے ہیں۔ یہ کچھ ہم زبانی نہیں کہتے بلکہ لکھ کر

شائع کر دیتے ہیں۔ ہمارا ایک ایک لفظ دوسروں کے پاس موجود ہے۔ اس لئے ہمیں اس سے قطعاً خطرہ نہیں کہ یہ لوگ ہماری محفلوں میں زیرِ نقاب آجاتے ہیں۔ یہ اس طرح آکر لینگے کیا؟ آپ کو اُس شخص کی کہانی تو یاد ہوگی جس کے ہاں رات کو چور گھس آیا۔ اس کی آنکھ کھل گئی تو اس نے لیٹے ہی لیٹے چور سے کہا کہ بھائی جب مجھے اس گھر میں دن کے وقت کچھ نہیں ملتا تمہیں رات کے وقت کیا ملے گا؟ اس لئے ہمیں اُن کی یہ دُزدانہ کاوشیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ جو چیز نقصان پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ طرح طرح کی وسوسہ انگیزیوں سے آپ کی جماعتی زندگی میں انتشار پیدا کرتے ہیں۔ آپ کو نظری مباحث کی موشگافیوں اور تجریدی مسائل کی نکتہ آفرینیوں میں الجھائے رکھتے ہیں تاکہ آپ کسی عملی پروگرام کی طرف توجہ ہی نہ دے سکیں۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ آپ کی یہ تنظیمی کوشش کسی نہ کسی طرح پارٹی کی شکل اختیار کر جائے۔ وہ بزموں کے اندر تو یہ کچھ کرتے ہیں اور باہر جا کر طلوعِ اسلام کے مسلک و مقصد اور فکر و تعلیم کے متعلق لوگوں سے اس قسم کی باتیں کہتے ہیں جو طلوعِ اسلام کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔ لوگ یہ سمجھ کر کہ یہ بزمِ طلوعِ اسلام کے ممبر ہیں اس لئے "رازِ درونِ خانہ" سے واقف ہیں اُن خرافات کو سچا سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ہے وہ سب سے بڑا نقصان جو قرآنی فکر و نظام کو ان لوگوں کی طرف سے پہنچایا جا رہا ہے۔

یہاں تک تو اُن مخالفین کا ذکر تھا جو بغرضِ تخریب طلوعِ اسلام کی بزموں میں شامل ہوتے ہیں لیکن

نادان دوست

اُن سے کہیں زیادہ نقصان کا باعث وہ نیک نیت لیکن سادہ لوح حضرات ثابت ہوتے ہیں جو ان زیرِ نقاب ناصحین کے دامِ تزویر کا شکار ہو کر نادانستہ اُن کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ اُن "دانا دشمنوں" کے متعلق تو آپ، تحقیقات کے بعد، یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس تنظیم میں شامل ہی تخریب کی غرض سے ہوتے تھے، لیکن ان "نادان دوستوں" کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟

ایک انقلابی دعوت کو (یعنی اس تحریک کو جس کا مقصد فکر و نظر میں انقلاب پیدا کرنا ہو) اپنے ابتدائی مراحل میں اس قسم کے خطرات کی طرف سے بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کا علاج تعوذ بتایا ہے۔ (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ۔ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ) اَلْعُوْذُ۔ اُونٹنیوں اور گھوڑیوں کے اُن نوزائیدہ بچوں کو کہتے ہیں جنھیں اپنی حفاظت کے لئے ہر وقت ماں کے قریب رہنا ہوتا ہے۔ عَاذَتْ بِوَلَدِھَا کے معنی ہیں نوزائیدہ بچے کے پاس کھڑے رہنا اور اسکی حفاظت

کرنا۔ اَلْمُعَوَّذُ اس چراگاہ کو کہتے ہیں جو گھر کے آس پاس ہو تاکہ اس میں جانور اور اس کے بچے ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہیں۔ لہٰذا تَعَوُّذُ کے معنی ہیں اپنے چشمۂ فکر اور مرکزِ نظام (قرآن) کے ساتھ اس طرح متمسک رہنا جس طرح نوزائیدہ بچے ماں کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ ایک نوزائیدہ تحریک کو خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے قرآن نے کیا طریق بتایا؟ یہ کہ اس تحریک سے مخلص افراد کو اپنے مرکزِ فکر و نظام سے زیادہ سے زیادہ قریب رہنا چاہیئے۔ ہر خطرہ کے وقت بھاگ کر اس کی پناہ میں آجانا چاہیئے۔ اور ہر پیشِ نظر معاملہ کو اس کی طرف (REFER) کر دینا چاہیئے۔ یہی ہے وہ طریقِ کار جس کی طرف سورۂ نساء میں ان الفاظ میں توجہ دلائی گئی ہے کہ وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ..... (۴/۸۳)

علاج

جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو یہ اسے یونہی لے اڑتے ہیں۔ اگر یہ (اس کی بجائے) اس بات کو رسول کی طرف یا صاحبانِ اختیار کی طرف لوٹا دیں، تو ان میں سے جو اس کی تحقیق کریں وہ حقیقت تک پہنچ جائیں۔ یعنی پیشِ نظر معاملات میں از خود فیصلہ کر کے ان پر عمل پیرا ہونے کے بجائے انہیں اپنے مرکز اور اربابِ اختیار کی طرف لوٹا دینا چاہیئے۔

اس ضرورت اور احتیاط کی اہمیت کے پیشِ نظر برادران! میں نے اب مناسب سمجھا ہے کہ بزموں کے نظم و نسق اور باہمی ربط و ضبط کے متعلق کچھ ہدایات منضبط کر دی جائیں تاکہ ان سے مخلص رفقائے سفر کو راہنمائی مل سکے۔ یہی ہدایات سرِدست آپ کے لئے دستور و آئین کا کام دیں گی۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ ان ہدایات کو بغور دیکھ لیں۔ جو حضرات ان سے متفق ہوں وہ اپنے آپ کو بزمِ طلوعِ اسلام سے منسلک رکھیں۔ جو یہ سمجھیں کہ اس سے ان کا دائرۂ فکر و عمل تنگ ہو جائے گا، وہ اپنی تگ و تاز کے لئے دوسرے میدان تجویز کر لیں۔ قرآنی فکر و عمل، طلوعِ اسلام کی اجارہ داری نہیں۔ جن کے دل میں اس کی لگن ہو وہ جولانگہ عمل اور طریقِ کار اپنے لئے مناسب سمجھیں اختیار کر سکتے ہیں لیکن (آپ مجھ سے متفق ہوں گے) کہ یہ ضروری ہے کہ جب تک کوئی شخص بزمِ طلوعِ اسلام سے وابستہ رہے اس کے لئے طلوعِ اسلام کی طرف سے نافذ کردہ ہدایات کی پابندی لازمی ہوگی۔ یہ صورت تو کسی کے نزدیک بھی قابلِ قبول قرار نہیں پا سکتی کہ آپ ممبر تو ہوں بزمِ طلوعِ اسلام کے اور اپنے فکر و عمل میں

طلوعِ اسلام کے مسلک و مقصد اور ہدایات و ضوابط کے خلاف چلیں۔

برادرانِ گرامی قدر! میں نے آپ سے جو کچھ عرض کرنا تھا کر چکا۔ میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے میری گزارشات کو پورے جذب و انہماک سے سُنا، آخر میں میں اس حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ مبداء فیض کی انتہائی کرم گستری ہے کہ اس نے مجھے آپ جیسے مخلص احباب کی رفاقت سے نوازا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سفرِ حیات میں کسی رفیق غمخوار و دمساز کا مل جانا، راستے کی مشکلات کو آسانیوں میں بدل کر منزل کو قریب سے قریب تر لے آتا ہے۔ آپ احباب کی رفاقت نے میری عمر رفتہ کو آواز دے کر میری آرزوں کو جوان، میری ہمتوں کو بلند، میرے ارادوں کو مستحکم، میرے جینے کو پُر بہار اور میرے مرنے کو پُرکیف بنا دیا ہے — کرم کردی الہٰی زندہ باشی! — چہ عجب کہ اس سے میرے وہ تصورات جنھیں اس سے پہلے زندگی کے حسین خواب اور نور و نکہت کی داستانِ خوش" سے زیادہ نہیں سمجھا کرتا؟ ایک جیتے جاگتے جہانِ نو کے حسین پیکر میں وجہ شادابی قلب و نظر بن جائیں۔ یہی وہ جہانِ نو ہے جس کی تلاش میں جنت سے نکلا ہوا آدم، صدیوں سے مارا مارا پھر رہا ہے اور کہیں پناہ نہیں پاتا۔ یہی وہ فردوس گم گشتہ ہے جو اس کی آرزوں کا منتہٰی، اس کی امیدوں کا ماویٰ و ملجا اور اس کی زندگی کا آخری سہارا ہے۔ یہی وہ جنتِ ارضی ہے جس کے دروازے پر چاند کی نورانی کرنوں سے لکھا ہوا ملتا ہے کہ

مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (۳/۹۶)

جو اس میں داخل ہو گیا، دنیا کے ہر خطرے سے محفوظ و مصئون ہو گیا۔

سوچئے برادرانِ عزیز! کہ اگر آپ کے ذوق و شوق، آپ کے سوز و گداز، آپ کے نالۂ نیم شبی، آپ کی آہِ سحرگاہی، آپ کی تگ و تاز، آپ کی سعی و عمل سے، انسان کے سامنے اس جنت کے دروازے کھل جائیں اور فضا اس زمزمۂ تبریک و تہنیت سے گونج اٹھے کہ

برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد
ایں مشتِ غبارے را انجم بسجود آمد

تو اس سے بڑی طالع کی بیداری اور نصیبہ کی یاوری اور کیا ہو گی؟ لے کاروانِ جذب و مستی اور اے رہروانِ منزلِ شوق! آگے بڑھیئے کہ دنیا یہ کہتی ہوئی آپ کے انتظار میں کھڑی ہے کہ

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

خدا کی نصرت اور اُس کی کائناتی قوتوں کی تائید آپ کے ساتھ ہو۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ (۳۲-۳۰/۴۱)

والسلام

پرویز

سمرۂ شب

عشاء کی نماز کے بعد درسِ قرآن کریم کی محفلِ شبانہ کا انعقاد ہوا۔ بہت سے عنوانات سامنے تھے۔ لیکن سامعین کا اصرار تھا کہ ان میں سے "من و یزداں" کے عنوان پر گفتگو کی جائے۔ عنوان الا اور غیر مانوس سا تھا لیکن اس کی اہمیت اس وقت نمایاں ہوئی جب پرویز صاحب نے قرآن کی روشنی میں سائل پُر پیچ و خم کے عقدے کھولنے شروع کئے۔ یہ سوالات ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں کہ خدا کیا ہے؟ وہ کیسا ہے؟ اسکا ماننا کیوں ضروری ہے؟ ماننے سے کیا ملتا ہے اور نہ ماننے سے کیا بگڑتا ہے؟ میرا اور خدا کا تعلق کیا ہے؟ یہ سوالات انسان کے دل میں اس وقت سے پیدا ہونے شروع ہوئے جب اسکے شعور نے آنکھ کھولی اور ان کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ فلسفہ بالخصوص الٰہیات نے ان کے جوابات پیش کرنے کی کوششیں کیں لیکن اس کے بعد خود ہی اس کا بھی اعتراف کرنا پڑا کہ یہ جوابات انسانی خلش اور کاوش کے لئے سامانِ تسکین فراہم نہیں کر سکتے۔ اربابِ مذاہب نے بھی ان کے متعلق بہت کچھ کہا اور سنا لیکن وہ بھی انسان کے قلبِ مضطرب کے لئے وجہ شکیبائی نہ ہو سکا اور بات وہی ثابت ہوئی جس کی طرف غالبؔ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

تا آنکہ قرآن آیا اور اس نے ان اہم اور مشکل ترین عقدوں کو اس انداز سے حل کیا کہ اس سے انسان کا ذہن اور قلب

دونوں (علیٰ وجہ البصیرت) مطمئن ہو گئے۔ درسِ قرآن کی اس محفل میں قرآن کے انہی حقائق کو سامنے لایا گیا تھا (جیسا کہ پرویز صاحب کا انداز ہے) وہ علوم جدیدہ کے ائمہ فکر و نظر کے خیالات اور انکشافات کو قرآنی حقائق کے سامنے لاکر اس حقیقت کو بے نقاب کرتے چلے جاتے تھے کہ قرآن کس طرح فکرِ انسانی کی امامت کرتا ہے۔ اس محفل میں پہلی مرتبہ یہ بات سمجھ میں آئی کہ اللہ پر ایمان کے معنی کیا ہیں اور خدا کا اور ہمارا تعلق کیا ہے۔ نیز یہ کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ وہی لوگ ہدایت کے راستہ پر سمجھے جائیں گے جو خدا پر اس طرح ایمان لائیں گے جسطرح قرآن نے کہا ہے تو اس دعویٰ سے مطلب کیا ہے اور وہ کسطرح صداقت پر مبنی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ خدا کا جو تصور قرآن نے پیش کیا ہے وہی حقیقت پر مبنی اور بےمثل و بےنظیر ہے۔ اس کے علاوہ کوئی تصور حقیقت پر مبنی نہیں ہو سکتا۔

یہ موضوع (بظاہر) فلسفیانہ اور خشک سا نظر آتا تھا لیکن وہ جو کہا گیا ہے کہ

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

قرآن کے حقائق جب پرویز کی زبان سے بیان ہوں تو نہ کوئی موضوع فلسفیانہ طور پر ادق رہ جاتا ہے اور نہ ہی منطقیانہ انداز پر خشک۔ سب سے زیادہ مسرت انگیز بات یہ تھی کہ سامعین میں اکثریت ان کی تھی جو دور افتادہ دیہات کے رہنے والے تھے اور (بظاہر) کم تعلیم یافتہ تھے لیکن جس جذب و انہماک سے انہوں نے ان حقائق کو سنا اور سمجھا اس سے اندازہ ہوا کہ طلوعِ اسلام نے کتنا ذہنی انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

یہ حقیقت کشا اور فکر پرور محفلِ قرآنی گیارہ بجے شب کے قریب ختم ہوئی بلکہ یوں کہیے کہ ختم کر دی گئی کیونکہ سامعین میں سے کسی کا بھی اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

ہفتہ۔ سہ پہر عصر کی نماز کے بعد ایک نہایت دلچسپ اور منفعت بخش محفل کا انعقاد ہوا۔ سامعین سے کہا گیا کہ قرآنی فکر اور تعلیم کے متعلق جس قدر اہم اور مشکل سوالات ان کے ذہن میں ہوں، وہ ان کی بابت محترم پرویز صاحب سے دریافت کر لیں۔ اس پر مختلف گوشوں سے استفسارات پھولوں کی طرح برسنے لگے۔ یہ استفسارات اسقدر متنوع عنوانات پر مشتمل تھے کہ ان کا احاطہ مشکل ہے۔ زندگی سے پہلے اور موت کے بعد کے مابعد الطبیعاتی امور سے لے کر نکاح اور طلاق کی جزئیات تک سب اس دائرے کے اندر آ رہے تھے۔ چونکہ سوالات جیسے آتے تھے ویسے ہی ان کا جواب دیا جاتا تھا اس لئے ایک سوال کے بعد دوسرے سوال کے سامنے آنے سے سامعین کے ذہن کی وہ حالت ہو جاتی تھی جو حالت ایک تیز رفتار موٹر کار میں پہاڑی راستے پر

سفر کرنے سے ہوتی ہے۔ یعنی قدم قدم پر ایک نیا موڑ مڑنا پڑتا ہے جس سے ذہن کی چولیں ہل جاتی ہیں۔ سامعین کے ذہن کی تو یہ حالت تھی لیکن جناب مجیب پر ان موڑوں کا کسی قسم کا اثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ نہایت سکونِ اطمینان اور حسبِ معمول شگفتگی و شادابی سے تمام سوالات کا جواب دیئے چلے جاتے تھے۔ اس محفل میں معلوم ہوا کہ اس بندۂ خدا کو قرآن پر کس قدر عبور حاصل ہے اور اس نے کس دقتِ نظر سے اسکے حقائق پر غور و فکر کیا ہے۔ پرویز صاحب کو نہ کسی سوال کے جواب میں کسی قسم کا تردد یا تامل ہوا۔ اور نہ ہی کسی جواب پر مستفسر نے عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ ہر جواب کے ساتھ پرویز صاحب کی یہ تصریح بھی خاص اہمیت رکھتی تھی کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اسی پر اکتفا کر کے نہ بیٹھ جایئے بلکہ قرآن کریم پر خود بھی غور کیجئے کہ جو کچھ میں اپنی بصیرت سے کہتا ہوں وہ

چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

نمازِ مغرب کی اذان سے نیساں طلبی اور گہر براری کا یہ سلسلۂ درخشاں اختتام پذیر ہوا۔

———— (۰) ————

ہفتہ شب ہفتہ کے روز مطلع ابر آلود تھا۔ مغرب کے بعد ترشح شروع ہوا۔ مہمانوں کی قیام گاہ، طعام گاہ، جلسہ گاہ سب شامیانوں کے نیچے تھیں۔ جوں جوں ترشح زیادہ ہوتا جاتا تھا خطرہ بڑھتا جاتا تھا کہ اگر بارش زیادہ ہو گئی تو تمام انتظامات درہم برہم ہو جائیں گے۔ لیکن

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام

قوانینِ فطرت انسانی جذبات سے متاثر نہیں ہوتے، نہ کسی کی خاطر اپنا پروگرام بدلتے ہیں۔ ترشح کا یہ سلسلہ بدستور جاری رہا تا آنکہ بعد نمازِ عشاء درسِ قرآن کی دوسری محفل کا وقت آگیا۔ اسی بارش میں مشتاقانِ معارفِ قرآن کا ہجوم جلسہ گاہ میں پہنچ گیا۔ اصرار ہوا کہ محترم پرویز صاحب نے جو لغت مرتب کیا ہے اور جس کا چرچا اتنے دنوں سے سنتے آرہے ہیں اس سے چند الفاظ سامنے لائے جائیں تاکہ اس کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے۔ پرویز صاحب نے پہلے مختصر طور پر عربی زبان کی تاریخ بیان کی پھر اس کی نمایاں خصوصیات سامنے لائے پھر یہ بتایا کہ قرآن کریم نے الفاظ کے انتخاب میں کس اعجاز سے کام لیا ہے۔ اس کے بعد بنیادی مادوں سے الفاظ کے معانی متعین کرنے کے اصول پر روشنی ڈالی اور اسے دو تین مثالوں سے واضح کیا۔ اس تمہیدی وضاحت کے بعد وہ اصل موضوع پر آئے اور سورۂ فاتحہ کے مفردات کے معانی متعین کرنے کے سلسلہ کی ابتداء کی۔ اس میں سب سے پہلا لفظ حمد ہے۔ انھوں نے حمد کے عنوان سے لغت کا متعلقہ حصہ سنانا شروع کیا۔

لغت اور اس کا مطالعہ جس قدر خشک اور تھکا دینے والا موضوع ہوتا ہے، اربابِ معنی سے پوشیدہ نہیں۔ ایسا حار و یابس موضوع اور ایک ایسے مجمع میں جسے کسی لحاظ سے بھی خاص علمی اور تحقیقاتی نہیں کہا جا سکتا تھا، ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ چند لمحات کے بعد سامعین اُکتا گئے ہوں گے لیکن آپ یہ سنکر حیران ہونگے کہ یہ سلسلہ اس قدر جاذب تھا کہ شامیانہ جگہ جگہ سے ٹپک رہا تھا لیکن کوئی شخص اپنی جگہ سے سرک تک نہیں رہا تھا اور عالم یہ تھا کہ

مژہ برہم مزن تا نہ شکنی رنگِ تماشا را

بارش بڑھتی گئی اور شامیانے سے پانی دھاروں کی شکل میں نیچے آنا شروع ہو گیا۔ راولپنڈی کی سردی، رات کا وقت، مسلسل پانی، لیکن کیا مجال جو مجمع میں ذرا سا اضطراب بھی دکھائی دیا ہو۔ جب بارش زیادہ بڑھ گئی تو پرویز صاحب نے کہا کہ اب مجبوری انتہا تک پہنچ گئی ہے اس لئے اس محفل کو ختم کر دینا چاہیئے لیکن سامعین کا شوق بعید اس پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ بالآخر۔۔ اس اندیشہ سے کہ سردی اور بارش کہیں زیادہ مضر اثرات نہ پیدا کر دے، مجبوراً اس نشست کو ختم کرنا پڑا۔ اس مختصر سے تعارف سے اندازہ ہوا کہ یہ مرتب شدہ لغت کیا چیز ہے اور اس سے قرآن فہمی کے دروازے کس طرح کھل جائینگے۔ صاف نظر آتا تھا کہ اگر کسی شخص نے صرف لغت کو بامعانِ نظر دیکھ لیا تو اسے قرآن سمجھنے کے لئے کسی تفسیر کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

جلسہ برخاست ہوا تو ہر شخص کی زبان پر تھا کہ خدا کرے یہ بیش بہا نعمت جلد از جلد (طبع ہو کر) ہمارے سامنے آجائے۔[1]

(۰)

اتوار کی صبح

اتوار (۲۰ اکتوبر) کی صبح بھی بارش کا سلسلہ جاری تھا لیکن الوداعی نشست کیلئے تمام احباب صبح ہی سے مکان کے گوشوں اور کونوں میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ الوداعی نشست کا منظر بڑا اثر انگیز اور رقت آور ہوتا ہے۔ کنونشن کے پہلے دن، ہر آنکھ میں مسرت کی چمک دکھائی دیتی ہے لیکن آخری نشست میں وہی آنکھ نم آلود ہو جاتی ہے۔ یہ تاثر خود محترم پرویز صاحب کے الوداعی خطاب میں بھی اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔ دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ وہ بڑے ضبط سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اکثر مقامات پر ان کی یہ کوشش ناکام رہ جاتی ہے۔ وہ مقامات جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

---

[1] یہ لغات چار ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

دل کا خون آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج
نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو!

آخری خطاب میں اُنھوں نے سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات کی تشریح سے بتایا کہ ایک انقلابی تحریک کو (جس کی بنیاد تطہیرِ فکر و نظر ہو) اپنے ابتدائی مراحل میں کن حوادث سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کیلئے اس جماعت کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہ تفسیر کیا تھی، سورۃ کے الفاظ کی لغوی تشریح تھی جس سے مطالب خود بخود واضح ہوتے چلے جاتے تھے۔ اسی سلسلہ میں یہ نکتہ بھی سامنے آیا کہ امت میں اس وقت جس قدر فرقے پیدا ہو چکے ہیں، اُن کے مٹنے کی تدبیر کیا ہو سکتی ہے؟ یہ سوال وہ ہے جس کا احساس تو ہر ایک کو ہے لیکن اس کا حل کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ پرویز صاحب نے اس کا جو حل قرآن کریم سے بیان کیا وہ ہر صاحبِ بصیرت کے لئے دیدہ کشا تھا۔ (انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس موضوع پر تفصیلی طور پر طلوعِ اسلام میں لکھیں گے) جس چیز پر انہوں نے سب سے زیادہ زور دیا، وہ یہی تھی کہ طلوعِ اسلام کی فکر سے متمسک احباب کہیں خود ہی ایک فرقہ نہ بن جائیں۔ اس کے لئے انھوں نے نہایت مؤثر انداز میں ضروری ہدایات دیں۔ انھوں نے ایک بار پھر اس اہم حقیقت پر زور دیا کہ جب تک افراد سب سے پہلے خود اپنے اندر فکر و کردار کی وہ تبدیلی پیدا نہیں کر لیتے جو قرآن کا منشا ہے انکی آواز کوئی توجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ انہوں نے بتایا کہ طلوعِ اسلام کی تحریک کوئی ہنگامی تحریک نہیں جسے محض جذبات کے زور پر آگے بڑھایا جائے۔ یہ علم و بصیرت پر مبنی ایک انقلابی تحریک ہے جس کا مقصود قرآنی معاشرہ (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کی تشکیل کے لئے فضا کو سازگار بنانا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ اور صحابہ کبارؓ کی مبارک زندگی سے ایسی درخشندہ مثالیں پیش کیں جو حوادثِ زمانہ کے بحرِ تلاطم میں روشنی کے بلند مینار کی طرح جگمگ جگمگ کرتے دکھائی دیتی ہیں۔

اثر و جذب اور کیف و سرور میں ڈوبی ہوئی یہ محفل قریب بارہ بجے تک قائم رہی۔ آخر میں جب پرویز صاحب نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے تو سامعین کے ضبط کردہ جذبات، بے اختیار آنسوؤں اور سسکیوں کی شکل میں امنڈ پڑے۔ کس قدر پُر کیف تھا یہ منظر جس میں حسین آرزوئیں اور مقدس تمنائیں، اس اثر و جذب کے ساتھ فضا کو معمور کر رہی تھیں۔

پیامِ فصلِ بہار

طلوعِ اسلام کی تیسری کنونشن

مُنعقدہ لاہور

۱۹ — تا — ۲۱ — اپریل — ۱۹۵۹ء

(روئیداد، ماخوذ از طلوعِ اسلام مئی ۱۹۵۹ء)

دہم بہ غمزدہ طائر پیامِ فصلِ بہار
تہِ نشیمنِ اُو سیم و یاسمیں ریزم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رُوئیداد

نومبر ۱۹۵۶ء میں طلوعِ اسلام کنونشن کے نام سے پہلی بار قرآنی فکر و بصیرت کے چراغ عزم و ہمت کی ایک منظم صورت لے کر رتن الامار ٹاؤن ۔لاہور میں) منظرِ عام پر جلوہ بار ہوئے ۔ یہ تھی بزمہائے طلوعِ اسلام کی اوّلین کنونشن ۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں دوسری بار یہ انوکھی انجمن راولپنڈی میں آراستہ ہوئی ۔ اپریل ۱۹۵۹ء میں تیسری کنونشن کا قرعۂ فال پھر لاہور ہی کے نام پڑا ـــــ اور اقبالؒ کا لاہور ایک بار پھر ان قرآنی مشعلوں کی نور پاشیوں سے جگمگا اٹھا ۔ موسمِ بہار، بہار آفرینیوں کے پورے جوبن سے انگڑائیاں لے رہا تھا ۔ فصلِ بہار انتہائی فیاضی سے حسنِ جمال کے خزانے لٹا رہی تھی ـــــ ہر چہار اطراف نور و نکہت کی رنگینیاں کیف برسا رہی تھیں اور موسمِ گل کی ان سحر طرازیوں میں کونسلیشن ہاؤس کے سبزہ زار ایک بار پھر ڈھائی برس قبل کی انجمن آرائیوں کی داستانِ دلنواز دہرا رہے تھے ۔ کنونشن کمیٹی کے حسنِ انتظام کی بدولت شالامار کے تاریخی چمنستان کے دامنِ پُر بہار میں خوبصورت شامیانوں کی قطاریں اُس قرآنی تحریک کے نشو و ارتقا اور شاندار مستقبل کی نشاندہی کر رہی تھیں جس نے صدیوں پہلے حضور رسالتمآبؐ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں انسانی زندگی کی تاریک شاہراہوں کو درخشندہ ستاروں کی گذرگاہوں میں بدلا تھا اور کارگہِ کائنات میں جنتِ ارضی کی بساط سی بچھ گئی تھی ۔

تاریخ آج تک اس حادثۂ عظیم کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئی کہ انسانی زندگی کی نامرادیوں اور حرماں نصیبیوں نے بہت جلد قرآنی نظام کے اس سرمایۂ بہار اور نورمبین کو کھو دیا اور پھر صدیاں گذر گئیں ـــــ یہ

فردوسِ گم گشتہ اس کی متاعِ حیات نہ بن سکا۔

کنونشن کی فضائے روح نواز کے ذرّے ذرّے میں صدیوں کے بعد پھر اُسی قرآنی نظام کو انسانیت کا مرکز و محور بنانے کا عزم کروٹیں لے رہا تھا اور اسی عزمِ صمیم کی مچلتی ہوئی آرزوئیں سینوں میں لئے بزمہائے طلوعِ اسلام کے مندوبین پاکستان کے اطراف و اکناف سے نجومِ سحر کی مانند کھچے چلے آ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ـــــ

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش

پنڈال کی وسعت و رفعت کے ساتھ اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں مختلف مقامات پر قرآنی آیات اور اس کی تعلیم و حکمت سے متعلق ملفوظات، قطعات کی شکل میں آویزاں تھے ـــــ نہایت جلی لیکن اس کے ساتھ تاج محل کی طرح حسنِ تناسب کے پیکر ـــــ شرکائے محفل کی نگاہیں بار بار ان قطعات کی طرف اٹھتیں اور اس خرمنِ گل و لالہ سے پُر دامن کاشانۂ چشم کی طرف واپس آتیں۔

میرِ کارواں ـــــ کراچی سے لاہور

لاہور کی اس کنونشن کا مایۂ امتیاز یہ تھا کہ اولین کنونشن کا ایک اہم ترین فیصلہ گذشتہ اپریل سے حاصل تکمیل کو پہنچ چکا تھا اور اپنی مجبوریوں کے باوجود میرِ کارواں نے کراچی سے لاہور میں نقلِ سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ میرِ کارواں ـــــ

جس مردِ خود آگاہ و خدامست کی صحبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز

اور اس طرح حکیم الامت علامہ اقبال رح کی رحلت سے اُس کے لاہور کی جو دل کشا انجمن اُجڑ چکی تھی بیس برس بعد بہ کمالِ شانِ زیبائی از سرِ نو آراستہ ہو چکی تھی۔ فکر و نظر اور فلسفہ و حکمت کے مخانوں میں

پھر یہ غوغا تھا کہ لا ساقی شرابِ خانہ ساز

خوشا وہ کاروانِ شوق جس کو یہ امیرِ کارواں نصیب ہوا ـــــ اور

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع : تخیلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

مجلسِ تعارفِ باہمی کنونشن ہاؤس میں مندوبین کی آمد کا سلسلہ ۱۸ اپریل کی صبح سے ہی شروع ہو گیا۔ سندھ اور وزیرستان تک کے نمائندے طویل اور صبر آزما سفر طے کر کے شام تک پہنچ گئے۔ اور بوقت شب نمازِ عشاء کے بعد جب تعارفِ باہمی کے سلسلے میں ان کی مجلسِ خصوصی کا انعقاد ہوا تو کم و بیش تمام مندوبین اطرافِ ملک سے آ چکے تھے۔ خون، رنگ اور نسل کی عصبیتوں سے پاک یہ مجلسِ شبینہ ناظم ادارہ طلوعِ اسلام .... کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ مجلس کیا تھی ع

اندھیری رات میں تھیں جھلملیں ستاروں کی

ہر ایک تعارف کے سلسلے میں باری باری پلیٹ فارم پر نمودار ہو رہا تھا۔ دور دراز کی بستیوں، قصبوں اور شہروں سے سمٹ سمٹا کر یہ ستارے اس خیابانِ آرزو میں جمع تھے۔ دلوں میں درخشندہ عزائم کی تابناکیاں اور روحوں میں تڑپتی اُمنگوں کا سوز و ساز میرِ کارواں کے دلِ ارجمند کی کیفیت — پنڈال کے ایک گوشے سے کبھی اُس کی مسرور نگاہیں اپنے کاروانِ شوق کی طرف اٹھتیں اور کبھی اپنی کٹھن راہوں کے نشانِ منزل کی طرف — اس کا عزمِ بلند برملا کہہ رہا تھا —

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہو گا

رفقائے سفر کے دلوں سے بے ساختہ اس کے حق میں یہ دُعا ابھر رہی تھی۔

دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے

پہلا اجلاس

۱۹ اپریل کی صبح کو ۹ بجے کے قریب پہلی نشست منعقد ہوئی جس میں استقبالیہ اور ناظم ادارہ کی

پرویز صاحب کا خطاب رپورٹ کے بعد پرویز صاحب کے خطاب کی باری تھی اور جونہی کرسیِ صدارت کی طرف سے پرویز صاحب کو مائیک پر آنے کی دعوت دی گئی، پنڈال کی فضا کا رنگ بدل گیا۔ پنڈال سے باہر ہر شخص جو کہیں نہ کہیں مصروفِ کار تھا سب کچھ چھوڑ کر

پنڈال کا رُخ کر رہا تھا۔ اس اجلاس کے لئے خصوصی دعوت نامے بھی خاصی تعداد میں جاری کئے گئے تھے۔ اور مندوبین و مبصرین کے علاوہ معزز مہمانوں کا طوفان اُمڈا چلا آرہا تھا۔ وسیع پنڈال کے آخری گوشے تک تمام نشستیں پُر ہو گئیں اور پھر مندوبین نے نئے مہمانوں کے لئے اپنی کرسیوں کو خالی کرنا شروع کر دیا۔ خواتین کے حصۂ پنڈال میں بھی تِل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ انتظامیہ کے قلب کو یہ کشمکش طلسم پیچ و تاب بنا رہی تھی کہ مہمانوں کے ہجوم سے پنڈال کہیں تنگیٔ داماں کی صورت پیدا نہ کر دے۔ لیکن مندوبین نے اپنی نشستوں کی پیشکش کر کے اس کشمکش کو آسودگی میں بدل دیا۔

والہانہ ذوق و شوق اور شدتِ انتظار کے دل آویز ماحول میں پرویز صاحب منتظر نگاہوں کے سامنے عید کا چاند بن کر نمودار ہوئے۔ اس بار اُن کے خطاب کا عنوان تھا ـــــ

"پیامِ فصلِ بہار"

دہیم بہ غمزدہ طائر پیامِ فصلِ بہار
نشیمن اُدسیم و یاسمن ریزم

"بادۂ زندگی" اور "نغمۂ زندگی" کے بعد اس پیامِ بہار کی کیف انگیزیوں اور وجد آفرینیوں کے تأثرات کیا تھے؟ جذبات و احساسات کا یہ کیف و نشاط الفاظ کی زبان سے ادا کرنا ممکن نہیں۔ نظر یہی آتا تھا کہ حسنِ بیان کے ساغر و مینا گردش میں آگئے اور ـــــ

دریائے پُر خروش زبند و شکن گذشت
از تنگنائے وادیٔ و کوہ و دمن گذشت

فکر و نظر کے آسمان پر اندھیری رات میں نئے نئے ستارے جگمگانے لگے۔ اور کاروانِ شوق نے اپنی منزل کا نشانِ (LAND MARK) نگاہوں کے سامنے پالیا۔ سینکڑوں نگاہیں قرآن کے اس گراں مایہ طالب علم پر مرکوز تھیں۔

فطرت کا سرودِ ازلی جس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

موسمِ بہار کی اس صبح کیف بار میں کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ تک قرآنی فکر و بصیرت کی یہ گل پاشیاں جاری رہیں۔ اس خطاب سے پرویز صاحب نے ماحول کے چہرے سے تمام نقاب اُلٹ دیئے۔ انھوں نے ملک

کے نئے عسکری انقلاب کا خیر مقدم کیا اور فرمایا کہ یہ انقلاب محض بساطِ سیاست کی مہرہ بازیوں کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ اُن کائناتی قوتوں کی کارفرمائی ہے جنہیں دنیا زمانے کے تقاضے کہہ کر یاد کرتی ہے اور یہ غنیمت ہے کہ طوفانِ بلاخیز کی آمد سے قبل ہی ہم نے اپنے ہاں وہ انقلاب پیدا کر لیا جس نے سرمایہ داری اور مفاد پرستیوں کی بساط اُلٹ کر رکھ دی۔ یہ کہتے ہوئے پرویز صاحب نے زرعی اصلاحات کا خیر مقدم کرتے ہوئے اسے قرآنی نظام کی منزل کی جانب پہلا قدم قرار دیا۔ اور کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے اُمید ظاہر کی کہ حکومت اپنے منتہائے مقصود تک بتدریج پہنچنا چاہتی ہے۔ اور اگر اس نہج پر مزید اقدامات کرتی رہی تو رفتہ رفتہ وہ قرآن کے نظامِ ربوبیت کی منزل تک پہنچ سکے گی۔

آئینِ نو کی تدوین کے سلسلے میں پرویز صاحب نے کہا کہ اس سوال کو حل کرنا ابھی باقی ہے کہ ہمارا آئین کس قسم کا ہو اور وہ آئیڈیالوجی کیا تھی جس کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے مستقبل کا انحصار انہی سوالات کے حل پر موقوف ہے۔ وقت آگیا ہے کہ حالات کی اس مُہلت سے کماحقہٗ فائدہ اٹھائیں۔ ازاں بعد پرویز صاحب نے اسلامی دستور کے اساسی نکات کی بالتفصیل وضاحت کی اور کارفرمایانِ مملکت پر واضح کیا کہ فرقہ بندی کے شرکِ عظیم کو ختم کئے بغیر اسلامی آئین اور اسلامی نظام کا دعوٰے انتہائی خود فریبی کی دلیل ہوگا۔ جب اسلام دین کی ناقابلِ تقسیم وحدت میں ہر نوع کی فرقہ بندی کو کھلا شرک قرار دیتا ہے تو پھر اسلامی آئین اور مذہبی فرقوں کا بیک وقت وجود اسلام سے مضحکہ خیزی قرار پائے گی۔

آخر میں قلبِ مضطرب کی انتہائی تپش و خلش سے پرویز صاحب نے رفقائے سفر سے اپیل کی کہ وہ وقت کی آواز کو پہچانیں اور قرآنی فکر کو عام کرنے میں جو کچھ بن پڑے کر گذریں۔

پرویز صاحب کے اس دلکش خطاب کے بعد کنونشن کی پہلی نشست اختتام پذیر ہوگئی۔

(یہ خطاب ہدیۂ قارئین ہے۔)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیامِ فصلِ بہار

پیام بہ ہمصفیرانِ چمن

سحر در شاخسارِ بوستانے　　چہ خوش می گفت مرغِ نغمہ خوانے
بر آور ہر چہ اندر سینہ داری　　سرودے، نالۂ، آہے، فغانے

برادرانِ عزیز! اسلام و رحمت۔

للہ الحمد کہ یہ قافلۂ بہار جو آج سے قریب اڑھائی سال قبل[1]، مانندِ نسیمِ صبح گاہی، نہایت نرم خرامی سے آمادہ بہ سفر ہوا تھا، ہولناک وادیوں کی وحشت سامانیوں سے بے خطر، گل پوش و آئینہ پاش روشوں کی دلکشیوں سے بے نیاز، حوصلہ شکن و ہمت ربا چٹانوں کی راہ بندیوں سے بے پرواہ، سودائے حصولِ منزل سے سرمست، مانندِ کہکشاں بگریبانِ مرغزار، قدم قدم آگے بڑھتا، آج اُس مقام تک آ پہنچا ہے جہاں فضا میں ہر طرف مرغانِ ہمنوا کے چہچہے فردوسِ گوش بنتے ہیں اور ہر فردِ کارواں سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ

گئے دن کہ تنہا تھا تو انجمن میں
نزے اب یہاں رازداں اور بھی ہیں

---

[1] پہلی کنونشن نومبر ۱۹۵۶ء میں منعقد ہوئی تھی۔

آپ احباب نے اس مختصر سے عرصہ میں باغ وراغ مملکت کے ہر گوشے میں جس خوش نوائی اور ہم آہنگی سے نغمۂ قرآنی کو عام کیا ہے یہ اسکا اثر ہے کہ آج اسکا ہر مرغِ خوش الحان آپ کا ہمنوا دکھائی دیتا ہے اور اس حقیقتِ کبریٰ کی علیٰ وجہ البصیرت شہادت دیتا ہے کہ

شورشِ عندلیب نے روحِ چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

کنونشن کی تاریخوں میں تبدیلی

آپ نے راولپنڈی میں اس اجتماع کے لئے تاریخوں میں تبدیلی کا جو فیصلہ کیا، بظاہر اس کا محرک جذبہ موسم کی ناسازگاری سے تحفظ تھا لیکن آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی فکری اور قلبی دنیا میں جو انقلاب بیدار ہو رہا ہے اُس فیصلہ میں، غیر شعوری طور پر، اُس کا بھی ہاتھ کارفرما تھا۔ بہار کا موسم وہ ہے جس میں کائنات کے گوشے گوشے میں نئی زندگی کی نمود ہوتی ہے۔ شجرِ حیات کی ہر شاخ سے حسنِ خوابیدہ انگڑائیاں لے کر بیدار ہوتا ہے چٹیل میدانوں سے سبزۂ نورستہ اور خشک ٹہنیوں سے گلِ نودمیدہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا ہے اور ہر دیدۂ بینا سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ (۳۰/۵۰) تم مبدا فیض کی نیساں باریوں اور گہر فشانیوں کو دیکھو کہ اس نے کس طرح زمین مردہ کو حیات تازہ عطا کر دی ہے۔

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار
مستِ ترنم ہزار
طوطی و دراج و سار
بر طرفِ جوئبار
کشتِ گل و لالہ زار
چشم تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار
خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید
بادِ بہاراں وزید

مُرغ، نوا آفرید
لالہ، گریباں درید
حسن، گلِ تازہ چید
عشق، غمِ نو خرید
خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید

حیاتِ نو کی طلب

خدا کے کائناتی قانون کا یہی تقاضا تھا جس سے آپ غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر اس مقام پر موسمِ بہار میں خیمہ زن ہوتے ہیں تاکہ اپنے نشو و نما دینے والے سے کہیں کہ ہم نے خارجی کائنات میں تیرے نظامِ ربوبیت کی ندرت کاریوں سے حیاتِ نو کی نمود دیکھ لی ہے۔ لیکن ہماری آرزو یہ ہے کہ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ط (۲/۲۶۰) ہمیں دکھا کہ تو دلوں کے ویرانوں کو کس طرح از سرِ نو آباد کیا کرتا اور مردہ قوموں کو کس طرح زندہ اقوام کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل بنایا کرتا ہے۔ یہی ہے وہ نقطۂ پرکار تمنا جس کے لئے ہم یہاں جمع ہوتے ہیں اور یہی ہے وہ سوال جس کے جواب کے لئے ہم اُس خدائے بلند و برتر کی آستان پر جھولی پھیلائے کھڑے ہیں جس کا اعلان ہے کہ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (۲/۱۸۶) میں (اپنی کتاب زندہ کے ذریعے) ہر اُس شخص کے سوال کا جواب دیتا ہوں جو مجھے پکارتا ہے۔ وہاں سے جواب لینے کے لئے انسان کی پکار میں سچی طلب، آرزو میں شدت اور ذہن میں سمجھنے کی صلاحیت شرط ہے جب مانگنے والا اس نہج سے مانگتا ہے تو اس کی کتاب خود آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرتی ہے۔

شعاعِ مہر خود بیتاب ہے جذبِ محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

خوش بخت ہیں وہ جو صحنِ چمن کائنات کی لالہ کاریوں کے ساتھ، اپنے دل کی کھیتی کی سیرابیوں اور شادابیوں کے سامان کی بھی تلاش کریں۔ طُوْبٰی لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ○ (۱۳/۲۹)

رفیقانِ محترم! جب ہم پہلی مرتبہ (اکتوبر ۱۹۵۷ء میں) راولپنڈی میں جمع ہوتے تھے، اُس کے بعد ہمارے ہاں کی فکر و نظر کی دنیا میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان سے کہیں بڑھ کر وہ خارجی انقلاب ہے جو مملکتِ پاکستان

عسکری انقلاب میں نمودار ہوا ہے[1]۔ سطح بین نگاہوں کے نزدیک یہ انقلاب شاید محض بساطِ سیاست کی مہرہ بازیوں کا نتیجہ ہو لیکن جن کی نظریں سطح سے نیچے اُتر کر گہرائی تک پہنچتی ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کے پیچھے کائناتی قوتوں کا ہاتھ بھی کارفرما تھا۔ یہی وہ قوتیں ہیں جنھیں عام الفاظ میں زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ زمانے کے تقاضے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ

بُرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا!
تماشا دکھا کر مداری گیا!

باقی دنیا تو اس پکار کو دل کے کانوں سے سن رہی تھی لیکن ہماری حالت یہ تھی کہ ہم اپنے کانوں پر مفاد پرستیوں کے لحاف لپیٹ کر سو رہنا چاہتے تھے۔ اگر کچھ وقت تک اور ہمارا یہی حال رہتا تو کم از کم مجھے تو صاف نظر آ رہا تھا کہ اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے کمیونزم کا سیلاب اپنی تلاطم انگیزیوں کے ساتھ اُمنڈ کر آ جائے گا اور ہمارے تمام نظریاتِ زندگی اور تصوراتِ حیات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ غنیمت ہے کہ اِس طوفانِ بلاخیز کی آمد سے پہلے ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے ہاں ایسی تبدیلی پیدا کر لی جس سے سرمایہ داری کی پروردہ اور مفاد پرستیوں کی سیاست کی بساط اُلٹ گئی۔ اس انقلاب کا پہلا مظاہرہ زرعی اصلاحات[2] کی شکل میں سامنے آیا ہے۔

زرعی اصلاحات قرآنِ کریم کی رُو سے، ملکیتِ زمین کی جو پوزیشن ہے اس کے متعلق ہمارے لٹریچر میں اتنا کچھ آ چکا ہے کہ اس وقت اس ضمن میں تفصیل سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے، اسلام میں زمین کی انفرادی یا اجتماعی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن نے معاشی نظام کا جو تصور دیا ہے اس کی رُو سے

(۱) زمین تمام نوعِ انسانی کے لئے رزق کا سرچشمہ ہے۔

---

[1] اکتوبر ۱۹۵۸ء میں کمانڈر اِن چیف جنرل محمد ایوب خان کی زیر قیادت عسکری انقلاب۔

[2] ان اصلاحات کی رُو سے انفرادی ملکیتِ زمین کے رقبہ کی (پانچ سو ایکڑ تک) تحدید کر دی گئی تھی۔ (طلوعِ اسلام)

(۲) اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچاتے۔ اس میں **ذمہ داری** کا لفظ قابلِ غور ہے یعنی مملکت صرف اتنا کہہ دینے سے اپنے اس فریضہ سے سبکدوش نہیں ہو سکتی کہ ہم لوگوں کے لئے سامانِ زیست بہم پہنچانے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔ سامانِ زیست کی بہم رسانی اس کی بنیادی ذمہ داری اور اس کی ہستی کے لئے وجہ جواز (JUSTIFICATION FOR ITS EXISTENCE) ہے۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲/۴۱) قرآن کا واضح ارشاد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا کے نام پر مملکت قائم کرنے والوں کو اقتدار حاصل ہوگا تو وہ ایسا معاشرہ قائم کرینگے جس میں تمام افراد قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں۔ یہ معاشرہ تمام افرادِ انسانیہ کو ان کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچائے گا، اُن باتوں کا حکم دے گا جنہیں قرآن کی بنیادی تعلیم صحیح تسلیم کرے۔ ان سے روکے گا جنہیں وہ نامناسب قرار دے۔ مختصراً یہ کہ اس معاشرہ میں ہر معاملہ کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہوگا۔

(۳) ظاہر ہے کہ یہ مملکت اپنی اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برا ہو نہیں سکتی جب تک ذرائع رزق اس کی تحویل میں نہ رہیں۔

(۴) لہٰذا، قرآن کی رُو سے زمین اور دیگر وسائل پیداوار کا مملکت کی تحویل میں رہنا ضروری ہے۔ اس کے برعکس، ہمارے ہاں "شریعت کا فیصلہ" یہ بنایا جاتا تھا (یعنی اُس شریعت کا فیصلہ جو ہمارے جاگیردارانہ دور میں وضع ہوئی تھی) کہ زمین پر انفرادی ملکیت بے حد و نہایت جائز ہے اور (اسکا کلیتہً مملکت کی تحویل میں چلے جانا تو ایک طرف) حکومت کو اس کا بھی حق نہیں پہنچتا کہ اس پر کسی قسم کی تحدید (LIMITATION) عاید کر سکے۔ اس انقلاب نے زمین کی ملکیت کی حد بندی کر کے اس غلط مفروضہ کو کالعدم قرار دیدیا ہے کہ زمین پر افراد کی ملکیت ہوتی ہے اور اس پر کسی قسم کی حد بندی نہیں کی جا سکتی۔ زرعی اصلاحات کمیشن کی رپورٹ میں تو اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ زمین پر افراد کی ملکیت ہو نہیں سکتی۔ اس میں، پہلے موجودہ مالکانِ اراضی کا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

زرعی کمیشن کی رپورٹ

زمیندار کے نقطۂ نگاہ سے زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی کرنا ایک حادثۂ عظیم ہے۔ اُس کے نزدیک ایسا اقدام کمیونزم

کے مرادف اور یکسر غیر اسلامی ہے۔ وہ ایسا کہتے وقت اس بات کو قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا کہ کم ازکم چار اسلامی ممالک — یعنی مصر، شام، ترکی اور عراق — نے ملکیتِ زمین پر حد بندی عاید کر رکھی ہے۔ اُس کا کہنا یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے زمین کو دیگر اقسامِ جائیداد سے الگ کیوں کیا جاتا ہے۔ اگر زمین کی ملکیت پر حد بندی عائد کرنی ہے تو دولت کی دیگر اقسام، مثلاً کارخانوں وغیرہ پر بھی اسی طرح حد بندی عاید کرنی چاہیئے۔ (رپورٹ صفحہ ۲۵-۲۶)

آپ احباب اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ یہ دلائل زمیندار کے ذہن کے پیدا کردہ نہیں۔ انہیں ہمارے علمبردارانِ شریعت نے ان کے لئے بہم پہنچایا تھا۔[1] (یہ جملۂ معترضہ تھا) رپورٹ میں، مندرجہ بالا نظریہ پیش کرنے کے بعد لکھا ہے۔

زمیندار کو اس حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیئے کہ زمین پر حق ملکیت مطلق (ABSOLUTE) نہیں۔ (صفحہ ۲۶)

اس نقطہ کی وضاحت کے لئے "زمین کے معاوضہ" کے سلسلہ میں رپورٹ میں لکھا ہے کہ

ہم نے ملکیتِ زمین کے سوال پر بحث کرتے وقت یہ کہا تھا کہ جب تک زمین کی پیداوار میں مملکت کا حق تسلیم کیا جائے کا جو لگان کی شکل میں ادا کیا جاتا ہے، زمین کی ملکیت کو مطلق (FULL - OWNERSHIP) قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نظری طور پر دیکھا جائے تو مملکت کو اس کا پورا پورا اختیار ہے کہ وہ شرح لگان اس قدر بڑھا دے کہ مالک اراضی کو زمین کی پیداوار میں سے کچھ بھی نہ بچے۔ چونکہ "زمین کی قیمت" سے مفہوم یہ ہے کہ زمیندار کو زمین سے جو کچھ حاصل ہوتا تھا اسے یک مشت ادا کر دیا جائے اس لئے، مذکورہ بالا نظریہ کی روشنی میں یہ چیز حقِ ملکیت کے بنیادی تصور کے قطعاً خلاف نہیں کہی جا سکتی۔ اگر مملکت، زمین کا کچھ بھی معاوضہ نہ دے۔ (صفحہ ۴۳)

آپ نے دیکھا کہ زرعی کمیشن اپنی تحقیقات کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ کس طرح قرآن کے بنیادی تصور کے قریب ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں مملکت کو ایسے قطائع اراضی کی ضرورت پڑی جو اس وقت تک افراد کے پاس تھے تو انھیں بلا معاوضہ حاصل کر لیا گیا۔ نیز جو لوگ اسلام لاتے ان کی

---

[1] دیکھئے "مسئلہ ملکیتِ زمین"۔ از سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔

زمینیں شروع ہی سے مملکت کی تحویل میں چلی جائیں۔ ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ اراضیات کی تحدید کے متعلق حکومت کا فیصلہ قرآنی نظامِ معاشی کی سمت ایک جرأتمندانہ اقدام ہے۔

رقبۂ اراضی حکومت نے جس قدر رقبۂ اراضی انفرادی ملکیت میں رہنے دیئے جانے کا فیصلہ کیا ہے، بعض حضرات کے نزدیک وہ بہت زیادہ ہے۔ اور تو اور، خود زرعی کمیشن کے ایک ممبر (محترم غلام اسحٰق خان صاحب) کی بھی یہی رائے تھی جس کا اظہار رپورٹ میں کیا گیا ہے۔ لیکن کمیشن نے اس ضمن میں کہا ہے کہ

> تحدیدِ ملکیت کے متعلق ہم نے جو کچھ تجویز کیا ہے اس باب میں متعدد عناصر نے ہماری راہ نمائی کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ غیر محدود ملکیت سے محدود ملکیت کی طرف انتقال، ایسے ہموار انداز سے ہو کہ زمیندار کے لئے اپنے ماضی سے انقطاع اس قسم کی دشواریاں پیدا نہ کرے جن کی وجہ سے اسے زندگی بسر کرنا مشکل ہو جائے۔ یعنی اس کی آمدنی میں یک لخت اتنی کمی نہ آجائے جس سے اس کا گزارہ نہ ہو سکے۔ (ص ۲۹)

اس سے ظاہر ہے کہ حکومت اس باب میں اپنے منتہیٰ تک بتدریج پہنچنا چاہتی ہے۔ یعنی انھوں نے جو موجودہ فیصلہ کیا ہے تو

یہ آنسوؤں کی کمی نہیں ہے، رعایتِ ظرفِ آستیں ہے

اس سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ حکومت اگر اسی نہج سے مزید اقدامات کرتی رہی تو وہ رفتہ رفتہ قرآن کی متعین کردہ منزل تک پہنچ جائے گی جہاں نہ صرف زمین، بلکہ جملہ وسائلِ پیداوار، انفرادی ملکیت سے نکل کر مملکت کی تحویل میں چلے جاتے ہیں اور مملکت ان سے، افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔ اسی کو نظامِ ربوبیت کہتے ہیں جو خدا کی صفتِ رب العالمین کا (بشری حدود کے اندر) عکس ہے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۔ (۲/۱۳۸)

انسانیت کی نجات وسعادت آپ نے غور کیا کہ خدا کے کائناتی قوانین کس طرح دنیا کو صحیح راستہ کی طرف لائے چلے جا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ

کہ انسانیت کی نجات وسعادت کے لئے اُس راستے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں جسے قرآنِ کریم نے ابدی اصولوں کی حیثیت سے متعین کرکے دیدیا ہے۔ دنیا جتنے اور راستوں پر جی چاہے چل کر دیکھ لے، اسے اپنے ناکام تجارب کے بعد اُس راستے کی طرف آنا ہوگا جس کا تعین قرآن نے کیا ہے اور جس پر اُس ذاتِ اقدس واعظم (علیہ التحیۃ والسلام) کے نقوشِ قدم درخشندہ ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں جس نے خود اس راستہ پر چل کر نوعِ انسان کو احترامِ آدمیت کی منزل تک پہنچا کر دکھایا تھا۔ زمانہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں جس قدر صحیح انقلابات رونما ہوتے ہیں ان سب کا رُخ اسی منزل کیطرف تھا، اور جو صحیح انقلاب اسکے بعد برپا ہوں گے ان کا رُخ بھی اسی سمت کو ہوگا۔

شمعِ نظر، خیال کے انجم جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں اُسی محفل سے آئے ہیں!

احبار و رہبان

لیکن جہاں یہ حقیقت وجہ صد مسرت ہے کہ انسانیت ہر ناکام تجربہ کے بعد قرآن کے متعین کردہ نصب العین کی طرف آتی ہے وہاں یہ امر باعثِ ہزار تعجب و تاسف ہے کہ قرآن کی سب سے زیادہ مخالفت خود ہمارے اربابِ مذہب کیطرف سے ہوتی ہے۔

بیکے بشہر نگر کن، چہ انقلاب افتاد
کہ رندِ میکدہ بیدار و پارسا خفت است

اور یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو واضح الفاظ میں متنبہ کردیا تھا کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط (۹/۳۴) اے ایمان والو! اس حقیقت کو بگوشِ ہوش سن رکھو کہ علماء و مشائخ کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ یہ لوگوں کا مال، تعمیری نتائج مرتب کئے بغیر، ناحق کھا جاتے ہیں اور خدا کے بندوں کو خدا کے راستے سے بہکا کر دوسرے راستوں پر ڈال دیتے ہیں۔ تاریخ انسانیت اور خود اسلام کی سرگذشت اس پر شاہد ہے کہ ملحد اور بے دین لوگ دوسروں کو خدا کے راستے سے پھیرنے میں کبھی اتنے کامیاب نہیں ہوتے جتنے کامیاب وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا دعویٰ ہو کہ وہ خدا کی طرف دعوت دینے والے ہیں لیکن درحقیقت وہ خدا کا راستہ روک کر کھڑے ہوں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جھوٹ اگر کسی کے سامنے اپنی اصلی شکل میں (بے نقاب) آئے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اسے اپنی کامیابی کے لئے ضروری

جھوٹ سچ کے نقاب میں

ہے کہ وہ سچ کا لبادہ پہن کر آئے۔ ایک شخص آپ کے پاس آکر کچھ باتیں کرتا ہے۔ آپ اس کا یقین کرلیتے ہیں اور جو کچھ وہ چاہتا ہے ویسا کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ لیکن عین اس وقت وہ آپ سے کہتا ہے کہ بھئی! میں نے جو کچھ آپ سے کہا ہے وہ سب جھوٹ ہے۔ کہئے! اس کے بعد آپ اس کے لئے وہ کچھ کردیں گے جس کے لئے آپ آمادہ ہوچکے تھے، کبھی نہیں کریں گے۔ آپ وہ کچھ اسی صورت میں کریں گے جب وہ آخر تک قسمیں اٹھا اٹھا کر آپ کو یقین دلاتا جائے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے سچ ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جھوٹ کو اپنی کامیابی کے لئے سچ کا نقاب اوڑھنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا راستہ روکنے میں وہی لوگ کامیاب ہوسکتے ہیں جو خدا پرستی کا نقاب اوڑھ کر سامنے آئیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ ان لوگوں کی ٹیکنیک یہ ہے کہ یَکۡتُبُوۡنَ الۡکِتٰبَ بِاَیۡدِیۡہِمۡ ثُمَّ یَقُوۡلُوۡنَ ہٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ۔ خود اپنی طرف سے بات بناتے ہیں (اپنے ہاتھوں سے فتویٰ لکھتے ہیں) اور اس کے متعلق مشہور یہ کرتے ہیں کہ وہ خدا کا حکم ہے، اور مقصد اس سے یہ ہوتا ہے لِیَشۡتَرُوۡا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۲/۷۹ تاکہ اس سے چار پیسے کما لئے جائیں۔ اگر یہ لوگ اپنے فتاویٰ کے متعلق کہیں کہ انہیں ہم نے اپنے جی سے گھڑ لیا ہے وہ خدا کا حکم نہیں تو کوئی شخص ان کے فریب میں نہ آئے۔ ان کا فریب کامیاب ہوتا ہی اس صورت میں ہے جب یہ اپنے فیصلوں کو خدا کا حکم کہہ کر پیش کریں۔

دوسری قوموں کے لئے یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ جو کچھ ان کے اربابِ شریعت ان سے کہتے ہیں وہ خدا کا حکم ہے یا ان کا اپنا فیصلہ۔ اس لئے کہ ان کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصل شکل میں موجود نہیں تھی۔ لیکن ہماری پوزیشن ان سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارے پاس خدا کی کتاب حرفاً حرفاً محفوظ ہے اور ہر شخص کی اس تک رسائی ہوسکتی ہے۔

یہ غنیمت ہے درِ میخانہ اب تک باز ہے

ہمارے لئے کرنے کا کام فقط اتنا رہ جاتا ہے کہ جو کچھ ہمارے سامنے دین کے نام سے پیش کیا جائے اسے خدا کی کتاب کے سامنے لیجائیں اور اس سے فیصلہ لے لیں کہ وہ واقعی خدا کا حکم ہے یا اس کی طرف یونہی منسوب کردیا گیا ہے۔

چارہ این است کہ از عشق گشادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

برادرانِ عزیز! عسکری انقلاب کا پہلا کارنامہ آپ کے سامنے آچکا۔ اس کا دوسرا کارنامہ اُس آئین کی

آئین کی تنسیخ

تنسیخ ہے جس کا اکثر و بیشتر حصہ غیر اسلامی تھا لیکن اس کے باوجود حضرات علماء کرام نے اس کے عین اسلامی ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیا تھا۔ ہم جو خطۂ پاکستان میں خالص قرآنی نظام کی تشکیل کے متمنی ہیں، ہزار چاہتے تھے کہ ۱۹۵۶ء کا آئین بلا تاخیر قرآنی آئین میں تبدیل ہو جائے لیکن ہمارے لئے اُس آئین میں ضروری اور بنیادی تبدیلیاں کرانے کے لئے آئینی اور جمہوری طریق کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا اور ہماری کوششوں کا رُخ اسی سمت کو تھا ہم اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ راستہ بڑا طویل اور زمانے کی رفتار بڑی تیز ہے لیکن جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے ہمارے سامنے اس کے سوا کوئی طریق کار نہیں تھا۔ مسافت کی لمبائی سے گھبرا کر خود اپنے احباب میں سے بعض میرے پاس آتے اور کہتے کہ اس طریق سے ہم اپنی منزل تک کس طرح اور کب پہنچ سکیں گے۔

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

میں ان سے کہتا کہ مجھے آپ کی بیتابیٔ تمنا کا پورا پورا احساس ہے لیکن آپ کو صبر طلبیٔ عشق[1] پر بھی تو نگاہ رکھنی پڑے گی۔ لیکن میں دیکھتا تھا کہ اس سے ان کا اطمینان نہیں ہوتا تھا اور یوں ان قلوب پر بھی مایوسی اثر انداز ہوتی چلی جا رہی تھی جنہیں اقرار تھا کہ مایوسی کفر ہے۔ ان حالات میں عسکری انقلاب آیا اور اُس نے بیک جنبشِ قلم پورے کے پورے آئین کو کالعدم قرار دے دیا۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

تخریب کے بعد تعمیر

لیکن یہ اس پروگرام کا صرف تخریبی حصہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تخریب کے ساتھ تعمیر نہ ہو وہ تخریب مفید ہونے کے بجائے الٹی مضر ہو جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَھَا۔ (۲/۲۵۶) جو شخص غیر خدائی قانون سے انکار کر کے، قانونِ خداوندی کو اپنا نصب العین بناتا ہے، وہ ایسے محکم رشتے کو تھام لیتا ہے جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ اقبال

---

[1] عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک۔ (غالب)

کے الفاظ ہیں۔

کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام
ہر کہ در ورطۂ لا ماند بہ الّا نرسید

اس اعتبار سے دیکھیے تو آج ہم پھر اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں ۱۹۴۷ء میں تھے۔ یعنی ہمارے پاس ایک آزاد مملکت ہے جس کا آئین ہم نے مرتب کرنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ آئین کس قسم کا ہونا چاہیے۔ ہم نے ۱۹۴۸ء تک اپنی بساط کے مطابق مسلسل کوشش کی کہ قوم کو بتایا جائے کہ وہ آئیڈیالوجی کیا تھی جسے عملی قالب میں ڈھالنے کے لئے پاکستان کا خطہ زمین حاصل کیا گیا تھا اور ایک اسلامی مملکت کا آئین کس قسم کا ہوتا ہے۔ اگرچہ ہماری طرف سے پیش کردہ قرآنی تصور ہماری توقعات سے کہیں زیادہ عام ہوا لیکن، مفاد پرست گروہوں کے حربے زیادہ مؤثر تھے اس لئے مملکت کا آئین اسلامی نہ بن سکا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی میزان میں ہماری یہ ہلاکت ابدی نہ تھی۔ اس لئے ہمیں دوبارہ موقع دیا گیا ہے کہ ہم اپنی غلطی کی تلافی کر سکیں ورنہ عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

لیکن ملک کی بدقسمتی ملاحظہ کیجئے کہ ادھر آئین کی ترتیب نو کا سوال سامنے آیا اور ادھر پھر انہی تخریبی عناصر نے سر نکالنا شروع کر دیا جنہوں نے اس سے پہلے نو سال تک اپنی ہر قوت کو اس "جہادِ عظیم" میں صرف کر دیا تھا کہ پاکستان میں صحیح اسلامی آئین مرتب نہ ہونے پائے خواہ اس سے خود اسلام دنیا کی نظروں میں اضحوکہ کیوں نہ بن جائے۔ اور اسلامک آئیڈیالوجی کے دعاوی فریب نظر کیوں نہ دکھائی دینے لگیں۔

آئینِ نو کی ترتیب کا سوال

خوشم کہ گنبدِ چرخِ کہن فرو ریزد
اگرچہ خود ہمہ بر فرقِ من فرو ریزد

اب پھر نئے سرے سے ان سوالات میں خلط مبحث پیدا کیا جا رہا ہے کہ اسلامی آئین کسے کہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کے امتیازی خط و خال کیا ہوتے ہیں۔ کیا پاکستان میں اسلامی آئین مرتب کیا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ان موضوعات پر میں مسلسل دس برس سے لکھتا چلا آ رہا ہوں اس لئے اس

وقت ان تفاصیل میں جانے کی نہ ضرورت ہے نہ فرصت۔ میرے خیال میں اس وقت صرف اتنا کافی ہوگا کہ اسلامی مملکت کا اجمالی تصور آپ حضرات کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

سیکولر اسٹیٹ اور قرآنی مملکت میں فرق

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ سیکولر اسٹیٹ (SECULAR STATE) اور قرآن کی رُو سے دینی مملکت میں کیا فرق ہے۔ تفاصیل کے اعتبار سے دیکھئے تو ان دونوں کے فرق کی داستان طویل ہے۔ لیکن اصولی طور پر سمجھنا چاہیں تو اسے چند فقروں میں سمٹایا جا سکتا ہے۔ سیکولر اسٹیٹ کا مقصود و منتہیٰ اپنے ملک یا قوم کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے جو ذریعہ مناسب سمجھا جائے اس کا اختیار کر لینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار پا جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس اسٹیٹ کا اصول (اگر ایسا کہنے سے اصول کے لفظ کی توہین نہ ہو) مصلحتِ وقت کا تقاضا (EXPEDIENCY) ہوتا ہے۔ اربابِ علم سے پوشیدہ نہیں کہ اس مذہبِ سیاست کا امام اٹلی کا مشہور مدبر میکیاولی (NICCOLO - MACHIAVELLI) اور اس کا صحیفہ اس کی شہرۂ آفاق کتاب (THE PRINCE) ہے۔ اس کتاب میں وہ جس مسلک کی تلقین کرتا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ

> ہر وہ حربہ جس سے سلطنت کی قوت بڑھے مستحقِ ستائش ہے اور ہر وہ فریب جس سے کامیابی حاصل ہو درخورِ تبریک و تحسین۔ عدل و انصاف، قوت کا دوسرا نام ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس، فطرت کا صحیح اصول ہے۔ جنگ ہو یا امن، مملکت کے لئے سب سے زیادہ موثر ہتھیار قوت اور فریب ہے۔ حکمران کے لئے صفتِ روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دجل و فریب کے جال بچھا سکے اور خوئے شیری بھی تاکہ وہ بھیڑیوں کو خائف رکھ سکے۔ اس میں نیک عادات کا ہونا ضروری نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ ایسا معلوم ہو کہ وہ بڑا نیک ہے۔ اگر اس میں کوئی نیک عادت پیدا ہو جائے تو اس میں بھی چنداں مضائقہ نہیں لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ اسکے دل کی حالت ہمیشہ ایسی رہے کہ جونہی وہ دیکھے کہ مصلحتِ وقت کا تقاضا ایسا ہے کہ اس نیک عادت کو الگ کر دیا جائے تو وہ بلا ادنیٰ تامل اس کے خلاف عمل کر سکے۔

عصرِ حاضر میں مذہبِ سیاست کی یہی وہ بائبل ہے جس سے متاثر ہو کر (LORD GREY) نے کہا تھا کہ "سلطنتوں کے معاملات اخلاقی ضابطوں کی رُو سے طے نہیں پایا کرتے"۔ اور (WALPOLE)

نے لکھا تھا کہ

نیک آدمی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک بعض اوقات جانا ضروری ہو جاتا ہے نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے۔

یہی وہ سیاست ہے جس کی رُو سے اخلاقیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے' ایک (PRIVATE MORALITY اور دوسرا PUBLIC MORALITY) یعنی ذاتی معاملات میں ضابطۂ اخلاق اور ہونا چاہیئے اور سیاسی معاملات میں اور۔ ان دونوں ضوابط میں کیا فرق ہے' اس کے لئے اٹلی کے مشہور سیاستدان (CAVOUR) کا یہ اعتراف کسی وضاحت کا محتاج نہیں جس میں اس نے کہا ہے کہ

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں گے۔

اس معیار کے مطابق کوئی "محب وطن" جتنا بڑا شیطان ہوتا ہے مملکت اتنا ہی بڑا اس کا مجسمہ نصب کرتی ہے اور وہ آنے والی نسلوں کے لئے ہیرو قرار پاجاتا ہے۔ یہ ہے سیکولر اسٹیٹ کا بنیادی تصور۔ اسکے برعکس دینی مملکت کا تصور یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لئے کچھ اصول ایسے ہیں جو غیر متبدل (INVIOLABLE) ہیں۔ ان میں کسی حالت میں بھی تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا۔ سیکولر اسٹیٹ میں اقتدارِ اعلٰے (SOVEREIGNTY) جمہور کو حاصل ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جمہور کے نمائندے' اکیاون فیصد آراء سے جس قسم کا قانون چاہیں بنالیں۔ لیکن قرآنی مملکت میں اکیاون تو ایک طرف' اگر سو کے سو ارکان

دینی مملکت کا اُصولی تصوّر

بھی چاہیں تو اُن غیر متبدل اصولوں میں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرسکتے۔ اس مملکت کا مقصود و منتہٰے ان غیر متبدل اصولوں کا تحفظ اور ان کی عملی تنفیذ ہے۔ یہی اس مملکت کے وجود EXISTENCE کی وجہ جواز JUSTIFICATION ہے۔ ان اصولوں کو مستقل اقدار یا PERMANENT VALUES کہتے ہیں۔ یہ اصول و اقدار قرآن کریم میں واضح، بیّن، مکمل اور محفوظ شکل میں دے دیئے گئے ہیں۔ اسلامی مملکت وہ ہے جو ان مستقل اقدار کو اپنا نصب العین قرار دے۔ جو آئین ان اقدار کے تحفظ کی ضمانت دے گا اسے اسلامی آئین کہا جائے گا۔ یہ اصول یا اقدار وہ حدود (BOUNDARY LINES)

ہیں جن کے اندر رہتے ہوتے اسلامی مملکت اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق قوانین وضع کر سکتی ہے۔ یہ اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی چار دیواری کے اندر جو قوانین مرتب ہوں گے وہ زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہیں گے۔ اسلامی معاشرہ اسی ثبات و تغیر (PERMANENCE AND CHANGE) کے حسین امتزاج کا مظہر ہوتا ہے۔ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (۲۴/۱۴) اسی خوشگوار اور تناور درخت کی طرح جس کی جڑیں پاتال میں اپنی جگہ پر قائم ہوں اور شاخیں فضا کی پہنائیوں میں جدھر منہ آئے پھیل جائیں، یا اس پرندے کی طرح جس کی کیفیت یہ ہو کہ

پرد در وسعت گردوں یگانہ
نگاہِ اُو بسوئے آشیانہ

دینی مملکت کے اس بنیادی اصول کی حیثیت اس مرکزی نقطہ (CENTRE) کی سی ہے کہ اگر پرکار کا پاؤں اس پر جما رہے تو زندگی کا دائرہ ٹھیک کھنچتا چلا جائے لیکن اگر اس کا پاؤں اس نقطہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہٹ جائے تو سارا دائرہ بگڑ جائے۔

غیر متبدل اصول

اس مقام پر آپ کے دل میں لازماً یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ غیر متبدل اصول یا اقدار کیا ہیں جو اسلامی مملکت اور اس کے آئین کی بنیاد بنتے ہیں۔ ان اقدار کے تفصیلی بیان کے لئے کافی وقت چاہیئے۔ اس وقت میں (مثال کے طور پر) صرف چند اقدار کا مختصر سا تعارف کرانے کی کوشش کروں گا جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ ان اصول و اقدار کی نوعیت کیا ہے۔

انسانی زندگی کا ایک تصور تو یہ ہے کہ انسان عبارت ہے اس کے طبیعی جسم (PHYSICAL BODY) سے، جو مادی قوانین کے مطابق وجود میں آتا ہے۔ انہی قوانین کے مطابق جسم کی مشینری چلتی رہتی ہے اور جب یہ مشینری بند ہو جاتی ہے تو اس کے جسم کے ذرات منتشر ہو جاتے ہیں۔ اسی کا نام موت ہے جس سے اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے متعلق اس تصور کو مادی یا میکانکی تصور (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کہا جاتا ہے۔

انسانی ذات

زندگی کا دوسرا تصور یہ ہے کہ انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات PERSONALITY یا خودی (SELF) کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات نہ مادی ارتقا کی پیداوار ہے نہ طبیعیاتی قوانین کے تابع۔ یہ ہر فرد کو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ لیکن غیر نشوونما یافتہ (UNDEVELOPED) مضمر (POTENT) یا امکانی (REALISEABLE POSSIBILITY) کی شکل میں۔ زندگی کا مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ اگر اس کی مناسب نشوونما ہو جاتے تو یہ جسم کی موت کیساتھ فنا نہیں ہوجاتی بلکہ بدستور زندہ رہتی اور مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے۔

جس طرح جسم کی پرورش کے لئے طبیعیاتی قوانین ہیں، اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین مقرر ہیں۔ یہ وہی قوانین ہیں جنھیں قرآن کے غیر متبدل اصول یا مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ اگر انسان ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرے تو اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر وہ ان سے انحراف برتے تو اس کی ذات میں ضعف و انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان ان اصولوں کیمطابق انفرادی طور پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ یہ صرف معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے، اجتماعی طور پر ممکن ہے۔ مملکت اسی اجتماعی زندگی کی تعبیر ہوتی ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت اس لئے وجود میں آتی ہے کہ افراد کے جسم اور ان کی ذات کے نشوونما کا ذریعہ بنے۔ مملکت مقصود بالذات نہیں، اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

لہٰذا سب سے پہلی مستقل قدر خود انسانی ذات ہے۔ اس قدر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے باقی اقدار اس کے گرد گردش کرتی ہیں۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر دین کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس خدا کو مانتا ہے جس نے کارگہ کائنات کو پیدا کیا اور جس کے قوانین کے مطابق یہ عظیم الشان سلسلہ اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے لیکن وہ انسانی ذات پر یقین نہیں رکھتا تو قرآن کی رُو سے اس کا خدا کو ماننا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ انسان کا اپنی ذات پر ایمان، خدا پر ایمان کی بنیادی شرط (PRE-REQUISITE CONDITION) ہے۔

انسانی ذات اپنی انفرادیت (INDIVIDUALITY) رکھتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر فرد اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہوتا ہے اور ان اعمال کا خوشگوار یا ناخوشگوار نتیجہ خود بھگتتا ہے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (6/165) اسی کا بنیادی اصول ہے۔ یعنی کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے

کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ انسان کو اس کے اعمال کے نتیجے سے نہ کسی کی سفارش بچا سکتی ہے نہ وہ کسی قسم کا فدیہ دے کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (۲/۴۸) اسلامی مملکت میں معاوضہ

احترامِ آدمیت

یا مؤاخذہ کا تعین اسی غیر متبدل اصول کے مطابق ہوتا ہے۔ چونکہ انسانی ذات ہر فرد کو خدا کی طرف سے یکساں طور پر عطا ہوتی ہے اس لئے ہر انسانی بچہ محض انسانی بچہ ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) قرآن کا وہ غیر متبدل اصول ہے جسے ساری دنیا مل کر بھی بدل نہیں سکتی۔ ایک بچہ شہنشاہ کے محل میں پیدا ہو یا چمار کی جھونپڑی میں، اس مستقل قدر کی رُو سے دونوں یکساں طور پر واجب التکریم ہیں۔ ان میں امیر و غریب کے علاوہ، نہ کالے اور گورے کی تمیز ہے نہ کافر و مومن کی تفریق۔ نہ وطن اور نسل کا کوئی امتیاز ہے نہ زبان اور بود و ماند کی کوئی خصوصیت۔

آدمیت احترامِ آدمی است

قرآن کا بنیادی اصول ہے۔ جو آئین یا قانون اس بنیادی قدر کی حفاظت کرے گا وہ اسلامی کہلائیگا۔ جو اس سے متصادم ہوگا وہ غیر اسلامی قرار پا جائے گا۔

تعینِ مراتب

پیدائش کی رُو سے بنیادی تکریم کے بعد قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۶/۱۳۲) ہر شخص کے مدارج و مراتب اس کے ذاتی جوہر اور کام کے لحاظ سے متعین ہوں گے۔ اس میں حسب و نسب، دولت، تعلقات یا اضافی اثرات کا کوئی لحاظ نہیں ہوگا۔ اسی اصول کو جب آگے بڑھاتے جائینگے تو اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۴۹/۱۳) کی منزل سامنے آجائے گی۔ یعنی سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوگا جو قوانینِ خداوندی کا سب سے زیادہ پابند ہوگا۔ یعنی جس کی زندگی ان مستقل اقدار پر سب سے زیادہ پوری اُترے گی۔

تکریمِ آدمیت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی انسان کسی کا غلام نہ ہو۔ لہٰذا غلامی (SLAVERY) قرآن

غلامی

کی رُو سے انسانیت کا بدترین جرم ہے۔ غلامی تو ایک طرف رہی، قرآن کا ارشاد یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان سے اپنا ذاتی حکم منوائے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ

لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ . (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ خدا اسے ضابطہ قوانین، حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ دوسرے لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کے قوانین کی نہیں بلکہ میری محکومیت اختیار کرو۔ لہذا اسلامی مملکت میں اطاعت صرف قانون کی ہوگی، اس قانون کی جس کی عمارت قرآن کے غیر متبدل اصولوں پر استوار ہوگی۔ ان قوانین کا اطلاق ہر فرد پر یکساں طور پر ہوگا اور اس میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی بھی استثنا نہیں ہوگی۔ قرآن نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ اعلان کرایا ہے کہ "اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ" میں سب سے پہلے قانونِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

قانون کی اطاعت

عدل

قانون کے یکساں طور پر اطلاق کا نام عدل ہے، عدل کے متعلق قرآن جس شدت سے تلقین کرتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کا حکم ہے کہ "لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ اَلَّا تَعْدِلُوا ، اِعْدِلُوا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (۵/۸) کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ یہی چیز تقویٰ کا تقاضا ہے۔

عدل کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ کسی کا واجب (DUE) ہو اسے دے دیا جائے۔ لیکن قرآن نے عدل کے ساتھ احسان کا بھی ذکر کیا ہے، اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۶/۹۰)

احسان

احسان کے معنی ہیں حسن پیدا کرنا اور حسن نام ہے صحیح توازن و تناسب (PROPORTION) کا۔ جس کا توازن بگڑ جائے اس میں حسن باقی نہیں رہتا۔ قرآن کا حکم یہ ہے کہ جس شخص کا کسی کمی کی وجہ سے توازن بگڑ رہا ہو اس کی اس کمی کو پورا کر دو تاکہ اس فرد کا (اور اس طرح افراد کے مجموعہ یعنی پورے معاشرہ کا) حسن قائم رہے۔ یہ بھی قرآن کا غیر متبدل اصول ہے جس پر اس کے نظام ربوبیت کی انشانداز عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا ایسا انتظام کرے جس سے ہر فرد یکساں طور پر متمتع ہوسکے۔ بالفاظِ دیگر مملکت میں رہنے والے بچوں کی جسمانی، ذہنی اور قلبی نشوونما انکے والدین کی ذمہ داری نہیں ہوگی بلکہ خود مملکت کی ذمہ داری ہوگی اور اس میں کسی قسم کا امتیازی سلوک (DISCRIMINATION) روا نہیں رکھا جائے گا۔

اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی مملکت میں ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو جائے درآنحالیکہ باقیوں کا پیٹ بھرا ہوا ہو، یا کوئی بچہ ایسا رہ جائے جسے اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشو ونما کے لئے ضروری وسائل میسر نہ آسکیں، تو وہ مملکت اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ حضرت عمرؓ نے تو اس باب میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم عمرؓ سے

نظامِ ربوبیت

اس کی باز پرس ہوگی۔ اسلامی مملکت، اس نظامِ ربوبیت کا تجربہ پہلے اپنے حدود کے اندر کرے گی۔ اور اس کے بعد اس کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جائے گی۔ حتیٰ کہ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا "یہ پوری زمین اپنے نشو ونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔" یہ مملکت جن افراد کی پرورش کا ذمہ لے گی اُن سے کہہ دے گی کہ "لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا (۷۶/۹) ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے خواہاں ہیں نہ شکریہ کے متمنی۔ یہ ہمارا فریضۂ حیات ہے جسے ہم نے ادا کر دیا۔ اس میں صلہ اور معاوضہ کا کیا سوال؟

بہائے درد و الم، درد و غم کی لذت ہے
وہ ننگ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لئے

اپنی مملکت سے باہر کے افراد کی پرورش کا جذبۂ محرکہ، نہ سیاسی استعمار ہوگا نہ اپنی سلطنت کے استحکام کے لئے زیادہ سے زیادہ حلیف پیدا کرنے کی مقدس آرزو۔ یہ سب کچھ اس ایمان کی رُو سے ہوگا

عالمگیر انسانیت

کہ تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد اور ایک خاندان کے نفوس ہیں۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) قرآن کا غیر متبدل اصول ہے۔ یہ انسان کی تنگ نگہی اور ہوس پرستی ہے جس سے اس نے اس عالمگیر برادری کو قوموں اور وطنوں کی چار دیواری میں تقسیم کر کے وحدتِ انسانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

معیارِ قومیت

قرآن کی رُو سے انسانوں کی تقسیم کا ایک ہی معیار ہے۔ جو لوگ قرآن کی متعین کردہ مستقل اقدار کو زندگی کا نصب العین بنانے کا اقرار کر لیں وہ ایک ملت کے افراد ہیں، عام اس سے کہ وہ کس نسل سے متعلق ہیں اور دنیا کے کس حصہ میں رہتے ہیں اور جو ان اقدار سے انکار کریں وہ دوسری پارٹی کے افراد ہیں خواہ وہ اپنی مملکت کے اندر ہی کیوں نہ رہتے ہوں۔ بالفاظِ دیگر، قرآن کی رُو سے قوم کی تشکیل، آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر ہوتی ہے نہ کہ اشتراکِ وطن

اور نسل کی بنیاد پر۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جو شخص اس معیار کے مطابق ملتِ اسلامیہ کا فرد نہیں بنتا وہ اسلامی مملکت کی ربوبیتِ عامہ سے محروم رہ جاتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ قرآن نے جو حقوق و مراعات محض انسان ہونے کی جہت سے دی ہیں وہ تمام انسانوں کے لئے عام ہیں اور انھیں ہر فرد انسانی حق کے طور پر (AS OF RIGHT) طلب کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۷۰/۲۵) ان کے مالوں میں ہر محتاج و محروم کا حق ہے جسے ان میں سے ہر ایک اچھی طرح جانتا ہے۔ اقوام و اوطان کی حدود سے بلند ہو کر، عالمگیر انسانیت کو پیشِ نظر رکھنے کا یہ وہ غیر متبدل اصول ہے جس کی رُو سے قرآن نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ۔ یاد رکھو وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) دنیا میں دوام اور بقا صرف اس کام کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے ہے۔ یہی قرآن کا غیر متبدل اصول ہے اقبال کے الفاظ میں:-

عقل خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

وحدتِ انسانیت کا فلسفہ

اس مقام پر عزیزانِ من! قرآنی حکمت کا ایک ایسا عظیم نکتہ سامنے آتا ہے جسے بیان کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ قرآن کریم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ وحدتِ خالق اور وحدتِ مخلوق ہے۔ وہ جس معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے اس کی بنیاد وحدتِ انسانیت کے اصول پر ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ فرد کو تاکید کرتا ہے کہ وہ انفرادی زندگی بسر کرنے کی بجائے معاشرہ کا جزو بن کر رہے۔ معاشرہ میں وہ طبقاتی تقسیم پیدا ہونے نہیں دیتا۔ وہ پوری کی پوری اُمت کو ایک وحدت قرار دیتا ہے۔ پھر اُس اُمت کو تاکید کرتا ہے کہ وہ باقی اقوامِ عالم سے الگ تھلگ نہ رہے بلکہ اپنی تہذیب و تمدن کے حاصلات میں انہیں بھی شریک کرے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وحدتِ انسانیت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اقوامِ عالم کا

باہمی سیاسی تصادم اور معاشی کشاکش ختم ہو جائے۔ لیکن اس سے بلند تر مقصد اور بھی ہے۔ انسانی ارتقا کا یہ ایک عجیب اصول ہے کہ اگر ایک قوم تہذیب و تمدن میں آگے بڑھ گئی ہے لیکن وہ اپنے تہذیبی اور ثقافتی حاصلات کو اپنے آپ تک محدود رکھتی ہے، تو اس کی ترقی ایک خاص حد پر جا کر رُک جائیگی اور اس سے آگے بڑھ نہیں سکے گی۔ لیکن اگر وہ قوم اپنے علمی اور تہذیبی ماحصل کو دوسری قوموں تک بھی پھیلا دیتی ہے تو اس کا ارتقاء حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر (برایفالٹ کے استعارہ کے مطابق) اگر تہذیبی ترقی غیر مہذب سمندر میں ایک جزیرہ کی طرح محدود و مقید رہتی ہے **تو وہ ایک** حد تک جا کر جامد اور متصلب (STAGNATED) ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر ایک قوم کی معاشی حالت یہ ہے کہ اس میں تہذیب و تمدن کا حامل ایک خاص گروہ اور باقی افراد قوم کی ارتقائی سطح پست ہے تو اس گروہ کا ارتقاء بھی ایک حد تک پہنچ کر جامد ہو جائے گا۔ یہ ارتقاء اسی صورت میں آگے بڑھیگا جب اس میں پوری کی پوری قوم برابر کی شریک ہو۔ اسی اصول کے مطابق، اگر کسی گروہ میں ایک فرد بلند ثقافتی اصول کا حامل ہے، تو اگر وہ اپنے ذہنی اور قلبی جوہروں کو اپنی ذات تک محدود رکھے گا تو اس کا ارتقاء ایک حد تک پہنچ کر رُک جائے گا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن 'فرد کو **جماعت کا جزو**' اور جماعت کو پوری انسانیت کا جزو بناتا ہے۔ انہیں الگ الگ نہیں رہنے دیتا۔ اس کی رُو سے متشکل شدہ جنت میں فرد انفرادی زندگی بسر کرنے سے داخل نہیں ہوتا۔ اسے حکم دیا جاتا ہے "فَادْخُلِیْ فِیْ

اجتماعی جنّت

عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (۸۹/۲۹-۳۰) تو میرے بندوں میں شامل ہو جا اور اس طرح جنت میں داخل ہو جا۔ اس جنت میں بھی یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ اس کا کچھ حصہ جنت ہو اور باقی حصہ جہنم۔ قرآن دنیا میں اسی قسم کی جنت متشکل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رُو سے رہبانیت (یعنی تصوف کے خلوت کدوں) کی زندگی اسی لئے غیر قرآنی ہے کہ اس میں ہر فرد اپنی روحانی ترقی کی فکر میں لگا رہتا ہے اور پورے معاشرے کو اس میں شامل نہیں کرتا۔ اسی طرح قرآن دنیائے سیاست میں اس نہج کو ارتقائے انسانیت کے منافی قرار دیتا ہے جس میں اقتدار و اختیار کسی ایک طبقہ کی اجارہ داری بن کر رہ جائے اور باقی افرادِ قوم کی سطح اس طبقہ سے نیچی ہو۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ بین الاقوامی بساط پر اس روش کو خلافِ انسانیت قرار دیتا ہے جس میں ایک قوم عروج و ارتقاء کی بلند ترین فضاؤں میں پرواز کر رہی ہو اور باقی اقوام عالم بال و پر بریدہ

پرندوں کی طرح خاک نشین ہو کر رہ جائیں۔ وہ اسی ارتقاء کو وجہ شرف قرار دیتا ہے جس میں تمام افرادِ انسانیت برابر کے شریک ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو تھوڑی دور چل کر اس آگے بڑھنے والی قوم کی ترقی بھی

جَحِیْم سے مراد

رُک جائے گی اور وہ بھی دیگر اقوام کی طرح جہنم میں پہنچ جائے گی۔ قرآن نے جہنم کے لئے عربی زبان کا لفظ جَحِیْم استعمال کیا ہے جس کے معنی رُک جانے کے ہیں، جہاں کسی قوم کی ترقی رُک جاتی ہے (STAGNATION) وہی اس کا "جحیم" ہے۔

مگر کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

ارتقائے انسانیت کا یہ وہ راز ہے جس کی پردہ کشائی عصرِ حاضر کے مؤرخینِ تہذیب و تمدن کی تحقیقات کئے جا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں اس کے لئے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لئے تو (شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا) خود اپنے گھر کی شہادت کافی ہے۔ یعنی خود مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ اسی حقیقت

ہمارے عروج و زوال کے اسباب

کی مظہر ہے۔ جب سرزمینِ حجاز کے مٹھی بھر انسانوں نے قرآن کی اس حکمتِ بالغہ کو سمجھ لیا تو انہوں نے پہلے ایک ایسی جماعت تیار کی جس میں حاکم و محکوم، بلند اور پست، امیر اور غریب، عربی اور عجمی کے تمام امتیازات مٹا کر انہیں اُمتِ واحدہ بنا دیا۔ جس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ایک فرد کی صلاحیتوں کے ماحصل اور محنت کی کمائی میں تمام افراد برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ قرآن نے فاتحۃ الکتاب کے بعد پہلی سورت کی ابتدا میں ان افراد کی جو خصوصیات بتائی ہیں، ان میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲/۳) انہیں جو کچھ ہماری طرف سے ملتا ہے وہ اسے دوسروں کی بہبودی کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ اس کھلا رکھنے کی حد کیا ہے، اس کے متعلق آگے چل کر بتایا۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ: یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر حصہ دوسروں کے لئے کھلا رکھیں؟ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ ان کا تو انہیں حکم دیا گیا تھا۔ لیکن وہ عند الضرورت اس سے بھی آگے بڑھ جاتے تھے۔ وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) وہ خود تنگی میں گذارہ کر لیا کرتے تھے لیکن دوسروں کی ضروریات کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے تھے۔ آج ہمارے لئے یہ سوال بھی معمہ بن گیا ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔ اور

اگر کسی سے کہہ دیا جائے کہ اس نظام میں فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہتی تو اُسے اس میں کمیونزم کے

قرآن کا معاشی نظام

جراثیم دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر قرآن کے اس فلسفہ کو سمجھ لیا جائے جو اُس نے ارتقائے انسانیت کے سلسلہ میں بیان کیا ہے تو اس کے معاشی نظام کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اس کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر کوئی فرد، گروہ یا قوم اپنی استعداد کے ماحصل کو اپنے آپ تک محدود رکھتی ہے تو ایک حد تک پہنچنے کے بعد وہ فرد، گروہ یا قوم آگے بڑھنے کے قابل نہیں رہتی۔ اسے وہ بخل کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے۔ وَمَنْ يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَفْسِهِ (۴۷/۳۸) جو روک کر رکھتا ہے وہ خود اپنی ذات کی ترقی کو روک دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو فرد، گروہ یا قوم دوسروں کی نشوونما کی فکر کرتی ہے اس کی اپنی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ وَمَنْ تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ۔ (۳۵/۱۸) یہ تھا قرآنی تعلیم کا وہ اصل الاصول جسے سرزمین حجاز کی اس مختصر سی جماعت نے سمجھ لیا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی ترقی حدود فراموش اور قیود ناآشنا ہو گئی۔ اس میں نہ کوئی راز نہانہ تھا، نہ کوئی ناقابلِ فہم نظریہ تھا، نہ ماورائے عقل فارمولا۔ بعد کے آنے والوں نے اس قانون کو نظر انداز کر دیا۔ انفرادی طور پر ہر شخص نے مال اور دولت

بعد میں کیا ہوا

کو اپنی اور اپنے خاندان کی حدود کے اندر مقید کر دیا۔ قوم میں ایک طبقہ حکمرانوں کا بن بیٹھا اور اس طرح اقتدار و اختیار ایک خاص گروہ کے اندر محدود ہو کر رہ گیا۔ اور آگے بڑھے تو پوری قوم نے اپنے آپ کو سلطنت کی چار دیواری میں مقید کر کے عالمگیر انسانیت کے تصور کو نظر انداز کر دیا۔ یہ دنیا داروں کی حالت تھی۔ "اللہ والوں" نے روحانی ترقی کے لئے اپنے آپ کو خانقاہوں کی چار دیواری میں محبوس کر کے باقی انسانیت سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔ اربابِ شریعت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر ہر شخص اپنی اپنی جگہ نیک نیت بن جائے تو اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ قوم جس مقام پر تھی وہیں منجمد (FOSSILISED) ہو کر رہ گئی۔ یہ وہ جحیم (رک جانے کا مقام) ہے جس میں قوم اب تک مبتلا چلی آ رہی ہے۔ کسی قوم کے ایک مقام پر رُک جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے، کہ

تقلید

کہ اس قوم کی عقل و فکر کی صلاحیتیں نشوونما پانے سے رُک گئی ہیں۔ یعنی وہ قوم سمجھ سوچ سے کام لینے کے قابل نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اہل جہنم کی زبان سے یہ کہلوایا ہے۔ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ (۶۷/۱۰) اگر ہم اپنی عقل و فکر سے

کام لیتے رہتے تو اہلِ جہنم میں سے نہ ہوتے۔

عقل و فکر سے کام نہ لینے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ قوم اس حد کو جس تک پہنچ کر اُن کی ترقی رُکی تھی، ارتقائے انسانیت کی آخری حد سمجھ لیتی ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتی ہے کہ دنیا خواہ کتنی ترقی کیوں نہ کر جائے وہ ہماری حد تک کبھی نہیں پہنچ سکتی۔ اس طرح وہ اپنے جہنم کو جنت سمجھ لیتی ہے اور اس سے کبھی نکلنا نہیں چاہتی۔ یا یوں کہیئے کہ اسے اپنا جہنم نظر ہی نہیں آتا، اس لئے کہ جہنم تو اس کے سامنے اُبھر کر آتا ہے جو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰی (۷۹/۳۶)

———(۵)———

یہ تھا، برادرانِ عزیز! وہ ضمنی نکتہ جو اس سوال کے سلسلہ میں سامنے آگیا تھا کہ قرآنِ کریم عالمگیر انسانیت پر اس قدر زور کیوں دیتا ہے۔ چونکہ ہم اس ضمنی نکتہ کے سلسلہ میں اپنے موضوع سے بہت دور نکل آئے ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ داستان کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے مناسب ہوگا کہ مختصر الفاظ میں دہرا دیا جائے کہ بات کیا ہو رہی تھی، اور سلسلہ کلام کہاں تک پہنچا تھا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ

نظرِ بازگشت

(۱) سیکولر اسٹیٹ اور دینی مملکت میں فرق یہ ہے کہ سیکولر اسٹیٹ کے پیشِ نظر اپنی قوم یا ملک کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے اور اس کے لئے مصلحتِ وقت (EXPEDIENCY) اس کا اصولِ کار۔ اس کے برعکس دینی مملکت ان غیر متبدل اصولوں یا مستقل اقدار کے تحفظ اور عملی تنفیذ کے لئے وجود کوش ہوتی ہے جن میں تمام نوعِ انسانی کی فلاح و سعادت اور نشوونما ارتقاء کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔

(۲) یہ غیر متبدل اصول نہایت واضح انداز میں قرآنِ کریم میں دے دیئے گئے ہیں۔ اسلامی مملکت کا آئین انہی اصولوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

خوف و حزن

قرآنِ کریم نے اس مملکت کے ماحصل کو چار لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۳۸) جو لوگ خدا کی رہنمائی میں چلیں گے، وہ خوف اور حزن سے محفوظ رہیں گے۔ خوف سے محفوظ و مامون رہنا سیاسی صیانت (POLITICAL SECURITY) ہے اور حزن سے محفوظ رہنا معاشی

آزادی (ECONOMIC INDEPENDENCE) - اس مملکت میں نہ کسی قسم کا سیاسی استبداد ہوگا اور نہ معاشی احتیاج۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

حکومت کی ہیئت

جہاں تک حکومت کی ہیئت (FORM OF GOVERNMENT) کا تعلق ہے، قرآن اس کا تعین نہیں کرتا، لیکن اس کے لئے ایک غیر متبدل اصول بیان کرتا ہے۔ یعنی اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) امورِ مملکت امت کے باہمی مشورے سے طے پائیں گے۔ اسلامی مملکت میں نظمِ حکومت کسی خاص فرد، گروہ، طبقہ یا خاندان کی اجارہ داری میں نہیں رہتا۔ یہ اُمت کی امانت ہوتا ہے، جسے وہ اپنے نمائندگان کے سپرد کرتی ہے (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ان نمائندگان کا معیار یہ ہوتا ہے کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۴۹/۱۳) جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کا پابند ہوگا وہ سب سے زیادہ واجب التکریم ہوگا۔ اُمت کے یہی نمائندے قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے .... کے تقاضوں کے مطابق مملکت کے لئے جزئی قوانین وضع کریں گے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اسلامی حکومت نہ کسی خاص وضع کا نام ہے نہ کسی خاص پیکر کا عکس۔ وہ قرآن کی متعین کردہ مستقل اقدار کے حفظ و نشر کا ذریعہ اور ان کی عملی تشکیل و تنفید کی مشینری ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ جن ذرائع کو اختیار کرے وہ اسلامی کہلائیں گے۔ بشرطیکہ وہ ذرائع بھی قرآنی اصولوں سے نہ ٹکرائیں۔ قرآنی اقدار کو برقرار رکھتے ہوئے جو انداز بھی اختیار کر لیا جائے وہ اسلامی ہوتا ہے۔

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

آئین سازی میں دشواریاں

ان تصریحات کی روشنی میں، رفیقانِ من! سوچئے کہ کیا اسلامی آئین کی تدوین و ترتیب میں کسی قسم کی دشواری پیش آسکتی ہے؟ اس سلسلہ میں جس قسم کی دشواریاں ہمارے سامنے آتی ہیں وہ سب ہماری اپنی پیدا کردہ ہیں۔

— کچھ دانستہ — کچھ نادانستہ — اس باب میں ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم نے اسلام سمجھ رکھا ہے ان رسومات اور فقہی جزئیات کو جو ہمارے اس دور کی وضع یا اعتبار کردہ ہیں جب ملت کی گاڑی دین کی پٹڑی سے اتر کر دوسری پٹڑی پر جا پڑی تھی۔ جب تک ہم اس غلط فہمی سے نہیں نکلیں گے اور مروجہ اسلام کو حقیقی اسلام سمجھتے رہیں گے، اسلامی آئین کا تصور تک بھی ہمارے سامنے نہیں آسکے گا۔ جو حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ جس 'مذہب' کے متعلق وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اسے مملکت کی بنیاد قرار دے لیا تو ہم زندہ اقوام کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہیں گے' وہ غیر قرآنی مذہب ہے۔ قرآن کا عطا کردہ دین اپنے متبعین کو اقوام عالم کی امامت (LEADER-SHIP) کی ضمانت دیتا ہے۔

مذہب زندہ دلاں خواب پریشانے نیست
ازہمیں خاک جہانِ دگرے ساختن است

اور جب یہ حقیقت ہے کہ ہمارا مروجہ مذہب حقیقی اسلام نہیں تو اس مذہب کے علمبرداروں کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ وہ ہمیں اسلامی آئین مرتب کرکے دے دینگے، کتنی بڑی خود فریبی ہے۔

خدا جانے یہ کس نے کہہ دیا ہے کم سوادوں سے
کہ جو تیشہ اٹھا لیتا ہے وہ فرہاد ہوتا ہے

اسلامی آئین کی تدوین کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان قرآن کے غیر متبدل اصولوں کو اچھی طرح

علماء اور آئین

جاننے اور اپنے زمانے کے تقاضوں سے باخبر ہو۔ جہاں تک ہمارے علماء حضرات کا تعلق ہے وہ بدقسمتی سے ان دونوں سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اسلامی آئین کی تدوین کے لئے ان حضرات کی طرف رجوع کرنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں بیچارے یہ دو رکعت کے امام

قرآن کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (۴/۵۸)۔ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتوں کو ان کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں۔ تدوین آئین کا مسئلہ قوم کی بہت بڑی امانت ہے۔ اسے ایسے لوگوں کے سپرد کر دینا جن میں اس کی اہلیت وصلاحیت نہیں' امانت

میں خیانت ہے۔ ہم نے نو برس تک یہ غلطی کی اور اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ اگر اس کا پھر اعادہ کیا گیا تو اس کی سزا اس سے کہیں زیادہ سخت ہو گی۔

اس مقام پر میں اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں جب "ارباب مذہب" پر تنقید کرتا ہوں تو میرا روئے سخن خاص افراد کی طرف نہیں ہوتا۔ اس سے میرا مقصد مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کا ادارہ (INSTITUTION) ہوتا ہے جس کی اسلام میں کہیں گنجائش نہیں۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے ان میں کئی ایسے ہیں جن کی سیرت و کردار کی بنا پر میرے دل میں ان کی بڑی عزت ہے۔

لوگ نیک بن جائیں تو مملکت اسلامی بن جائے

اسلامی آئین کے سلسلہ میں بعض گوشوں سے یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ اگر لوگ سچے مسلمان بن جائیں۔ نیک بن جائیں۔ دیانتداری کی زندگی بسر کرنے لگ جائیں تو مملکت خود بخود اسلامی ہو جائے گی۔ یہ منطق بڑی دلچسپ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی ملک کے ارباب بست و کشاد سے کہے کہ صاحب! حکومت کی مشینری کو درست کیجئے تاکہ جرائم ختم ہو جائیں۔ قانون کا احترام پیدا ہو اور لوگ امن کی زندگی بسر کریں اور اس کے جواب میں وہ یہ کہہ دیں کہ اگر لوگ قانون کا احترام کرنے لگ جائیں، جرائم سے باز آجائیں، پُرامن شہریوں کی حیثیت سے رہنے لگ جائیں تو حکومت خود بخود اچھی ہو جائے گی۔ قرآن اس باب میں ایک عظیم نکتہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں تک عام ضابطۂ اخلاق کا تعلق ہے، وہ ہر جگہ قریب قریب یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ جھوٹ بولو۔ چوری کرو۔ لوٹ مچاؤ۔ لوگوں پر ظلم کرو۔ بد دیانت بنو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے برعکس، ہر جگہ یہی کہا جاتا ہے کہ سچ بولنا۔ چوری نہ کرنا۔ کسی پر ظلم نہ کرنا۔ دیانتداری کی زندگی بسر کرنا بہت اچھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتے۔ مذہب اپنا فریضہ اتنا ہی سمجھتا ہے کہ وہ وعظ و نصیحت کے ذریعے لوگوں کو نیک بننے کی تلقین کرے۔

انفرادی اصلاح

قرآن کہتا ہے کہ محض وعظ و نصیحت سے لوگ نیک نہیں بن سکتے۔ اس لئے نہیں کہ لوگوں پر وعظ و نصیحت کا اثر نہیں ہوتا یا وہ نیک بننے

کے آرزو مند نہیں ہوتے۔ بجز چند مستثنیات جس میں سرکش طبائع دانستہ قانون شکنی کرتی ہیں، لوگ صحیح روش زندگی پر چلنے کے متمنی ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ صحیح روش پر چل نہیں سکتے۔ اس میں ان کا قصور نہیں ہوتا۔ ایک غلط معاشرہ میں صحیح روش پر چلنا ناممکن نہیں تو محال ضرور ہوتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے اندر چند انفرادی خوبیاں پیدا کرلے لیکن اجتماعی امور میں انفرادی اصلاح کبھی کارگر نہیں ہوتی اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ ایک معاشرہ قائم کیا جائے جس میں لوگوں کے لئے صحیح روش کے مطابق زندگی بسر کرنا نہ صرف آسان بلکہ آسائش بخش ہو جائے۔ یعنی جس طرح غلط معاشرہ میں صحیح روش پر چلنے والے کے راستے میں قدم قدم پر مشکلات حائل ہوتی ہیں اسی طرح صحیح معاشرہ میں غلط روش اختیار کرنے والے کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے اور صحیح راستے پر چلنا اس طرح آسان ہو جائے جس طرح پانی کے لئے نشیب کی طرف بہنا۔ قرآن اہلِ مذاہب سے کہتا ہے مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (۲/۴۱)

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ

کہ میں نہ صرف یہ کہ ایک مکمل ضابطہ حیات لایا ہوں بلکہ اس ضابطہ میں سے جو کچھ تمہارے پاس موجود ہے، اسے سچ کر کے دکھانے کا پروگرام بھی ساتھ لایا ہوں۔ مثلاً تم بھی یہ کہتے ہو کہ ظلم کی کھیتی پنپا نہیں کرتی۔ اور میرے ضابطہ حیات کا بھی ایک دعوے یہ ہے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۲۱) خدا ظالم کی کشتِ حیات کو کبھی سرسبز نہیں ہونے دیتا۔ تمہاری وعظ و نصیحت کے باوجود ظالموں کی کھیتیاں سرسبز ہوتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن میں جو عملی پروگرام اپنے ساتھ لایا ہوں اس میں یہ حقیقت سچ بن کر سامنے آجاتی ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ اس عملی پروگرام کا نام قرآنی معاشرہ یا اسلامی مملکت ہے۔ انفرادی طور پر یہ ناممکن ہوتا ہے کہ انسان دنیا کو صحیح راستے پر چلا سکے۔ شر کی قوتیں اتنی شدید ہوتی ہیں کہ انفرادی طور پر ان کا مقابلہ کیا نہیں جا سکتا۔ قرآن حقائق کا سامنا کرتا ہے۔ (FACTS) کو (FACE) کرتا ہے۔ اس لئے

رہبانیت سے مقصود

وہ فرد سے ایسی باتیں کہتا ہی نہیں جن کا پورا کرنا اس کی انفرادی وسعت کے بس کی بات نہ ہو۔ رہبانیت کے متعلق قرآن کا اعلان یہ ہے کہ یہ خدا کا تجویز کردہ پروگرام نہیں، یہ ذہنِ انسانی کا پیدا کردہ مسلک ہے۔ رہبانیت سے مفہوم جنگلوں میں جا کر سنیاسیوں کی زندگی بسر کرنا نہیں۔ اس کے معنی ہیں اجتماعی زندگی کے بجائے انفرادی زندگی بسر کرنا۔ ہر فرد کا اپنے اپنے طور پر نیک بننے کی کوشش کرنا۔ قرآن اسے غیر خداوندی طریقِ زندگی قرار

دے کر اجتماعی زندگی کو صحیح روش بناتا ہے۔ اسی کو اسلامی مملکت کہتے ہیں۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلامی مملکت تمام لوگوں کو ڈنڈے کے زور سے نیک نہیں بناتی۔ ڈنڈے کا استعمال تو

اسلامی مملکت کیسے نیک بناتی ہے

صرف ان کے لئے ہوتا ہے جو دیدہ دانستہ قانون کے خلاف سرکشی برتنے پر اتر آئیں۔ اس کے پاس لوگوں کو نیک بنانے کا پروگرام اور ہوتا ہے۔ اس میں سب سے پہلے، بچوں کی تعلیم و تربیت کا صحیح نظام قائم کیا جاتا ہے۔ پھر ایسی فضا پیدا کی جاتی ہے جس میں انسان غیر شعوری طور پر قانون کا احترام کرنا سیکھے۔ پھر حالات ایسے پیدا کئے جاتے ہیں جن میں کسی کو حصولِ مقصد کے لئے ناجائز ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ بلکہ یوں کہیے کہ ناجائز ذریعہ سے مقصد حاصل ہی نہ ہو سکے۔ مثال کے طور پر، قرآن کا معاشی نظام لیجیے جس میں ہر فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے اور کسی کے پاس فاضلہ دولت جمع نہیں ہونے پاتی۔ آپ غور کیجیے کہ اس نظام میں کسی کو ناجائز ذرائع استعمال کرنے کی ضرورت کہاں پڑتی ہے یا اس کی گنجائش کہاں ہوتی ہے؟ جب رسول اللہ نے دینی مملکت قائم کی تھی تو وہ (معاذ اللہ) ہوسِ ملک گیری کی تسکین کا سامان نہیں تھی۔ وہ اس لئے ضروری تھی کہ اجتماعیت کے بغیر اسلامی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں تھا۔ حتیٰ کہ السابقون الاولون کا جو گروپ، اس مملکت کے قیام کے لئے کوشاں تھا، وہ بھی انفرادی زندگی بسر نہیں کرتا تھا، اجتماعی زندگی بسر کرتا تھا۔ لہٰذا معاشرہ کی اجتماعی زندگی (یعنی نظامِ مملکت) کے بغیر، لوگوں کو نیک بننے کی تلقین کرنا، رہبانیت کی تعلیم ہے۔ اسلام کی نہیں۔ یاد رکھیے۔ دین اخلاق و سیاست کے مجموعہ کا نام ہے۔ جب دین سے سیاست الگ ہو جاتی ہے تو دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے اور سیاست چنگیزیت بن جاتی ہے۔ ہمارے قرنِ اول کے دینی نظام کے بعد یہی ہوا۔ اسلامی مملکت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور دین کی جماعتی زندگی کی جگہ مذہب کی انفرادی زندگی نے لے لی۔ دین نے اسلامی زندگی کا دوسرا نام تمسک بالجماعت

تمسک بالجماعت سے مفہوم

بنایا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ دینی مملکت (یعنی قرآنی نظامِ معاشرہ) کے بغیر اسلامی زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ مذہب نے جماعت اور اس سے تمسک کے الفاظ کو تو برقرار رکھا لیکن اس کا مفہوم رہ گیا جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا۔ اب جو شخص کہتا ہے کہ میں جماعت کے ساتھ شامل تھا تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ میں نے

نماز باجماعت ادا کی تھی۔ حالانکہ نماز باجماعت خود اسلام میں اجتماعی زندگی (یعنی دینی مملکت) کی سمٹی ہوئی شکل (MINIATURE FORM) تھی۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ یہ کہنا کہ لوگ اسلامی طریق کے مطابق زندگی بسر کرنے لگ جائیں تو مملکت خود بخود اسلامی بن جائے گی، گاڑی کو گھوڑے کے آگے رکھنے کے مرادف ہے۔ پہلے مملکت اسلامی بنتی ہے اس کے بعد لوگ اسلامی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ لوگ پہلے صحیح معنوں میں مسلمان بن جاتے ہیں اور پھر مملکت خود بخود اسلامی ہوجاتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مملکت کا فریضہ ہے۔ اگر لوگ اپنے اپنے طور پر معروف پر کاربند ہو سکتے اور منکر سے محترز رہ سکتے تو مملکت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اسلام میں دین، جماعت، معاشرہ، نظام، قرآنی مملکت سب ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں۔

جوشِ شباب، نشۂ صہبا، ہجومِ شوق!!
تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

فرقے اور آئین سازی

برادرانِ عزیز! اب مجھے، تدوینِ آئین کے سلسلہ میں ایک اور اہم سوال کے متعلق مختصر الفاظ میں کچھ عرض کرنا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ مسلمانوں میں بہتر فرقے ہیں اور ہر ایک کی اسلام کی تعبیر الگ الگ ہے۔ ان حالات میں اسلامی آئین بنایا کس طرح جا سکتا ہے؟ اربابِ مذہب کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ فرقوں کی موجودگی سے اسلام پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ دیکھئے ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں کے اکتیس علماء کراچی میں اکٹھے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے متفقہ طور پر ایک آئین کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے مطابق ۱۹۵۶ء کا آئین مرتب بھی ہوگیا تھا۔ جس کے اسلامی ہونے پر تمام علماء کا اتفاق تھا۔ اس بات کا، اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ فرقوں کے باوجود متفق علیہ اسلامی آئین مرتب ہو سکتا ہے۔

یہ سوال اور اس کا یہ جواب دونوں قابلِ غور ہیں۔

فرقہ بندی شرک ہے

پہلا قابلِ غور نکتہ ہے کہ کیا فرقے اور اسلام یکجا جمع ہو سکتے ہیں؟ کیا ایسے معاشرہ کو اسلامی کہا جاتا ہے جس میں مسلمانوں کے فرقے

موجود ہوں۔ قرآن کا جواب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا جس طرح شرک اور توحید ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسی طرح فرقے اور اسلام باہمدگر نقیض ہیں۔ قرآن کا تمام مسلمانوں سے مطالبہ یہ ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲) تم سب مل کر، اکٹھے ہو کر، اجتماعی طور پر رشتۂ خداوندی کو تھامے رکھو اور فرقوں میں مت بٹ جاؤ۔ اس سے ایک آیت آگے ہے۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۔ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۔ (۳/۱۰۴) دیکھنا تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے، خدا کی طرف سے واضح دلائل آجانے کے بعد، فرقے پیدا کر لئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگ گئے۔ ایسا کرنے والے بہت بڑے عذاب میں ماخوذ ہو جاتے ہیں۔

(ب) سورۂ توبہ میں جہاں مسجد ضرار کی تعمیر کا ذکر آیا ہے تفریق بین المومنین کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایسی مسجد کو خدا اور رسول کے دشمنوں کی پناہ گاہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔

(ج) فرقہ بندی کو کفر ہی نہیں، بلکہ بالالفاظ صریح شرک قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ روم میں ہے۔ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۱-۳۲) مسلمانو! دیکھنا تم کہیں مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ پھر ہر فرقہ یہ سمجھنے لگ گیا کہ ہم حق پر ہوں اور باقی سب باطل پر ہیں' اور سب فریب نفس میں مگن ہو کر رہ گئے۔

برادرانِ عزیز! وقت کی کمی کی وجہ سے میں قرآن کریم کی ان تمام آیات کو سامنے نہیں لا سکتا، جن میں اختلاف کو خدا کا عذاب اور فرقوں کو دین کی ضد قرار دیا گیا ہے۔ آپ انہی چند آیات کو سامنے رکھیے اور پھر سوچیے کہ یہ کہنا کہ فرقوں کی موجودگی سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑتا، مسلمان، فرقوں میں بٹنے کے باوجود سچے اور پکے مسلمان رہ سکتے ہیں۔ دین سے کتنی بڑی سرکشی اور خدا سے کیسی کھلی ہوئی بغاوت ہے؟ خدا کا ارشاد ہے کہ فرقہ بندی عذاب ہے۔ کفر ہے۔ شرک ہے۔ اور ان حضرات کا کہنا ہے کہ نہیں! اختلاف خدا کی رحمت ہے۔ تفرقہ عین اسلام ہے۔ فرقے توحید پرستی کی علامت ہیں۔ سوچیے کہ کیا یہ قرآن کی کھلی ہوئی تردید اور خدا کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں؟

اکتیس علماء کا مطالبہ ان حضرات کا کہنا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں کے اکتیس علماء

اکٹھے ہوتے تھے اور انھوں نے ایک متفق علیہ آئین کا مطالبہ کیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ مطالبہ کیا تھا؟ یہ تھا کہ

(i) مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ اور

(ب) شخصی معاملات (PERSONAL LAWS) میں ہر فرقے کو، کتاب و سنت کی جداگانہ تعبیر کی آزادی دی جائے۔

شخصی قانون

شق دوم کے متعلق میں صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کتاب یا سنت سے کوئی ثبوت بھی اس امر کا پیش کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں شخصی معاملات اور غیر شخصی معاملات میں کسی قسم کی تمیز و تفریق ہو سکتی ہے۔ یہ ثنویت (DUALISM) یکسر غیر اسلامی اور دورِ ملوکیت کی ایجاد ہے جسے یہ حضرات اسلامی آئین کا جزو قرار دے رہے ہیں۔

شقِ دوم کے متعلق اس مختصر سے اشارے کے بعد شقِ اول (یعنی فرقہ بندی) کی طرف آیئے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رُو سے فرقوں کا وجود کفر و شرک ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن، فرقوں کے مٹانے کا طریق کیا بتاتا ہے؟

یہ حقیقت بادنیٰ تامل سمجھ میں آجائے گی کہ اس وقت ہماری حالت بعینہٖ وہی ہے جو نزولِ قرآن کے وقت اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کی تھی۔ ان کے انبیاء نے انھیں ایک اُمت بنایا تھا لیکن انہوں نے باہمی ضد اور سرکشی سے فرقے پیدا کر لئے (۲/۲۱۳)۔ ان کے اختلافات مٹانے کے لئے قرآن نازل ہوا۔

قرآن اختلاف مٹانے کیلئے آیا تھا

چنانچہ سورۃ نحل میں ہے۔ وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ .... (۱۶/۶۴) اے رسول! ہم نے تیری طرف اس کتاب کو اس لئے نازل کیا ہے کہ تو ان باتوں کو سامنے ابھار کر لے آئے جن میں یہ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔ اور خود مسلمانوں سے کہہ دیا کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (۴۲/۱۰)۔ جس بات میں تمہیں اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ (یعنی اس کی کتاب) سے کرا لیا کرو۔ اس سے ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کا ایک بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ تمام دینی معاملات میں اختلافات مٹانے کا معیار بنے اور مسلمانوں کو امتِ واحدہ بنائے۔

اس مقام پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے ہر فرقے کا دعویٰ یہ ہے کہ اُس کا مسلک قرآن کے مطابق ہے۔ جب صورتِ حالات یہ ہو تو پھر قرآن سے اختلاف کس طرح مٹائے جا سکتے ہیں؟ یہ سوال اہم ہے۔ لیکن قرآن اس کا بھی جواب دیتا ہے۔

قرآن میں اختلاف نہیں

پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کا دعوے کہ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴/۸۲) اگر قرآن خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے۔ یعنی قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی (ایک) دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ لہذا یہ ناممکن ہے کہ قرآن (بہتر تو ایک طرف) دو فرقوں کے متضاد مسالک کی بھی تائید کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے کہ (قرآن بہتر فرقوں میں سے ہر ایک کے مسلک کی تائید کرتا ہے) تو وہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے سے انکار کرتا ہے۔

لیکن وہ سوال ابھی اپنی جگہ پر باقی ہے کہ قرآن اس کا عملی طریق کیا بتاتا ہے کہ امت میں اختلافات پیدا ہی نہ ہوں اور اگر (بدقسمتی سے) اختلاف پیدا ہو جائے تو اُسے مٹایا کس طرح جاتے؟ اس عملی حل کی تفاصیل اس کے مختلف مقامات میں برگِ لالہ و گل کی طرح بکھری پڑی ہیں لیکن اس نے ان تفاصیل کو سورۃ آلِ عمران کی ایک آیت میں اس حسن و خوبی سے سمٹا دیا ہے کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، روح وجد میں آ جاتی ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رُو سے اختلاف سازی اور فرقہ بندی کفر ہے۔ وہ کہتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ (۳/۹۹)

عملی طریق

اے مسلمانو! اگر تم نے اہلِ کتاب کے کسی فرقے کی اطاعت کر لی۔ اگر اس کی روش پر چل پڑے تو یاد رکھو۔ وہ تمہیں ایمان کے بعد، کفر کی طرف لوٹا دینگے۔

اس کے بعد ہے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ
وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (۳/۱۰۰)

لیکن تم کس طرح کفر کر سکتے ہو؟ تم ایک امت بننے کے بعد، فرقوں میں کس طرح بٹ سکتے ہو۔ اس لئے کہ تم وہ ہو کہ

(۱) قوانینِ خداوندی تمہارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اور

(۲) اس کا رسول تمہارے اندر موجود ہے۔

یاد رکھو. جو اسطرح سر رشتۂ خداوندی کو محکم طور پر تھامے رکھے تو اس کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی ہوتی رہے گی۔

اس سے واضح ہے کہ قرآن نے اُمت میں وحدت قائم رکھنے کے لئے دو چیزوں کا موجود رہنا ضروری بتایا۔ ایک کتاب اللہ اور دوسرا رسول۔ اس کے لئے اس نے مسلمانوں سے کہا کہ اِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ..... (۴/۵۹) اگر تم میں کسی معاملہ میں تنازعہ ہو جائے تو اسے رسول کے پاس لیجاؤ۔

وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ

تاکہ وہ تمہیں بتائے کہ اس باب میں اللہ کا حکم کیا ہے۔ دوسری طرف رسول سے کہا کہ جب یہ اپنے اختلافی امور تمہارے پاس لائیں تو فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ (۵/۴۸)۔ ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرو۔ اس کے بعد اگر کوئی تفرقہ پیدا کرے تو اُس سے کہہ دو کہ تمہارا اُس سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ (۶/۱۶۰) جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کریں اور اس طرح ایک فرقہ بن کر بیٹھ جائیں۔ اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ تیری اُمت سے کٹ کر الگ ہو گئے۔ وہ مسلمان نہیں رہے۔

یہ تھا اُمت میں وحدت قائم رکھنے کا عملی طریق۔ یعنی رسول کی موجودگی جو اختلافی امور میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے دے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ رسول نے تو بہر حال اپنی عمرِ طبیعی کے بعد دنیا سے تشریف لے جانا تھا۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اُمت کی وحدت، رسول اللہ کی دنیاوی زندگی تک ہی رہ سکتی تھی۔

رسول اللہ کے بعد

اس کے بعد اس کی کوئی صورت ہی نہ تھی؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں، تم بات کو صحیح طور پر سمجھے نہیں۔ یہ نظام رسول اللہ کی وفات کے ساتھ ختم نہیں ہو جائے گا۔ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤی اَعْقَابِكُمْ ..... (۳/۱۴۴)۔ محمد بجز اس نیست کہ اللہ کے ایک رسول ہیں۔

ان سے پہلے بھی کئی رسول ہو گذرے ہیں. تو کیا اگر وہ کل کو وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام ان کی زندگی تک محدود تھا، تم اپنی سابقہ روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ ایسا نہیں ہو گا. یہ نظام بدستور قائم رہے گا. رسولؐ کی وفات کے بعد اس کا جانشین (خلیفہ) جو اُمت کے باہمی مشورہ سے منتخب ہو گا، اس کا قائم مقام بن جائے گا اور جو فرائض رسول (بہ حیثیت مرکزِ ملت) سرانجام دیتا تھا وہ فرائض اُس کا جانشین سرانجام دے گا. اس وقت تمام اختلافی امور کا فیصلہ، کتاب اللہ کی روشنی میں، خلیفۃ الرسول کرے گا اور اس طرح وَ اَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ اٰیَاتُ اللّٰہِ وَ فِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ۔ کا عملی نظام قائم رہے گا. چنانچہ خلیفۂ اول، حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے عہد خلافت میں جب مسلمانوں کے ایک گروہ نے زکوٰۃ کے مسئلہ میں اختلاف کیا اور سمجھانے کے باوجود اپنے اختلاف پر قائم رہے تو اُن کے خلاف جہاد کیا گیا اور اُمت کی وحدت میں فرق نہیں آنے دیا. اُس وقت اگر خلیفۃ الرسول موجود نہ ہوتے تو اسی مسئلہ پر اُمت میں دو فرقے پیدا ہو جاتے۔

اُمت کی وحدت اُس وقت تک رہی جب تک وَ فِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ کا یہ نقشہ قائم رہا. لیکن

جب یہ نقشہ بگڑ گیا

جب مسلمانوں میں ملوکیت آگئی تو سیاسی اقتدار، حکمرانوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور شخصی معاملات (نکاح. طلاق وغیرہ سے متعلق مسائل) اربابِ مذہب کی تفویض میں آگئے. امورِ مملکت میں اختلاف کرنے والا سلطنت کا باغی قرار پاتا تھا اس لئے اس کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی تھی. مذہب یتیم تھا اس لئے جس کا جی چاہتا اس میں اختلاف پیدا کر کے ایک نیا فرقہ بنا ڈالتا. کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ اٰیَاتُ اللّٰہِ وَ فِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ کی آیت اُن کے سامنے تھی. لیکن اب اس کا مفہوم بدل گیا تھا. اب تُتْلٰی عَلَیْکُمْ اٰیَاتُ اللّٰہِ کا مطلب تلاوت قرآن کریم لے لیا گیا. باقی رہا وَ فِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ تو اس کے لئے یہ سوچا گیا کہ رسول اللہ کی احادیث اکٹھی کر لی جائیں اور اپنے اپنے طور پر ان پر عمل کر لیا جائے۔ اس طریق کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اُمت میں فرقے پیدا ہوتے. یہی مسلک اس وقت تک چلا آرہا ہے. اور اسے عین دین سمجھ لیا گیا ہے. اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وَ فِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ کا یہ مطلب نہیں. اس کا مطلب یہ ہے کہ اُمت میں زندہ جانشینِ رسول کا موجود رہنا ضروری ہے جو مرکزِ ملت کی حیثیت سے دین کا عملی نظام قائم رکھے. تو شور مچا دیا جاتا ہے کہ یہ دین میں فتنہ ہے. ان کا شور مچانا تعجب انگیز نہیں.

جب کوئی قوم عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دے تو اس کے پاس شور مچانے کے علاوہ کوئی اور دلیل نہیں رہ جاتی۔ (بچے کے پاس یہی ایک حربہ ہوتا ہے جس سے وہ اپنا ہر مقصد پورا کرتا ہے)

بہرحال۔ ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ قرآن کریم کی رو سے اختلافات مٹانے کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ یہ کہ اُمت میں ایک زندہ مرکز موجود ہو جو تمام اختلافی امور کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کرے اور جو اس فیصلہ سے انحراف کرے اُسے ملت کے دائرہ سے باہر نکال دیا جائے۔ لہٰذا، اُمت کے لئے اب کرنے کا کام یہ ہے کہ جانشینیٔ رسولؐ کا جو سلسلہ ٹوٹ گیا تھا اس کا دوبارہ

خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا احیاء

احیاء کیا جائے۔ اسی کا نام خلافت علیٰ منہاج رسالت یا اسلامی مملکت کا قیام ہے۔ اس مملکت کا کام یہ ہو گا کہ جو کچھ ہمارے پاس دین کے نام سے چلا آ رہا ہے. قرآن کریم کی روشنی میں اس کا جائزہ لے۔ جو کچھ اس کے مطابق ہو اُسے برقرار رکھے۔ جو اس کے خلاف جائے اسے مسترد کر دے اور اس طرح بتدریج اُمت میں پھر اسی قسم کی وحدت پیدا کر دے جو رسول اللہؐ کے زمانے میں موجود تھی۔ یہ ہے برادرانِ عزیز! اس سوال کا جواب کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی آئین کیسے بن سکتا ہے اور فرقوں کی موجودگی اسلام

سیاسی پارٹیاں

پر اثرانداز ہوتی ہے یا نہیں۔ اس مقام پر اتنی وضاحت اور ضروری ہے کہ جو کچھ قرآن نے مذہبی فرقوں کے متعلق کہا ہے وہی حکم سیاسی پارٹیوں کے متعلق ہے۔ دین میں مذہب اور سیاست الگ الگ شعبے نہیں ہوتے۔ اُمت میں تفرقہ بہرحال اسلام کے خلاف ہے خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں۔ اسلامی مملکت میں مسلمانوں کی دو پارٹیاں ہو نہیں سکتیں۔

اب مجھے صرف ایک نکتہ اور پیش کرنا ہے۔ جب آئینِ پاکستان کی تدوین کا مسئلہ زیرِ غور تھا تو ہم

کتاب و سنّت

نے تجویز کیا تھا کہ آئین میں یہ شق ہونی چاہیئے کہ پاکستان میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو کتاب اللہ کے خلاف ہو۔ اس پر یہ کہا گیا کہ یہ سنت رسول اللہؐ کا انکار ہے۔ آئین میں یہ شق رکھنی چاہیئے کہ پاکستان کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس فرق کو ذرا واضح طور پر بیان کر دوں کیونکہ اسلامی آئین کے سلسلے میں یہ سوال

پھر سامنے آئے گا۔ کسی معاملے کے متعلق اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کوئی آیت پیش کرے تو اس کے متعلق دنیا کا کوئی مسلمان (خواہ وہ کسی فرقے سے متعلق کیوں نہ ہو) یہ نہیں کہہ سکے گا کہ وہ قرآن کی آیت نہیں۔ اس کے برعکس، حدیث کی کیا پوزیشن ہے، اس کے متعلق، کسی منکرِ حدیث سے نہیں بلکہ حدیث کو دینی حجت ماننے والوں کی زبان سے سنیئے۔ آئین سازی کے سلسلے میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ مسلمانوں میں اس قدر فرقے موجود ہیں لائل پور سے شائع ہونے والا جریدہ المنبر اپنی ۱۷/۲۴ مارچ ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

(مسلمانوں کے تمام) گروہ حدیث نبوی کو دینی حجت تسلیم کرتے ہیں اور اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ صحیح حدیث کے مقابلہ میں غیر رسول کی بات حجت نہیں۔ البتہ اختلاف یہاں آن کر رونما ہوتا ہے کہ فلاں حدیث کا انتساب رسول برحق کی جانب درست ہے یا نہیں۔

یعنی اگر کسی معاملے کے متعلق کوئی شخص کسی حدیث کو پیش کرے تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہو جاتے گا کہ وہ حدیث رسول اللہ کی ہے بھی یا نہیں۔ ان حضرات کے نزدیک یہ سوال کچھ ایسا اہم نہیں جسے درخورِ اعتنا سمجھا جائے۔ حالانکہ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ دین کے معاملے میں اس سے بڑا اختلاف اور کوئی ہو نہیں سکتا کہ جس بات کو رسول اللہ کے فیصلے کی حیثیت سے پیش کیا جائے اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہو کہ وہ رسول اللہ کی ہے بھی یا نہیں۔ یہی چیز ہے جو امت میں تمام تفرقوں کا موجب ہے۔ ان حضرات کا قرآن کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ اس کی تفسیر احادیث کی روشنی میں کی جائے گی اور احادیث کی پوزیشن یہ ہے کہ ان کے معانی و مطالب ہی میں اختلاف نہیں بلکہ سرے سے اس بات میں اختلاف ہے کہ جس حدیث کو ایک شخص بطور سند و حجت پیش کر رہا ہے وہ رسول اللہ کی ہے بھی یا نہیں ۔ اگر مختلف فرقوں کے اکتیس علماء جو ۱۹۵۱ء میں جمع ہوئے تھے، کسی ایک کتاب کے متعلق یہ کہہ دیتے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ ہم سب کے نزدیک سنتِ رسول اللہ ہے، تو آئین میں قرآن کریم کے ساتھ اس کتاب کا نام بھی لکھ دیا جاتا۔ لیکن یہ بات نہ انھوں نے اس وقت کی، نہ ہی وہ قیامت تک کر سکتے ہیں۔ لہٰذا، ایک ایسی چیز کو آئینی طور پر قانون کی بنیاد قرار دینا جس کی پوزیشن یہ ہو جان بوجھ کر آئین کو ناقابلِ عمل بنانا نہیں تو اور کیا ہے؟ یاد رکھیے۔ اسلامی مملکت کا وہی آئین قابلِ عمل ہو گا جس میں

یہ درج ہو کہ مملکت کے فیصلوں کے لئے اصولی طور پر سند کتاب اللہ ہو گی اور کتاب اللہ کے علاوہ اور جو کچھ ہے اس کے متعلق یہ فیصلہ مملکت کرے گی کہ اس میں کون سی چیز صحیح ہے اور کونسی غلط اور یہ فیصلہ خود کتاب اللہ کی رُو سے ہو گا۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! میری بصیرتِ قرآنی کے مطابق اسلامی آئین اور اسلامی مملکت کی پوزیشن۔

ایک مشورہ

میں کسی سے یہ نہیں کہتا کہ وہ ان تصریحات کو بلا تحقیق صحیح تسلیم کر لے۔ ملک کے اربابِ حل و عقد سے میری گزارش یہ ہے کہ وہ ایسے حضرات پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کرے جن کی دینی بصیرت پر اعتماد ہو لیکن جن کا تعلق کسی مذہبی فرقے سے نہ ہو۔ وہ کمیشن قرآن کریم کی روشنی میں تمام متعلقہ امور کا جائزہ لے اور قطعی طور پر متعین کرے کہ اسلامک آئیڈیالوجی کسے کہتے ہیں۔ اسلامی آئین کے امتیازی خطوط کیا ہوتے ہیں۔ اور اسلامی مملکت کا منتہیٰ و مقصود کیا۔ ایسے اہم مباحث کے متعلق اجتماعی طور پر کسی حتمی نتیجہ پر نہ پہنچنا اور انہیں انفرادی بحث و نظر کا موضوع بنائے رکھنا، نہ صرف وقت، دولت اور توانائیوں کا ضیاع ہے بلکہ ایسے ذہنی انتشار کا موجب بھی جس کا لازمی نتیجہ مایوسی ہوتا ہے۔ جو کچھ پہلے نو دس سال تک ہوتا رہا ہے اس سے قوم پر سخت مایوسی چھا چکی ہے۔ اگر آئے اُنہی حالات کا پھر شکار ہونا پڑا تو اس کا نتیجہ جس قدر مضرت رساں ہو گا اس کا اندازہ اربابِ بصیرت بخوبی لگا سکتے ہیں۔

رفیقانِ محترم! مجھے اس کا احساس ہے کہ میں نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا ہے۔ لیکن اس کا افسوس نہیں۔ اس لئے کہ یہ سوالات اس قدر اہم، اور جس دوراہے پر ہم اس وقت کھڑے ہیں وہ ایسا نازک ہے کہ اگر ہم نے اس باب میں ذرا سی بھی غفلت برتی تو معلوم ہم کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے ؎

تھی ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریقِ عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ کسی مملکت نے اس کا فیصلہ کیا ہو کہ وہ اپنا آئین اسلامی

خطوط پر پیش کرنا چاہتا ہے۔ آئین سازی کے پہلے دور نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ ہم نے یہ فیصلہ تو کر لیا لیکن کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اسلامی آئین کسے کہتے ہیں اور دینی مملکت کیا ہوتی ہے؟ وہ دور خدا خدا کر کے ختم ہوا لیکن اب پھر وہی سوالات سامنے آ گئے۔ موجودہ ارباب حل و عقد کے متعلق میرا اندازہ یہ ہے کہ اس باب میں ان کی نیتیں نیک ہیں لیکن ان کی دشواری یہ ہے کہ اسلامی آئین کا صحیح تصور ان کے سامنے بھی نہیں۔ ہمارے قدامت پسند طبقہ کی طرف سے اسلام کا جو تصور پیش کیا جاتا ہے، اس کے متعلق ان کا اندازہ ہے (اور بالکل ٹھیک اندازہ) کہ اس سے ہم دنیا میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ مجھے خدشہ یہ ہے کہ اس صورتِ حالات سے گھبرا کر وہ کہیں اس نتیجے پر نہ پہنچ جائیں کہ جس مذہب کی رُو سے ہزار برس میں یہ نہ طے ہو سکا کہ نماز میں ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں یا زیرِ ناف۔ یا بالکل کھلے رکھنے چاہئیں، اس مذہب کی رُو سے امورِ مملکت کس طرح طے پا سکیں گے۔ اور اس طرح، وہ اربابِ شریعت سے کہہ دیں کہ

ایک بڑا خطرہ

عمر بھر جی کے بھی جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

وہ ان سے کہہ دیں کہ شخصی معاملات کو تم سنبھالو، امورِ مملکت کو ہم، باقی دنیا کی طرح، سیکولر انداز سے طے کر لیں گے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو نہ صرف یہ کہ مملکتِ پاکستان میں اسلام کے احیاء کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی بلکہ دیگر اسلامی ممالک بھی اس خیال کو ترک کر دیں گے۔ یہ ممالک پاکستان کے اس تجربے کا کس شدت سے انتظار کر رہے ہیں اس کا اندازہ مجھے الکیشن کی رکنیت کے زمانے میں ہوا ان ممالک کے کئی اربابِ فکر نے کہا کہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ پاکستان نے جس اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اس باب میں ہمارا پہلا تجربہ بھی حوصلہ افزا نہیں تھا۔ لیکن اگر ہم نے دوبارہ وہی کچھ کیا تو آپ سوچئے کہ دیگر مسلم ممالک پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ اور غیر مسلم دنیا اسلام کے متعلق کس نتیجے پر پہنچے گی۔ اس سے آگے بڑھ کر میں بالخصوص اپنے ان احباب سے پوچھنا چاہتا ہوں جو طلوعِ اسلام کے مسلک سے متفق ہیں، کہ آپ فرمائیے کہ اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو آپ کی کیفیت کیا ہو گی؟ آپ موجودہ غیر قرآنی معاشرہ میں ان حسین امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کے سہارے جی رہے ہیں کہ

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!

لیکن اگر آپ کی غفلت اور کم ہمتی سے اس طلوعِ آفتاب میں تاخیر ہوگئی تو آپ کو اس کا کس قدر صدمہ ہوگا۔

شب ہجراں کے جاگنے والو
کیا کروگے اگر سحر نہ ہوئی

کرنے کا کام

لہٰذا، آپ سوچئے کہ اس وقت آپ پر کتنی عظیم ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ یہ ذمہ داری آپ سے کسی لمبی چوڑی منتر بانی کی بھی خواہاں نہیں۔ اس کا تقاضا فقط یہ ہے کہ آپ اسلامی آئین کے قرآنی تصور کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں۔ اس مقصد کے لئے آپ اپنی بے سروسامانی سے مت گھبرائیے۔ آپ کے دعوے کی صداقت، آپ کی نیتوں کا خلوص، آپ کے عزم کی پختگی، آپ کے عمل کی مداومت؛ آپ کے ذرائع کی کمی کو پورا کردے گی۔ خدا کا کائناتی قانون آپ کی رفاقت کا تھوڑا سا سہارا چاہتا ہے۔ آپ اس سے ہم آہنگی پیدا کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اسکے نتائج کس قدر تحیر انگیز برآمد ہوتے ہیں۔ اے ہمرہانِ خجستہ پا! قدم بڑھائیے۔ زمانہ آپ کا بڑی بیتابی سے انتظار کر رہا ہے۔

معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

اسلام کے دانا دشمن، دانستہ، اور نادان دوست، نادانستہ، ٹھنڈے سانس بھر کر کہہ رہے ہیں کہ اس دور میں قرآنی نظام ناقابلِ عمل ہے۔ تاریخ کے ایک دور میں تو اس نے شاندار نتائج پیدا کر دکھائے تھے، لیکن اب زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اب یہ "چلا ہوا کارتوس" کوئی نتیجہ مرتب نہیں کرسکتا۔ یہ آوازیں اِدھر اُدھر سے سنائی دیتی ہیں اور عوام کے دلوں میں مایوسی پیدا کئے چلی جارہی ہیں۔ آپ احباب کی ذمہ داری ہے کہ زمانہ کو بتادیں کہ جو کچھ قرآن نے ایک دور میں کیا تھا اس میں آج بھی اس کی صلاحیت ہے، اور ہمیشہ اس کی صلاحیت رہے گی، کہ ویسے ہی درخشندہ نتائج پھر مرتب کر دکھائے۔

بمن وصالِ تو باور نمی کند غالب
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

رفیقانِ محترم! میں نے اِس وقت جو کچھ آپ سے کہنا تھا، اسے کہہ چکا۔ آخر میں میں اپنے قلبِ مضطر

کی انتہائی تپش و خلش کے ساتھ اس درخواست کو پھر دہراتا ہوں کہ آپ وقت کی آواز کو پہچانیں اور قرآنی فکر کے عام کرنے میں جو کچھ بن پڑے، کر گذریں۔ یہ عجب کہ آپ کی ان کوششوں سے ابن آدم کو اس کا وہ فردوسِ گم گشتہ پھر سے مل جائے جس کی تلاش میں وہ یوں مارا مارا پھر رہا ہے

بیا ایں خاکداں را گلستاں ساز
جہانِ پیر را دیگر جواں ساز
بیا یک ذرہ از دردِ دلم گیر
تہِ گردوں بہشتِ جاوداں ساز

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمِ۔

پرویز

پانچویں نشست (بزمِ استفسارات)

۱۲۰ اپریل (تین بجے بعد دوپہر) بزمِ استفسارات کے نام سے سترکا سے کونشن کی خواہش کے تحت ہر کنونشن میں اس بزم کا اجلاس ہوتا ہے۔ اجلاس کیا، تمام مندوبین و مبصرین ضابطہ کی رسمیات سے آزاد ہو کر ایک نجی سی مجلس کی صورت میں گھر کی طرح یک جا ہو بیٹھتے ہیں۔ دین کے رموز و حقائق کو سوالات و جوابات کی صورت میں سمجھنے کے لئے یہ مجلس انتہائی سادگی کا رنگ لئے ہوتی ہے۔ نہ کوئی صدر اور نہ کوئی باضابطہ ایجنڈا۔ پرویز صاحب "میر مجلس" کی طرح درمیان میں اور باقی سب ان کے گرداگرد دور تک پھیلے ہوئے ـــــ ماہ تاب کے گرداگرد ستاروں کا دلآویز ہالہ ـــــ پیر مغاں کے حلقہ میں رندانِ بلانوش کا سرمستیوں میں ڈوبا ہوا ہجوم ـــــ سوال وجواب کا پُرکشش اور پُرکیف سلسلہ۔ پیر مغاں نے پکارا ـــــ

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من!

اور میکشوں نے دیوانہ وار اپنے ہاتھ ایک دوسرے سے آگے بڑھا دیئے۔ ساغر پہ ساغر لنڈھایا جا رہا تھا۔ متاعِ فقیر اس کے قافلے میں لٹائی جا رہی تھی۔ کتنے ہی اہم سوال صفحۂ قرطاس پر بکھرے ہوئے آگے بڑھے اور ان عقدہ ہائے اسرار و رموز کی گرہ کشائی ہوتی چلی گئی۔ پیر مغاں کے حضور

سے کوئی ہاتھ نامراد واپس نہیں لوٹتا۔ اقبالؔ نے شاید اسی منظر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

زندگی اور اس کے رازہائے سربستہ، قرآن پاک کی آیاتِ دقیق، قانونِ طبیعیات اور قانونِ مکافات کا رابطہ، مقامِ نبوت، کتنے ہی نکات تھے جو بے نقاب ہو کر سامنے آتے گئے۔ نہ میکشوں کی تشنگی کم ہونے میں آتی تھی اور نہ ساقیٔ محفل کا دستِ فیض بخل سے کام لینا جانتا تھا۔ یہ بزمِ پُرنشاط کم و بیش ڈھائی گھنٹے جمی رہی اور پھر جب یہ محفل اُٹھی، سب نے چائے کی میزوں کا رُخ کیا لیکن دلوں کی کیفیت یہ تھی کہ

مئے شبانہ کی مستی تو ہو چکی لیکن،
کھٹک رہا تھا دلوں میں کرشمۂ ساقی!

پرویز کے فکر و بصیرت کی بارگاہِ ناز میں، ہر سرِ نیاز جھکا جا رہا تھا۔

چھٹی نشست (درسِ قرآن)

۲۰ راپریل (آٹھ بجے شب) مندوبین و مبصرین ابھی رات کے کھانے سے بمشکل فارغ ہوئے تھے، بعض خوش طبعی میں مصروف اور بعض سرگرم گلگشت تھے۔ خیال تھا کہ کھانے میں تاخیر کے باعث یہ مجلس کچھ دیر سے شروع ہوگی۔ لیکن میرِ کارواں پروگرام کی پابندی کا شدت سے قائل تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے انتہائی پُرسوز اور دلکش لَے میں یہ روح نواز نغمہ فضاؤں میں گونجتا سنائی دیا۔۔۔

آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است

محوِ خرام قدم اور کھانے کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ وہیں کے وہیں رُک گئے۔ چہکتی ہوئی زبانوں پر سکوت کی مہریں لگ گئیں۔ محبوبِ حجازی کا ذکرِ جمیل، اور اقبالؔ کے الفاظ میں ۔۔۔ سب کے قدم تیزی سے پنڈال کی طرف اُٹھ گئے۔ آناً فاناً سارا پنڈال بھر گیا۔ اقبالؔ کی کوثر و تسنیم کی موجوں میں دُھلی ہوئی زبان سے بارگاہِ رسالتمآبؐ میں نذرِ خلوص پیش ہو رہا تھا اور دیوانۂ رسالت پرویزؔ کی چشمِ اشکبار سے گہر ہائے تابدار کا سلسلہ جاری تھا۔ ایوان کی فضا میں چاروں طرف جذب و مستی کا کیف برسنے لگا اور جب یہ دلکش نغمہ ختم ہوا تو دل عجیب سرمستیوں میں ڈوبے جا رہے تھے۔

عراقِ دل نشیں کا یہ ساز خاموش ہوا تو پرویز صاحب نے سرورجانفزا سے انگڑائی لی۔ درسِ قرآن کے سلسلے میں سب کو ان کے خطاب کا انتظار تھا۔ راولپنڈی کنونشن میں یہ اصرار ہوا کہ پرویز صاحب نے قرآن کریم کا جو لغت مرتب کیا ہے، اس سے کچھ اوراق بطورِ نمونہ سامنے لائے جائیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اس سے قرآن فہمی میں کیا مدد ملے گی۔ اس تقاضا کے پیشِ نظر پرویز صاحب نے فیصلہ کیا کہ سورۃ فاتحہ کے مفردات کے جو معانی اس لغت کی رو سے متعین ہوتے ہیں انہیں احباب کے سامنے پیش کیا جائے۔ لیکن وہ ابھی عربی زبان کی اہمیت اور خصوصیات کے تمہیدی بیان کے بعد سورۃ فاتحہ کے ابتدائی الفاظ تک ہی آنے پائے تھے کہ زور کی بارش آگئی اور اس محفل کو بصد حسرت ختم کرنا پڑا۔ اس مرتبہ شرکائے کنونشن نے پھر اپنے تقاضا کا اعادہ کیا اور کہا کہ سورۃ فاتحہ کے مفردات ہی کو درس کا موضوع بنایا جائے۔ اس سلسلے میں آغازِ تقریر کرتے ہوئے پرویز صاحب نے فرمایا۔

"قرآن کی لغت اور مفہوم کے سلسلے میں میری فکر انگیزیاں، عرق ریزیاں اور شب بیداریاں اب تکمیل کو پہنچا چاہتی ہیں۔ لغت مکمل ہو چکا اور اس کا مفہوم بھی (لغات اور مفہوم القرآن)۔ اب صرف ان کی طباعت باقی ہے۔ اس لغت کے تعارف سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ یہ قرآن کو سمجھانے میں کس قدر ممد و معاون ثابت ہوگی۔"

"میں مبتدا یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قرآن کا دعوےٰ ہے کہ وہ کتاب آسان ہے اور ہمارا اس دعوے پر ایمان ہے۔ خود "قُرْآنًا عَرَبِيًّا" کے معنی لغوی طور پر واضح قرآن کے ہیں۔ قرآن کا یہ بھی دعوےٰ ہے کہ وہ سمجھنے کے لئے بڑا آسان ہے لیکن جس طرح خارجی اثرات اور وقت کی رفتار سے الفاظ کے مفہوم بدل جاتے ہیں اسی طرح قرآن کے الفاظ کا مفہوم بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔"

پرویز صاحب نے اس سلسلے میں بعض الفاظ کی مثالیں پیش کیں اور کہا کہ یہ وہ صورت تھی جس کی بنا پر آیاتِ قرآنی کے مفہوم کے سلسلے میں مجھے عربی کی مختلف لغاتوں سے کام لینا پڑا۔ اور الفاظ کے مادوں سے قرآن کریم کے مختلف مقامات کی روشنی میں، ان کا مفہوم مرتب کرنا پڑا۔ ازاں بعد پرویز صاحب نے سورۃ فاتحہ کے ایک ایک لفظ کا مفہوم عربی زبان کی مستند لغتوں سے

بالتفصیل واضح کیا۔ اس تفصیل کی روشنی میں سورۂ فاتحہ کے ہر لفظ کا مفہوم انسانی فکر کے لئے اس قدر عظیم دعوتِ انقلاب نظر آیا کہ حاضرین عش عش کر اٹھے۔ اور لغوی طور پر ہر لفظ کا مفہوم واضح کرتے ہوئے جب انہوں نے بحیثیت مجموعی سورۂ فاتحہ کا ترجمہ پیش کیا تو مروجہ بے روح ترجموں کے مقابلے میں ان وجد آفریں معانی و مطالب پر ہر شخص جھوم اٹھا۔ پرویز صاحب اس بیان سے کتاب اللہ کی عظمت کے درخشندہ نقوش دلوں میں قائم کر رہے تھے۔ ان کے قلب و ضمیر گواہی دے رہے تھے کہ اگر کتاب اللہ کو علم و فکر کی اس بلندی سے پیش کیا جاتا تو آج پوری نوعِ انسانی اس چشمۂ نور سے مالا مال ہو رہی ہوتی۔ اور انسانی زندگی میں ایسی فصلِ بہار کا سماں بندھ چکا ہوتا جس کی شادابیاں کبھی ختم نہ ہوتیں۔ تین گھنٹے کے بعد، کتاب اللہ کی عظمت سے معمور دل لے کر جب یہ محفل برخاست ہوئی تو سب کی روحوں پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔

ساتویں نشست (یومِ اقبال کی تقریب)

۲۱ اپریل۔ (۹ بجے صبح) "یومِ اقبال" کی نسبت سے عالمِ اسلام کے اس حکیمِ عظیم اور مفکرِ جلیل کی بارگاہ میں نذرِ عقیدت پیش کرنے کے لئے اس سہانی مجلس کا انعقاد ہوا۔ تمام ہنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پرویز صاحب نے آغاز خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"طلوعِ اسلام سے دلچسپی رکھنے والے اس قلبی تعلق سے بخوبی آگاہ ہیں جو مجھے حضرت علامہ کی ذات سے تھا۔ لیکن شاید اس عقیدت و احترام کا اندازہ نہ لگایا جا سکے جو ان کے لئے میرے دل کی گہرائیوں میں موجزن ہے۔ اور ان کا وہ احسانِ عظیم جس سے میری گردن جھکی جا رہی ہے، یہ تھا کہ انہوں نے مجھے قرآن سمجھنے کے قابل بنایا۔ یہ قرآن تھا جس نے آدمی کو "مقامِ آدم" سے روشناس کرایا۔ اس نے یہ حقیقت عظیم قصۂ آدم میں حسین انداز کے تمثیلی رنگ میں بیان کی اور پھر اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں اس کی تفسیر کی۔ آج کی مجلس میں، میں اقبال کے اس پیغام کو قرآن کی روشنی میں بیان کروں گا کہ ـــ آدم کیا ہے؟ ـــ وحی کی روشنی نے اسے کیا سمجھایا اور کیا سے کیا بنا دیا۔ اور پھر اقبال نے اپنے ڈرامائی انداز میں اس حقیقت کی نقاب کشائی کس طرح کی؟

اس مرحلے پر پرویز صاحب کے اندازِ خطابت کا رُخ بدل گیا۔ وہ قرآن کی روشنی اور اقبال کی زبان سے والہانہ ڈرامائی انداز میں مقامِ آدم کی نقاب کشائی کر رہے تھے پنڈال کے طول و عرض میں بے مثال خاموشی کا دور دورہ تھا اور جذب و مستی کی سلسبیل دلوں میں دوڑ رہی تھی ــــ آدم کون تھا؟ اس کی زندگی کا آغاز کیونکر ہوا؟ اس نے کس حسنِ انداز سے جہانِ نو کی طرح ڈالی؟ اس کی جہانگیریوں اور عالم آرائیوں کا سلسلہ دراز کہاں سے کہاں تک پہنچا؟ چمنستانِ حیات میں اس نے کیا کیا گل کھلائے اور کیا کیا بوقلمونیاں کیں؟ وحی کی راہ نمائی کے بغیر وہ کس طرح يُفْسِدُ فِي الْأَرْضِ وَ يَسْفِكُ الدِّمَاءَ کا پیکر بنا اور پھر وحی کی روشنی نے اسے کس طرح ہر قسم کے خوف و حزن سے نجات دلائی۔ قرآن کی روشنی اقبال کی زبان اور پرویز کا حسنِ بیان ــــ گویا موسمِ بہار میں ابرِ بہار جھوم جھوم کر اٹھا۔ جھوم جھوم کر برسا اور قلب و نظر کی کشتِ نوبہار کی سُت داہیوں میں ایسا نکھار پیدا کر گیا جس پر فصلِ گل ہمیشہ ناز کرے گی۔ جب قریب دو گھنٹے کے بعد اس "آسمانی ڈرامہ" کا آخری سین "ندائے جمال" کے بلادے پر آدم کے اس جواب پر ختم ہوا کہ

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

تو ہر قلب یہ محسوس کر رہا تھا گویا وہ آسمان کی بلندیوں کی سیر کرنے کے بعد پھر اس خاکدانِ ارضی پر واپس آ گیا ہے۔ اور اس پیشکش کے متعلق ہر شخص کی زبان پر تھا کہ

آفاقہا گردیدہ ام، مہرِ بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام، اما تو چیزے دیگری

الوداعی نشست

کھانے کے بعد کاروانِ عشق و مستی کے یہ افراد، کشاں کشاں پنڈال کی طرف آ گئے تاکہ رخصت ہونے سے پہلے، اپنے محبوب دل نواز سے الوداعی پیغام حاصل کر لیں۔ کنونشن کی الوداعی نشست ہمیشہ مختصر لیکن اثر و درد کی شدتوں میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔ احباب کے دل میں

اس کا اثر فرداً فرداً ہوتا ہے۔ لیکن پرویز صاحب پر اس کا مجموعی اثر ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس رخصتی کے وقت ان کے دلِ پُر حسرت پر کیا گزرتی ہے۔ وہ مائک پر آئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اور ان کے سامنے احباب میں سے بھی کسی کی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہو۔ وہ خطیبِ سحر بیاں، جو مشکل سے مشکل موضوع پر، گھنٹوں مسلسل اور بے تکان بولتا چلا جاتا ہے، مائک پر ساکت و صامت کھڑا تھا۔ ہجومِ جذبات نے اس کے دل کو طلسمِ پیچ و تاب بنا رکھا تھا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلتا تھا ــــ اس نے بصد مشکل لب کشائی کی۔ اور جب آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں احباب سے کہا کہ

حیرت کے غم کدہ میں خوشی کا گذر کہاں
تم آ گئے تو رونقِ کاشانہ ہو گئی

تو پنڈال کے مختلف گوشوں سے ہچکیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ انہوں نے اپنے آپ کو بمشکل سنبھالتے ہوئے کہا۔ کہ آپ احباب قرآن کا پیغام سننے کے لئے یہاں جمع ہوئے۔ اب اس پیغام کو لے کر اپنے اپنے مقام پر واپس جایئے اور اسے ان لوگوں تک پہنچایئے جن تک ابھی یہ نہیں پہنچ سکا۔ لیکن ایسا کرتے وقت، اس بات کو ہمیشہ سامنے رکھئے کہ قرآن کے پیغام میں اپنے ذاتی میلانات و رجحانات اور خیالات و تصورات کی ذرا سی بھی آمیزش نہ ہونے پائے۔ خدا کے پیغام میں انسانی خیالات کی آمیزش شرکِ عظیم ہے جس سے بچنا نہایت ضروری ہے۔

دوسری اہم چیز یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ آپ کے کردار و گفتار سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے پائے جس میں فرقہ بندی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ فرقہ بندی بھی قرآن کی رُو سے شرک ہے۔ جس سے اجتناب اشد ضروری ہے۔

تیسری بات یہ کہ میں جو کچھ قرآن کریم کے متعلق کہتا ہوں وہ میرا فہمِ قرآن ہے اور کسی انسان کا فہمِ قرآن حرفِ آخر نہیں ہو سکتا۔ میری تمام کوششوں اور کاوشوں کا مقصود یہ ہے کہ آپ حضرات براہِ راست قرآنِ کریم پر غور و تدبر کریں اور اسے خود سمجھنے کی کوشش کریں۔ قرآن ہر شخص کو دعوتِ فکر و تدبر دیتا ہے۔

اس مختصر لیکن جامع پیغام کے بعد انہوں نے حسبِ سابق یہ کہہ کر احباب کو رخصت کیا کہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا!

اس پیغام کے خاتمے پر، تمام احباب، اس شمعِ قرآنی کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے اور قلوب کی تلاطم خیزیوں اور آنکھوں کی شبنم نشانیوں کے ساتھ ایک ایک دوست اپنے حبیب صادق سے گلے مل کر رخصت ہوا۔ اس کیف و درد سے پُر منظر کی یاد، آیندہ اجتماع تک، احباب کے دلوں میں شمعِ نورانی بن کر جگمگاتی رہے گی۔

معمارِ حرم

طلوعِ اسلام کی چوتھی سالانہ کنونشن

منعقدہ لاہور

۷ر تا ۱۰ر ــــ اپریل ــــ ۱۹۶۰ء

(روئیداد، ماخوذ از ص۱۰ تا ص۲۳ طلوعِ اسلام مئی۔ جون ۶۰ء)

؎ معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

گردشِ لیل و نہار دیکھتے ہی دیکھتے سال بھر کی منزلیں طے کر گئی۔ اور ۷ اپریل کا آفتاب۔ جشنِ نزولِ قرآن کے ایک ہفتہ بعد — قرآنی فکر کی حسین آرزوؤں کو انجمن آرائیوں کے محسوس و مشہود پیکروں میں ڈھلتے دیکھ رہا ہے۔ کنونشن ہاؤس (شالامار ٹاؤن۔ لاہور) کے سبزہ زاروں میں ایک بار پھر نور و نکہت کی وہ بساط بچھ رہی ہے جو عصرِ حاضر کے ہنگامہ ہائے کارزار کو ایک نئی روحِ انقلاب عطا کرے گی اور عجب نہیں کہ وہ نوعِ انسانی کی اُس صبحِ بہار کا عنوان ثابت ہو جس کی نور پاشیوں میں

یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا

اور

یہ زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

نگہِ بازگشت

ہاں ایک سال قبل — موسمِ بہار کی گلباریوں کا یہی ہجوم تھا۔ کنونشن ہاؤس کی یہی گلپوش روشیں اور آئینہ پاش فضائیں تھیں۔ لالہ و گل کی مسکراہٹوں کا یہی کیف زا جنت آباد تھا۔ فصلِ بہار کی سرمستیوں میں یہی تر و تازگی تھی۔ حسنِ فطرت کی عروسِ جاں نواز یونہی اپنی رنگینیوں اور رعنائیوں کی شراب برسا رہی تھی اور نشرآئی صبحِ انقلاب کے طائرانِ چمن پر

تھے جو اس فضائے کیف بار میں ذکر و فکر کی دلکش بزم سجائے بیٹھے تھے۔ اور اب — ایک سال بعد — موسمی انقلاب کے اسی بہار آفریں آغاز میں جبکہ

راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار نشیدِ قرآنی کے وہی زمزمہ سازِ وداع و وصل کی بھولی بسری یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بہترین ہاؤس کے بابِ عالی میں داخل ہو رہے ہیں۔ اور اگر سننے والے کان موجود ہوں تو یقیناً ان کے لبوں پر رقص کرتا ہوا غالب کا یہ نغمۂ دلکش صاف سنائی دے رہا ہے۔

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال

کنونشن کمیٹی صبح کے اجلاس میں سارے انتظامات کا خاکہ ترتیب دے چکی ہے۔ رضاکار تقسیمِ کار کے بعد اپنی ڈیوٹیاں سنبھال چکے ہیں۔ دفترِ استقبالیہ، مہمان کیمپ، ایوانِ کنونشن، طعام گاہ، بک اسٹال، ٹی اسٹال — الغرض ہر ضروری انتظام حسنِ ترتیب سے تکمیل پا رہا ہے۔ کیمپ کمانڈر کی قیادت میں قرآنی نظام کے داعیوں کی چھوٹی سی بستی شامیانوں کی دلکش قطاروں میں چاروں طرف گلہائے رنگارنگ کے دامن میں پھیلتی چلی جا رہی ہے اور دور دراز کے نمائندگان کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ کنونشن ہاؤس سے باہر موٹر رکشا، تانگے، ٹیکسیاں آ آ کر رک رہی ہیں اور جانی پہچانی صورتیں بستروں اور بکسوں کو اٹھائے بڑے دروازے سے اندر داخل ہو ہو کر چاروں طرف پھیل رہی ہیں۔ جگہ بہ جگہ ربطِ باہمی کے محبت بھرے مظاہرے، مسکراہٹوں اور قہقہوں کی صورت میں، بکھرے جا رہے ہیں اور اخوت کی گرمجوشیوں میں ہم آغوشیوں کا وہ سرور انگیز اور جانفزا سماں چاروں طرف بندھ رہا ہے جس سے کنونشن ہاؤس کی ساری فضا وجد و مسرت سے جھوم اٹھی ہے۔

جوشِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

دن ڈھل گیا۔ آفتاب کی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ گردوں کا یہ شہسوار ان حسین مناظر کی یاد سینے میں لئے افقِ مغرب میں غائب ہو گیا۔ آسمان پر ستاروں کی قندیلیں جگمگانے لگیں۔ لیکن کنونشن ہاؤس میں قرآنی فکر کے چراغوں کا ہجوم برابر بڑھ رہا ہے۔ کیمپ کی وسعتوں میں جگہ بجگہ چھوٹی چھوٹی

مجلسیں آراستہ ہیں. کہیں از سرِ نو تعارف کا سلسلہ، کہیں مستقبل کی تعمیر کا ذکرِ جمیل. کہیں اپنی کٹھن راہ کی مشکلات و موانعات کی وضاحت. الغرض باہمی ربط و ضبط، اخوت و محبت، مسکراہٹوں اور قہقہوں کا ایک دلکش امتزاج ہے جو پورے کیمپ پر نسیمِ بہار کی طرح چھایا ہوا ہے۔ آخر کیوں نہ ہو۔

یہ محبت کی حرارت، یہ تمنا، یہ نمود!!
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب

اس اندھیری رات کی تاریکیوں میں جو صدیوں سے امت کے فکر و نظر کے کاشانوں پر چھائی ہوئی ہے اس خیابان کی مہتابی فضا کو دیکھئے۔ سب کی جگمگاتی ہوئی پیشانیوں سے اس تعارف کا برملا اعلان ہو رہا ہے۔

ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

تعارفی اجلاس

رات کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں اور ایوانِ کنونشن سے مائیک پر پہلا اعلان گونجتا ہے۔

تعارفی اجلاس شروع ہو رہا ہے۔ پنڈال کا رخ کیجئے!

اور یہ اعلان سنتے ہی سب کے قدم پنڈال کی جانب اٹھنے لگے۔ چھوٹی چھوٹی مجلسیں منتشر ہو گئیں اور ایوانِ کنونشن میں وہ تعارفی مجلس آراستہ ہو گئی جو ہر سالانہ کنونشن کا حرفِ آغاز بنتی ہے۔ اور جس میں احباب صحیح معنوں میں ایک دوسرے سے باضابطہ طور پر روشناس ہوتے ہیں — تلاوتِ قرآن پاک اور نظم کے بعد تعارفِ باہمی کا سلسلۂ دراز شروع ہوتا ہے۔ کراچی، لاہور، پشاور، مردان، لائلپور، راولپنڈی، سیالکوٹ، جھنگ، سرگودھا، جہلم ہر جگہ کے احباب باری باری سب کے سامنے آتے ہیں — نہیں بلکہ سعودی عرب اور مغربی جرمنی کے نمائندے بھی۔ بعض احباب کے تعارف کے لئے پرویز صاحب بہ نفسِ نفیس مائیک پر آنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

باہمی تعارف کا یہ سلسلہ بارہ بجے شب تک جاری رہتا ہے اور سکوتِ نیم شبی میں جب یہ مجلس برخاست ہوتی ہے تو سب اپنے کیمپ کا رخ کرتے ہیں۔ لیکن وداع و وصل کی ان لذتوں میں نیند کا گذر کہاں؟ کیمپ میں جگہ بہ جگہ ایک بار پھر چھوٹی چھوٹی محفلیں سج جاتی ہیں۔ عجیب کیف زا ہے یہ سہانی رات اور مبارک و مسعود ہیں یہ محفلیں جن پر ستاروں کی انجمن کو بھی رشک آ رہا ہے

محفلیں کیا ہیں ؟ زبانِ حال ان کی جانب اشارہ کر کے پکار رہی ہے۔

چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں اپنے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب

نمحانۂ قرآن کے یہ سرمست جانتے ہیں کہ یہ سہانی رات سینکڑوں راتوں کے بڑے ہی سکوں سوز انتظار کے بعد آتی ہے۔ اس ایک رات کے لئے کتنی ہی راتیں ستارے گن گن کر گذاری جاتی ہیں۔ اور پتہ نہیں کہ اس ایک رات کے لئے آئندہ انتظار کی مدت کتنی طویل ہو جائے۔

پہلا اجلاس

۸ راپریل کا آفتاب طلوع ہوا ہے۔ کنونشن کے آج کے پروگرام میں دو بڑے ہی اہم اجلاس شامل ہیں۔ پہلے اجلاس میں پرویز صاحب کا اہم افسانِ چمن سے افتتاحی خطاب شامل ہے اور اسکی اہمیت سب پر واضح ہے — لہٰذا دیکھئے! سب ناشتہ سے جلدی جلدی فارغ ہو کر پنڈال کا رخ کر رہے ہیں۔ ٹھیک نو بجے پرویز صاحب ایوان میں داخل ہوتے ہیں۔ اور استقبالیہ کے بعد ان کے افتتاحی خطاب کا اعلان ہوتا ہے۔ پرویز صاحب اسٹیج کے عقب سے اپنی مخصوص مسندِ خطاب کا رُخ کرتے ہیں اور سب کی نگاہیں ان پر مرکوز ہیں۔ بادۂ زندگی۔ خمِ زندگی۔ اور پیامِ فصلِ بہار کے بعد رفقائے سفر کے کان ایک نئے پیغام کے منتظر ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ حالات کے نئے تقاضوں کی مناسبت سے یہ پیغام بڑا اہم ہوگا۔ اور واقعی مفکرِ قرآن اس بار بڑا اہم اور عمل بداماں پیغام لے کر سامنے آئے ہیں۔ ان کے خطاب کا عنوان ہے۔

معمارِ حرم

باز بہ تعمیرِ جہاں خیز!
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز!

اور اپنے نالۂ بہار کے طائرانِ خوش رس سے آغاز خطاب کرتے ہوئے وہ اپنے پیغام کی اہمیت

یوں واضح فرماتے ہیں۔

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام دانی کہ چیست ؟
یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے

پرویز صاحب نے واضح کیا کہ آج مملکت پاکستان ایک بار پھر دستوری تدوین کے نازک مرحلے کو طے کر رہی ہے اور اس آئین کے لئے جو مملکت کے لئے رگِ حیات کی حیثیت رکھتا ہے افرادِ مملکت کی رائے معلوم کی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارا علیٰ وجہ البصیرت ایمان ہے کہ اگر پاکستان میں قرآنی آئین نافذ ہو گیا تو اس کے درخشندہ و تابناک نتائج پوری دنیا پر اثر انداز ہوں گے اور چشمِ فلک ایکبار پھر قرنِ اوّل کا جنت نگاہ منظر دیکھنے کے قابل ہو جائے گی۔

انہوں نے اعلان کیا کہ قرآنی آئین کا نفاذ ہی رسول اکرمؐ کی حقیقی سنت اور اسوۂ حسنہ ہے اور یہی آئین ہے جو اس خزاں رسیدہ چمن میں بہاریں لا سکتا ہے۔ اس مرحلہ پر انہوں نے بڑے ہی اثر انگیز اور والہانہ انداز میں یہ شعر پڑھا۔

کرو نہ کچھ فکرِ جام ساقی، بہار آنے تو دو چمن میں
گلوں سے ٹپکے گا رنگِ مستی، ہوا کرے گی شراب پیدا

اور اس طرح احباب کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور واضح کیا کہ اس مرحلہ پر انکی زندگی کا ایک ایک لمحہ کسقدر قیمتی ہے اور یہ منزل کس قدر کڑے امتحان کی منزل ہے۔ خطاب کے آخر میں ان کے یہ الفاظ کیسی سکوں سوز بے تابیوں کے آئینہ دار تھے۔

میری کیفیت تو اب یہ ہے کہ زندگی کا ایک ایک لمحہ اس نظامِ ربوبیت کے انتظار میں گذر رہا ہے جو جنت سے نکلے ہوئے آدم کو پھر سے فردوس بداماں کر دے۔

(پرویز صاحب کا یہ خطاب آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آرہا ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معمارِ حرم

قافلۂ بہار کے
طائرانِ پیش رس[1]
کے نام

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام دانی کہ چیست؟
یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خمخانہ مے

ہم نفسانِ چمن! سلام و رحمت!

جشنِ نزولِ قرآن کے فوری بعد، آپ احباب کا یہ اجتماعِ نور و نکہت، ہزار مسرتوں کا موجب اور لاکھوں نشاط آفرینیوں کا باعث ہے۔ کنونیشن ہاؤس کی رقص آور فضا جھوم جھوم کر کہہ رہی ہے کہ

یہ کون آیا بزمِ گل و یاسمن میں
کہ شادابیاں جاگ اٹھیں چمن میں

میں اس تقریبِ سعید پر تمام احباب کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرنے کا فخر حاصل

---

[1] قافلۂ بہار را طائرِ پیش رس نگر آنکہ بخلوتِ قفس گفت پیامِ خویش را

کرتا ہوں۔ اس قسم کے اجتماعات فی الحقیقت میری آرزوؤں کو حیاتِ تازہ اور میرے ولولوں کو حرارتِ نو عطا کر دیتے ہیں۔ اس کے لئے میں آپ احباب کا بصمیم قلب سپاس گذار ہوں۔

برادرانِ عزیز! ہمارے نقطۂ نگاہ سے اس سال کا اہم ترین واقعہ، کانسٹی ٹیوشن کمیشن کا تقرر ہے جو مملکتِ پاکستان کے لئے دستورِ نو کی سفارشات پیش کرے گا۔ قریب ڈیڑھ سال قبل، عسکری انقلاب نے، سابق آئین کو کالعدم قرار دینے کے لئے جو تخریبی قدم اٹھایا تھا، وہ اس تعمیری پروگرام کی تمہید تھا۔ اس کمیشن کے تقرر سے مملکت کے تعمیری پروگرام کی ابتدا ہوتی ہے۔ تشکیل پاکستان کے بعد جب دستور سازی کا کام ہاتھ میں لیا گیا تو یہ فریضہ مجلسِ آئین ساز کے سپرد کیا گیا تھا۔ وہ مجلس، افراد مملکت کی صحیح نمائندہ نہیں تھی اس لئے دستور سازی کے مسئلہ میں ملتِ پاکستانیہ کا عمل دخل بھی کچھ نہیں تھا۔ حالیہ آئینی کمیشن نے اعلان کیا ہے کہ وہ ایک سوالنامہ جاری کریگا جس کی رُو سے باشندگانِ مملکت کے خیالات معلوم کئے جائینگے کہ وہ ملک میں کس قسم کا آئین چاہتے ہیں۔ وہ سوالنامہ ابھی تک جاری نہیں ہوا۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ استصوابِ آراء کو محض اصولوں تک محدود رکھا جائے گا یا اس میں مجوزہ آئین کی تفاصیل بھی آ جائیں گی۔ لیکن اگر وہ صرف اصولوں تک بھی محدود ہوا تو بھی وہ ہمارے مقصدِ پیشِ نظر کے لئے کافی ہوگا، اس لئے کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ مملکت کا آئین قرآنی خطوط کے مطابق مرتب ہو۔ اور قرآن کریم وہ غیر متبدل اصول دیتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے تفاصیل خود متعین کی جا سکتی ہیں۔ اس لئے، اگر ہمارا مجوزہ آئین، قرآنی اصولوں کے مطابق ہوا، تو تفاصیل کے متعلق تشویش کی چنداں ضرورت نہیں ہوگی۔

مملکت میں آئین کی اہمیت کیا ہوتی ہے، اس کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ آپ احباب ان امور سے بخوبی واقف ہیں۔ مملکت کا آئین، افرادِ مملکت کے لئے رگِ حیات کی حیثیت رکھتا ہے اس کا تعلق موجودہ نسل ہی سے نہیں ہوتا، آنے والی نسلیں بھی اس سے متاثر ہوتی ہیں۔ یہ اہمیت تو عام آئین کی ہوتی ہے۔ قرآنی آئین کی اہمیت اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جو مملکت قرآنی آئین کے مطابق متشکل ہو، وہ ساری دنیا کے لئے "ماڈل اسٹیٹ" بن جاتی ہے۔ وہ اقوامِ عالم کو محسوس انداز سے بتاتی ہے کہ جب انسانوں کی تمدنی زندگی قرآن کے قالب میں ڈھل جائے تو دنیا کس طرح جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ ہمارا ایمان ہے — اور علیٰ وجہ البصیرت ایمان — کہ اگر پاکستان میں قرآنی آئین رائج ہو گیا

تو اس کے درخشندہ و تابناک نتائج کو دیکھ کر، دنیا بھر کی قومیں، اپنا اپنا نظام چھوڑ کر، اس نظام کیطرف لبیک کر آئیں گی اور چشمِ فلک ایک بار پھر، یدخلون فی دین اللّٰہ افواجا کا حقیقت نگاہ نظارہ دیکھ لے گی اور اس حقیقت کا تماشا کرے گی کہ

اٹھا جو مینا بدستِ ساقی، رہی نہ کچھ تابِ ضبط باقی
تمام میکش پکار اُٹھے، یہاں سے پہلے، یہاں سے پہلے

اس وقت مملکتِ پاکستان جس نازک ترین دور سے گذر رہی ہے، ہر قلبِ حساس اس کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ایک مملکتِ پاکستان ہی پر کیا موقوف ہے، دنیا کی بڑی بڑی مملکتیں بھی جس کرب و اذیت میں مبتلا ہیں وہ کوئی پوشیدہ راز نہیں۔ مصائب و مشکلات کی نوعیتیں مختلف ہیں۔ اطمینان کی زندگی کسی کو بھی میسر نہیں۔ پاکستان کے اربابِ حل و عقد حالات کو سازگار بنانے کے لئے امکان بھر کوشش کر رہے ہیں، لیکن انہیں قدم قدم پر کہنا پڑتا ہے کہ ـــــ سینہ تمام داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم ـــــ معاشرہ میں خرابیاں اس درجہ عام ہو چکی ہیں کہ ان کا علاج مشکل نظر آتا ہے لیکن ان خرابیوں کا علاج الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان سب کا بنیادی حل ایک ہی ہے۔ چیچک کے مریض کی ہر پھنسی پر مرہم لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے ایسی دوائی دی جاتی ہے جس سے مرض کے جراثیم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسانی معاشرہ کے جراثیم کا علاج، شافی مطلق کے تجویز کردہ نسخہ سے ہو سکتا ہے ہم پاکستان کے اربابِ بست و کشاد کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ مملکت میں قرآنی آئین کو نافذ کریں اور پھر دیکھیں کہ اس دوائی کی ایک خوراک سے چیچک کی ہزاروں پھنسیاں کسطرح خود بخود معدوم ہو جاتی ہیں۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں، انسانی معاشرہ میں جو حالت ہو چکی تھی، اس کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ (۳۰/۴۱)، خشکی اور تری میں سب جگہ فساد ہی فساد برپا تھا۔ کوئی شے اپنے صحیح مقام پر نہیں تھی۔ نبی اکرمؐ نے ان خرابیوں کا الگ الگ علاج نہیں کیا۔ آپؐ نے ایک مملکت قائم کی اور اس میں قرآنی آئین نافذ کر دیا اور وہ تمام خرابیاں خود بخود دور ہو گئیں۔ بلکہ انسانیت نے کامرانیوں اور شادکامیوں کی ایسی پُر بہار زندگی دیکھی جس کی نظیر تاریخ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ رسول اللہؐ کی یہی سنت ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ مملکت میں قرآنی آئین نافذ ہونے دو اور دیکھو کہ اس چمنِ خزاں دیدہ پر کس طرح بہار آتی

نچھاور ہوتی ہیں۔

کرو نہ کچھ فکرِ جامِ ساقی، بہار آنے تو دو چمن میں
گلوں سے ٹپکے گا رنگِ مستی، ہوا کرے گی شراب پیدا

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ (۲/۷۳)

لیکن، برادرانِ عزیز! اس باب میں سب سے بڑی ذمہ داری آپ کے اوپر عاید ہوتی ہے۔ اس وقت پاکستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں، قرآنی آئین کے مطالبہ کی آواز صرف آپ حضرات کی طرف سے بلند ہو رہی ہے۔ یہ سعادتِ عظمیٰ، مبدأ فیض نے آپ کے حصے میں لکھ رکھی تھی۔ لیکن فطرت اپنی کہرباریاں بلاقیمت نہیں کیا کرتی۔ وہ اس کے لئے مشقت مانگتی ہے۔ وہ جس خوش بخت انسان کا سینہ قرآنی حقائق کے لئے کھولتی ہے اس پر ذمہ داریوں کا ایسا بارِ گراں ڈالتی ہے جس سے اس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْۤ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (۹۴/۱-۳) اسی اجمال کی تفسیر ہے۔ اور اس کے لئے اصول یہ ہے کہ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۹۴/۵-۶) آسانیاں مشکلات کے بعد پیدا ہو سکتی ہیں۔ جس قدر مشکلات سخت تر، اسی قدر آسانیاں نزدیک تر۔ یہ وہ راہِ عشق ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

اُدھر دشواریاں راہِ طلب کی بڑھتی جاتی ہیں
اِدھر دل کو یقینِ قربِ منزل ہوتا جاتا ہے

اس راہ میں جس قدر مراحل سخت ہوں، اسی قدر رفتار کو تیز کر دینا ہوتا ہے۔ یہی وہ راہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی!
حدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی

لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ یہاں خالی جذبات سے کام نہیں چلتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جذباتی انسان اس تحریک کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا۔ قرآن کریم نے اس منزل کو اَلْعَقَبَةُ سے تعبیر کیا ہے یعنی پہاڑ کی اونچی گھاٹی پر چڑھنا۔ گھاٹی پر چڑھنے کے لئے جذبات کا صرف ایک ہی مقام ہوتا ہے

یعنی اس بات کا عزم راسخ کہ میں نے اس چوٹی کو سر کرنا ہے۔ اس کے بعد نہایت صبر آزما اور ہمت طلب مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ راستہ قدم قدم چل کر طے کیا جاتا ہے۔ بھاگ کر کوئی بھی چوٹی تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے اس میں جذبات کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ ہمت، استقلال، ضبطِ خویش ہی وہ سازو براق ہے جس سے یہ مرحلہ طے ہو سکتا ہے حتیٰ کہ اس سفر میں یہ خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیئے کہ یہ منزل میری زندگی میں طے ہو جائے گی، قرآنی معاشرہ ہماری آنکھوں کے سامنے متشکل ہو جائے گا۔ اس باب میں، اور تو اور، انسانیت کے قافلۂ شوق کے میر کارواں حضور رسالتمآب سے بھی کہہ دیا گیا تھا کہ وَ اِنْ مَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ۔ جن باتوں کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ آپ کی زندگی میں سامنے آجائیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی وفات اس سے پہلے ہو جائے فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَ عَلَیْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) آپ کے ذمے صرف اس پیغام کو لوگوں تک پہنچا دینا ہے۔ یہ ہمارے ذمے ہے کہ ہم دیکھیں کہ (ہمارے قانون کے مطابق) اس جدوجہد کا نتیجہ کب ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس جہادِ مسلسل کا ظہورِ نتائج، نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں شروع ہو گیا تھا لیکن حضورؐ کے رفقائے سفر میں بہت سے ایسے تھے جنہوں نے اس جنتِ ارضی کو اپنے سامنے متشکل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے حصے میں قربانیاں ہی قربانیاں تھیں جن کی آخری منزل خود ان کی جان کی قربانی تھی۔ یہ حضرات (رضی اللہ تعالےٰ عنہم) اپنی محنت کا ثمر اپنی طبعی زندگی میں نہ دیکھ سکے۔ لیکن بارگاہِ خداوندی میں انکے مدارج و مراتب اُن سے کہیں بڑھ کر تھے جو اس جدوجہد میں بعد میں شریک ہوتے اور انہوں نے اس جنتی معاشرہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ارشادِ خداوندی ہے لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قَاتَلَ۔ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَ قَاتَلُوْا۔ (۵۷/۱۰) تم میں سے ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے اس راہ میں مال خرچ کیا اور اپنی جانیں لڑائیں۔ دوسرا وہ ہے جنھوں نے فتح کے بعد ایسا کیا۔ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اول الذکر اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (۹/۱۰۰) کا گروہ ہے جس کے مدارج بہت بلند ہیں۔

لہٰذا، برادرانِ عزیز! آپ کو اس سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیئے کہ راستہ بہت طویل اور

منزل بڑی کٹھن ہے۔ آپ کے دل میں اس قسم کے خیالات نہیں آنے چاہئیں کہ ہمیں کوشش کرتے اتنا عرصہ ہوگیا، اس کا کوئی نتیجہ ہمارے سامنے ابھی تک نہیں آیا۔ ہماری زندگی اگر اسی میں ختم ہوگئی تو ہمیں کیا حاصل ہوا؟ اگر آپ کے دل میں کبھی اس قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے قرآنی تحریک کو سمجھا ہی نہیں۔ اس میں "السابقون الاولون" کے حصے میں محنت اور مسلسل محنت، مشقت اور پیہم مشقت ہوتی ہے۔ انہوں نے قرآنی فکر کی فصل بونی ہوتی ہے۔ اس کی کٹائی معلوم نہیں کس کے حصے میں آتے۔ باقی رہا یہ کہ اس مسلسل محنت سے ہمیں کیا ملے گا تو یہ بات ذہنی طور پر سمجھنے اور سمجھانے سے کہیں زیادہ قلبی طور پر محسوس کرنے کی ہے۔ جو لوگ اس کا احساس رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ حق و صداقت کے راستے پر چلنے کا صلہ کیا ہوتا ہے؟ انہیں تو جو لذت راستہ چلنے میں ملتی ہے وہ حصولِ منزل میں بھی نہیں ملتی! یہی وہ لذت ہے جس سے محظوظ ہو کر وہ پکار اٹھتے ہیں کہ

طپیدن و نرسیدن چہ لذتے دارد
خوشا دلے کہ بدنبالِ محمل است ہنوز

نصب العین کی صداقت پر ایمان۔ راستہ کے مستقیم ہونے پر یقین اور ہم آہنگ و ہم نظر رفقائے سفر کی معیت! اس سے زیادہ صلہ اور کیا چاہیئے۔

مشو اے غنچۂ نورستہ دلگیر ازیں بستاں سرا دیگر چہ خواہی
لب جو، بزمِ گل، مرغِ چمن سیر صبا، شبنم، نوائے صبحگاہی

ذَالِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۳/۱۴) وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى (۸۷/۱۷)۔

رفیقانِ محترم! جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے یہ وقت آپ کے لئے کڑے امتحان کا ہے اندازہ یہ ہے کہ آئینی کمیشن اپنی سفارشات کی ترتیب میں زیادہ دیر نہیں لگائے گا۔ اس لئے آپ کے پاس وقت تھوڑا اور کام بہت زیادہ ہے۔ پروگرام آپ کے سامنے یہ ہے کہ قرآنی فکر کو زیادہ سے زیادہ عام کیجئے۔ میں نے قرآنی آئین کے اصولوں کو الگ مرتب کر دیا ہے اسے میں دوسری نشست میں آپ کے سامنے پیش کرنے والا ہوںؔ۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ اس پمفلٹ (اور اس سے

ؔ یہ مقالہ پرویز صاحب کے مجموعۂ مضامین — بہارِ نو — میں چھپ چکا ہے۔

متعلق دوسرے پمفلٹوں) کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچائیں۔ پھر جو لوگ علیٰ وجہ البصیرت اور بہ طیبِ خاطر آپ سے متفق ہوں، ان سے کہیں کہ وہ آئینی کمیشن کے سوالنامہ کے جواب میں مطالبہ کریں کہ ہم پاکستان میں اس انداز کا قرآنی آئین چاہتے ہیں۔ آئینی کمیشن کے بعد یہی مطالبہ اربابِ حکومت کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ اگر یہ آواز پاکستان کے اطراف و جوانب سے آئینی کمیشن اور اربابِ حکومت تک پہنچ جائے تو آپ کی کامیابی یقینی ہے۔ یہ جمہوری دور ہے، اس میں جمہوری اور آئینی طریق پر جو قدم اٹھایا جائے گا، نتیجہ خیز ہو کر رہے گا۔ مجھے اس پیغام کی صداقت پر اس قدر اعتماد ہے کہ میں گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز\
اس چمن کی ہر کلی دردآشنا ہو جائے گی!

اس ضمن میں ایک اور چیز بھی قابلِ غور ہے۔ جیسا کہ آپ نے طلوعِ اسلام کی اپریل ۱۹۶۰ء کی اشاعت کے لمعات میں دیکھا ہوگا۔ دنیا سے اب انسانوں کے خود ساختہ مذاہب کا دور ختم ہو رہا ہے۔ زمانے کے تقاضے ہر اس تصورِ حیات اور نظریۂ زندگی کو روندتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں جو ان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ پاکستان بھی اس فضا سے غیر متاثر نہیں رہ سکتا تھا۔ اسی کا اثر ہے کہ ہمارے ہاں کا (بالخصوص) نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے متنفر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اگر اس وقت ان تک قرآن کی آواز پہنچ گئی تو وہ مذہب کو چھوڑ کر، خدا کے دین کی طرف آجائیں گے لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو وہ دہریت اور کمیونزم کی آغوش میں چلے جائیں گے۔ اس کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اس نقطۂ خیال سے بھی دیکھیے تو اس ذہنِ قرآنی فکر کا عام کرنا اشد ضروری ہو چکا ہے۔ اس وقت، اس اجتماع میں میرے سامنے کئی احباب ایسے ہیں جن کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ اگر ان کے سامنے قرآنی فکر نہ آتی تو وہ مذہب سے برگشتہ ہو کر نہ معلوم کہاں پہنچ چکے ہوتے۔

نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ مے خانہ\
تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے

لہٰذا، برادرانِ عزیز! ان مذہب گزیدہ نوجوانوں کی حفاظت کی ذمہ داری بھی آپ پر عاید ہوتی ہے۔ آپ کے سوا کوئی اور جماعت ایسی نہیں جو خالص دینِ خداوندی کی طرف دعوت دیتی ہو اور

یہ چیز ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں۔

نہ ہر کس از محبت مایہ دار است ‏ ‏ ‏ ‏ نہ با ہر کس محبت سازگار است

بروید لالہ با داغِ جگردار ‏ ‏ ‏ ‏ دلِ لعلِ بدخشاں بے شرار است

قرآن کی طرف دعوت دینا تو ایک طرف، ہمارے ہاں ابھی تک (بہ فیضِ اجارہ دارانِ مذہب) اکثریت ان لوگوں کی ہے جو خالص قرآن کی آواز سننا تک گوارا نہیں کرتے۔ ان کی طرف جایئے تو وہ دور سے کہہ دیں گے کہ

ہمیں سکون میسّر ہے ظلمتِ شب میں
ہمارے سامنے نورِ سحر کا ذکر نہ کر!

لیکن چمگادڑوں کی چیخ و پکار سے طلوعِ آفتاب نہیں رُکا کرتا۔ وہ اپنے وقت پر وجہ تابانیِ عالم بن کر رہتا ہے۔ وقت کے تقاضے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ رات کی تاریکیاں چھٹنے کو ہیں طلوعِ سحر قریب ہے۔ اب

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہو گا!
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا
گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان مے خانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہو گا

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ ۔ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (۶۱/۸)

عزیزانِ من! جب میں کہتا ہوں کہ دنیا میں اب "مذہب" کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے تو یہ حقیقت ہے، نہیں میرے تصور کی یہ خلاقی ـــ (یاد رہے کہ مذہب سے میری مراد، انسانوں کے خودساختہ تصورات ومعتقدات ہیں، نہ کہ خدا کا عطا فرمودہ دین)۔ تاریخِ عالم یہ تو بتاتی ہے کہ اگر کسی جگہ کبھی ایک مذہب کا اثر کم ہوا تو اس کی جگہ کسی دوسرے مذہب نے لے لی۔ لیکن نفسِ مذہب کی طرف سے تنفر، اور وہ بھی اس قدر وسیع اور عالمگیر پیمانے پر، اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ مذہب سے عالمگیر تنفر اس امر کی دلیل ہے کہ انسان کا ذہن اب عہدِ طفولیت سے نکل کر، عالمِ شباب کی

طرف آرہا ہے۔ اس لئے اب اسے نہ توہمات کے چھلاووں سے ڈرایا جاسکتا ہے اور نہ موہوم امیدوں کے کھلونوں سے بہلایا۔ اب یہ ہر دعوے کی صداقت کے لئے دلیل و برہان مانگے گا اور اسے علم و بصیرت کی رُو سے تسلیم کرے گا۔ اب اسے اس قسم کی کمزور "دلیلیں" مطمئن نہیں کرسکیں گی کہ فلاں راستے پر اس لئے آنکھیں بند کرکے چلتے جاؤ کہ تمہارے آباؤ اجداد اسی راستے پر چلتے آئے ہیں' اور فلاں کام اس لئے کرو کہ ایسا ہوتا چلا آرہا ہے۔ اب "ابنِ آدم" جوان ہو رہا ہے۔ اب یہ سنِ رُشد کو پہنچ رہا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اب عالمگیر پیمانے پر انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ مذہب پرست طبقہ کے لئے یہ انقلاب فی الواقعہ پیغامِ فنا ہے۔ اس لئے ان کا شور و شیون اور آہ و نالہ قابلِ فہم ہے۔ لیکن یہی بات خدا کے عطا فرمودہ الدّین کے حامیوں کے لئے مقامِ جشن و مسرت ہے۔ اس لئے کہ مذہب کا زوال' دین کے فروغ کی اور قدامت پرستی کی موت حق پرستی کی حیات کی نشانی ہے:

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب اُبھرا، گیا دورِ گراں خوابی

تیمار دارانِ مذہب کے چہرے کی اڑی ہوئی ہوائیاں اور پراگندہ بال۔ ان کا بات بات پر جھلا اٹھنا اور ہوش و سکون کھو بیٹھنا، اس حقیقت کے غماز ہیں کہ اب انہیں بھی مریض کے جانبر ہونے کی امید نہیں اور وہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور خاموشی ہی خاموشی میں کہہ رہے ہیں کہ

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر آثر کی ہمیں تو آس نہیں

دوسری طرف' یہی علامات متبعینِ دینِ خداوندی کے لئے تشدید کامرانی اور نوید نابانی ہیں۔ وہ جب ان حالات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو بلا تامل اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ

یہ ڈوبتے تارے یہ فسردہ سا رُخِ ماہ
آثار بتاتے ہیں سحر ہوکے رہے گی

مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ دنیا اب اس نئے دور میں داخل ہونے کے قریب ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (۸۳/۶) جب پوری انسانیت خدا کی ربوبیتِ عالمینی کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ (۸۲/۱۹)۔ اور جب حکم صرف خدا کا چلے گا۔

اور کسی کا نہیں۔ یہی وہ دور ہے جس کی آمد کی علامات کو بھانپ کر ابلیس نے اپنے مشیروں سے کہا تھا کہ۔ ؎

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر — حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف — منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!

یہی وہ خوف تھا جس سے ڈر کر اس نے اپنے مریدوں سے کہا تھا کہ

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے — یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

اس نے کہا تھا کہ یاد رکھو!

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات

اس کے لئے اس نے پروگرام یہ تجویز کیا تھا کہ تم اس قسم کے مسائل کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دو اور ہر محراب و منبر سے انہیں دہراتے چلے جاؤ کہ۔

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے — ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنیوالے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے — یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
کیا مسلماں کیلئے کافی نہیں اس دور میں — یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

اور ان سے تاکید کی تھی کہ

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اسکے سب مہرے ہوں مات
ہے وہی شعر و تصوف اسکے حق میں خوب تر — جو چھپا دے اسکی آنکھوں سے تماشائے حیات

؎ ارمغانِ حجاز۔ (علامہ اقبالؒ) - ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔

اس نے پھر اپنے اس خدشہ کو ظاہر کیا اور کہا کہ

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

لہذا

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

لیکن اب آپ دیکھیے کہ "ابلیس" کی یہ تمام تدابیر کس طرح ناکام ہوتی چلی جارہی ہیں۔ اب کسی کو ان مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ

ابن مریمؑ مر گیا یا زندۂ جاوید ہے

اس لئے اب آپ کو محراب و منبر سے یہ آوازیں سنائی نہیں دیں گی۔ اب زمانہ زندگی کے عملی مسائل کا حل چاہتا ہے۔ اور زندگی کے عملی مسائل کا حل، قرآن کریم کے علاوہ اور کہاں سے مل سکتا ہے؟ یہ وجہ ہے کہ اب ملا بھی مجبور ہو رہا ہے کہ اپنے مواعظ و خطبات میں قرآن کی باتیں کرے۔ آپ مختلف مساجد میں خطبات سنیں۔ آپ کو یہ انداز قریب قریب ہر جگہ ملے گا کہ اول و آخر طلوع اسلام کو گالیاں دی جائیں گی اور خطبہ کا سارا متن طلوع اسلام کے کسی مقالہ پر مشتمل ہوگا۔ طلوع اسلام کو گالیاں اس لئے دی جاتی ہیں کہ ان حضرات کا غرورِ نفس اور جھوٹی عزت کا احساس انہیں اعترافِ حقیقت کی طرف آنے نہیں دیتا۔ قرآن کے الفاظ میں وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (۲/۲۰۶) جب اس سے کہا جاتا ہے کہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو تو غرورِ نفس اس کا دامن پکڑ لیتا ہے اور صحیح راستہ کی طرف جانے نہیں دیتا۔ قرآن کریم کی مئے طہور و مختوم کا انہیں چسکا پڑ چکا ہے۔ نیز ہر طرف سے مانگ بھی اسی کی ہے اس لئے یہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتے لیکن کھلے بندوں شریکِ محفل ہونے کی اپنے اندر جرأت بھی نہیں پاتے۔ ان کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ

پہلے تو آ کے شیخ نے دیکھا ادھر ادھر
پھر سر جھکا کے داخلِ میخانہ ہو گیا

بلکہ اس سے بھی حسین تر انداز میں یوں کہ

حیا بگوشۂ آں چشمِ مست حبا کردہ
چوں زاہدے کہ بہ بزمِ شراب می آید

لیکن برادرانِ عزیز! زمانے کے تقاضے اگر مذہب کا تاریک دور ختم کر رہے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ حضرات کی کوشش سرد پڑ جائیں۔ بالکل نہیں۔ اس کے برعکس یہی وقت تو آپ کی کوششوں کو تیز تر کرنے کا ہے۔ دیکھئے! قرآن کریم اس حقیقت کو کیسے دلکش اور بلیغ انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ۔ خوشگوار نظریۂ حیات میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بلند ہوتا جائے۔ یہ کچھ خدا کے قانونِ کائنات سے ہوتا ہے جسے عام طور پر زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ لیکن، جیسا کہ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے، قانونِ کائنات کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ "خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔" اس لئے اس آیت کے بعد کہا کہ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ (۳۵/۱۰) "انسانوں کے اعمالِ صالحہ اس نظریہ کو اوپر اٹھاتے ہیں۔" جب انسانی ہاتھ، کائناتی قوانین کو سہارا دیتے ہیں تو ان کی رفتار اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ یہ فضائے بسیط رہ یک گام سے زیادہ کچھ نہیں رہتی اور ہر دیکھنے والا پکار اٹھتا ہے کہ

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

لہٰذا، اے ظلمتِ شب میں قندیل بردارانِ پیامِ قرآنی! قدم بڑھاؤ کہ نشاناتِ منزل سامنے ابھرتے چلے آرہے ہیں۔ ایک دنیا تمہارے پیغام کے لئے گوش برآواز ہے۔ دیکھنا! اس وقت کہیں تھک کر بیٹھ نہ جانا کہ اس کے بعد آپ کو عمر بھر اس کا افسوس رہے اور باصد حسرت و یاس کہنا پڑے کہ

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

آپ کی بیداری میں، انسانیت کی بیداری کا راز مضمر ہے۔ اس لئے قُمْ فَاَنْذِرْ۔ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ۔ وَ ثِیَابَکَ فَطَهِّرْ۔ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ (۷۴/۲-۵)

زمانے کے تقاضے کس طرح دنیا کو قرآن کے قریب لاتے جا رہے ہیں، اور مذہب پرست طبقہ کو کس طرح ان کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ اس کی ایک مثال سالِ گزشتہ ہمارے سامنے آچکی ہے یعنی

پاکستان میں زرعی اصلاحات - ہمارا مذہب پرست طبقہ، صدیوں سے یہ فتویٰ دیتے چلا آرہا ہے کہ زمین پر انفرادی ملکیت "شریعت حقہ" کے عین مطابق ہے اور اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ حکومت نے ملکیت کے رقبوں کی تحدید سے اس فیصلہ کو باطل قرار دے دیا اور جمہور نے اسے اس قدر پسند کیا کہ قدامت پرست طبقہ کو اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہیں ہوسکی۔ اس سال حکومت نے ایک اور فیصلہ کیا ہے جو مروجہ قانون شریعت کے مقابلہ میں قرآنی احکام سے قریب تر ہے۔ مروجہ "شریعت" کی رُو سے یتیم پوتوں کو دادا کی وراثت سے حصہ نہیں مل سکتا۔ کسی کو اپنی جائیداد میں وصیت کا پورا حق حاصل نہیں ہوتا۔ چار تک بیویاں کر لینے کی کھلی چھٹی ہے۔ مرد کو حق حاصل ہے کہ وہ جس وقت چاہے بیوی کو طلاق دیدے لیکن عورت اس معاملہ میں بے بس ہے۔ ان خلاف قرآن احکام سے معاشرہ میں اس قدر خرابیاں پیدا ہوئیں کہ مظلوم طبقہ نے ان کے خلاف آواز اٹھانی شروع کی۔ اس سے متأثر ہوکر سابقہ حکومت نے عائلی کمیشن مقرر کیا جس نے (جون ۱۹۵۶ء میں) اپنی سفارشات پیش کیں۔ اگرچہ یہ سفارشات تمام کی تمام بالکلیہ قرآن کے مطابق نہیں تھیں لیکن مروجہ شریعت کے مقابلہ میں قرآن سے قریب تر ضرور تھیں۔ (ان سفارشات پر اگست ۱۹۵۶ء کے طلوع اسلام میں تبصرہ کیا گیا تھا)۔ اخبارات میں شائع شدہ اعلان کے مطابق، حکومت نے اب ان سفارشات کو منظور کر لیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے گا۔ اس طرح ان مظالم کا بڑی حد تک تدارک ہو جائے گا جو انسانوں کے خودساختہ قوانین نے صدیوں سے مظلوم طبقہ پر روا رکھ چھوڑے تھے۔ ہم حکومت کو اس کے اس مستحسن اقدام پر درخور مبارکباد سمجھتے ہیں اور استدعا کرتے ہیں کہ وہ جلد از جلد ایسا انتظام کرے جس سے ملک کے تمام مروجہ قوانین، قرآن کریم کے مطابق ہو جائیں اور آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ ہو سکے جو قرآن کے خلاف ہو۔ یہ مقصد آئین پاکستان کی رُو سے حاصل ہو سکے گا۔ لہٰذا بات پھر وہیں آگئی کہ اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ کانسٹی ٹیوشن کمیشن تک یہ آواز پہنچائی جائے کہ وہی آئین اسلامی کہلا سکتا ہے جو قرآن کریم کے اصولوں کے مطابق ہو۔

(۰)

تحریک طلوع اسلام کی تنظیم

اب مجھے، برادران عزیز! آپ سے کچھ باتیں اپنی تحریک تنظیم کے متعلق کرنی ہیں۔ جیسا کہ میں شروع سے کہتا چلا

آرہا ہوں، اس تحریک کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ مذہبی فرقے سے۔ یہ قرآنی فکر کے عام کرنے کی ایک منظم کوشش ہے۔ جہاں تک اس قرآنی فکر کا تعلق ہے جو ہماری طرف سے پیش کی جاتی ہے، اس کی بابت اچھی طرح سے سمجھ لیجئے کہ اگر آپ اس فکر کو اس لئے صحیح سمجھتے ہیں کہ وہ میری فکر ہے، یعنی آپ کے پاس اس کے صحیح ہونے کی سند یہ ہے کہ اسے "پرویز صاحب" کہتے ہیں تو یاد رکھئے کہ آپ نے نہ قرآنی فکر کو سمجھا ہے اور نہ اس تحریک کو۔ قرآنی فکر کے لئے نہ "پرویز صاحب" سند ہو سکتے ہیں نہ کوئی اور انسان۔ میں اپنی بصیرت کیمطابق قرآنی فکر پیش کرتا ہوں۔ آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ از خود قرآن کریم پر غور و فکر کے بعد فیصلہ کریں کہ میری فکر صحیح ہے یا نہیں۔ اگر آپ اس طرح از خود غور و فکر کے بعد اسے صحیح سمجھتے ہیں تو اسے مانئے۔ آپ کا اسے اس طرح صحیح ماننا، میری سند سے نہیں ہوگا بلکہ براہِ راست قرآن کریم کی سند سے ہوگا۔ اسے اچھی طرح سن رکھئے کہ جس دن آپ نے دین کے معاملہ میں، قرآن کریم کے بجائے کسی انسان کو سند مان لیا، آپ نے فرقہ بندی کی بنیاد رکھ دی۔ اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ فرقہ پرستی قرآن کی رُو سے شرک ہے۔

جو احباب، اس طرح غور و فکر کے بعد طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کو صحیح سمجھیں ان کی باہمی تنظیم کا نام "بزمِ طلوعِ اسلام" ہے جس کا مقصد اس فکر کو عام کرنا ہے۔ اراکین بزم کے لئے ضروری ہے کہ وہ آپس میں محبت اور مؤدت سے رہیں۔ ان کی زندگی رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کی جیتی جاگتی تصویر ہو۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انہیں ایک دوسرے پر بھروسہ ہو۔ نصب العین کی وحدت اس قسم کا بھروسہ پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ تنظیمی معاملات میں چھوٹے چھوٹے اختلافات کو اہمیت نہ دیں۔ اپنی بات منوانے پر ضد نہ کریں۔ دوسرے کو اپنے دل میں سمو لینے کیلئے آخری حد تک کوشش کریں۔ یاد رکھیئے آپ کی تسبیح کا ایک ایک دانہ بڑا قیمتی ہے۔ یہ منتشر موتی خدا خدا کر کے جمع ہوئے ہیں انہیں بکھرنے نہ دیجئے۔

لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ جو شخص آپ کی پیش کردہ قرآنی فکر سے یکسر متفق نہ ہو، اسے اپنے ساتھ رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کی یہ تنظیم پولیٹیکل پارٹیوں کی تنظیم سے بالکل مختلف ہے۔ پولیٹیکل پارٹیوں کی تقویت کا راز ممبروں کی تعداد میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہاں ووٹ گنے جاتے ہیں اور انہیں کے شمار سے پارٹی کا مقام متعین ہوتا ہے۔ اس لئے پولیٹیکل پارٹیوں

کو ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ان کی تائید میں ہاتھ اٹھاتے والوں کو ہر قیمت پر اپنے ساتھ رکھیں لیکن آپ کی تنظیم ہم آہنگیٔ فکر ونظر کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس لئے جو شخص اس قرآنی فکر کو عام کرنے میں دل وجان سے آپ کے ساتھ شریک نہیں، اسے باندھ کر ساتھ رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ قرآن کی محبت جس شخص کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکی ہے، وہ اگر کسی وقت کسی ہنگامی جذبہ سے مغلوب ہو کر، آپ سے علیحدگی بھی اختیار کر لیتا ہے تو وہ، زود یا بدیر، پھر آپ کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔

اُٹھ کر تیرے دَر سے جانے والے
لوٹ آئیں گے پھر کسی بہانے

اس لئے کہ ایسی رفاقت اسے کہیں اور نہیں مل سکے گی۔ لیکن جس کے دل میں لگی نہیں، اسے آپ بہ جبر اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے:

عشق پر زور نہیں۔ ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے!

البتہ آپ اپنی اس کوشش کو جاری رکھیئے کہ جو آگ آپ کے دل میں بھڑکی ہے، اس کے دل میں بھی بھڑک اٹھے۔

یوم الحساب

رفیقانِ گرامی قدر! ایک اور سوال بھی بڑا اہم اور قابلِ غور ہے۔ آپ ہر سال کنونشن میں جمع ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان اجتماعات سے مقصد کیا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ ایسی تقاریب میں ہم فکر احباب ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ نیا ولولہ خیالات ہوتا ہے۔ باہمی رابطہ بڑھتا ہے، فہم قرآن کے سلسلہ میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں، ان کا حل مل جاتا ہے، بہت سے نکات واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ مقاصد بھی بڑے خوشگوار ہیں۔ لیکن کنونشن کا بنیادی مقصد کچھ اور ہے۔ یہ اجتماع آپ کے لئے "یوم الحساب" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں آپ نے اپنا محاسبہ کرنا ہوتا ہے آپ نے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ جو فیصلے سابقہ کنونشن میں ہوئے تھے، ان پر کہاں تک عمل درآمد ہوا۔ جن عزائم کا اظہار آپ نے ایک سال پہلے کیا تھا وہ کس حد تک عملی پیکروں میں آسکے۔ جو پروگرام آپ نے

پچھلے سال طے کیا تھا، اس کی کہاں تک تکمیل ہوئی۔ اگر آپ نے اس طرح احتسابِ خویش کا فریضہ ادا کیا تو آپ کے اجتماع کا مقصد پورا ہو گیا۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر یہ اجتماع "ہجوم مومنین" سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔ اگر اس محاسبہ کے بعد یہ نظر آئے کہ ہمارا قدم آگے بڑھ رہا ہے تو ہمارا شمار زندہ انسانوں میں ہوگا۔ ہماری منزل قریب آتی جائے گی اور اس کی توقع کی جا سکے گی کہ ہم ایک دن وہاں پہنچ کر رہیں گے ذَالِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (۴۵/۳۰)۔ اگر ہم دیکھیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں پچھلے سال تھے، تو یہ بے جان پتھروں کی حالت ہے، زندہ انسانوں کی نہیں۔ جمود و تعطل اور موت میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

دمادم نقش ہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

اور اگر آپ (خدانکردہ) دیکھیں کہ آپ کا قدم پیچھے ہٹ گیا ہے۔ آپ میں اتنی زندگی اور حرارت بھی نہیں جتنی سالِ گزشتہ تھی، تو یہ وہ حالت ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ (۹۵/۵) پھر ہم اسے پست سے پست ترین حالت کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔ ایسی حالت کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

اس کے دل سے پوچھئے، اس کے جگر سے پوچھئے
آج جس کی منزلِ مقصود، کل سے دور ہو!

لہٰذا، برادرانِ عزیز! آپ اس اجتماع میں اپنا محاسبہ کیجئے اور دیکھئے کہ قرآن کریم کی رُو سے، آپ کا شمار زندہ انسانوں میں ہوتا ہے، پتھر کی سلوں میں ہوتا ہے یا اسفل سافلین میں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا جائزہ آپ کو ایک ایک قدم پر لینا چاہیئے۔ زندگی نام ہی محاسبہ خویش کا ہے۔ آپ جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ کچھ کرتے نہیں تو آپ زندگی سے شاعری کرتے ہیں۔ وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ (۲۶/۲۲۶)۔ اور اگر آپ کی (خدانخواستہ) نفسیاتی حالت ایسی ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (۳/۱۸۷) وہ چاہتے ہیں کہ ان کی

تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنھیں وہ سرانجام نہیں دیتے" تو یہ خود فریبی بھی ہے اور خدا فریبی بھی۔ جو جماعت قرآنی پیغام کو عام کرنے کا دعوےٰ کرے، اس کی کیفیت قطعاً ایسی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس کے دعوےٰ کا ثبوت اس کے اعمال کے زندہ نتائج ہونے چاہئیں۔ یاد رکھیئے! خدا کی میزان میں وزن اعمال کا ہوتا ہے، باتوں کا نہیں۔ بڑی باتیں کرنا شاعری ہے جو ایک داعیٔ انقلاب کے قطعاً شایانِ شان نہیں۔ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (۳۶/۶۹) اسی حقیقت کا اعلان ہے۔ آپ جس انقلاب آفریں آواز کو لے کر اٹھے ہیں اس کی اہمیت کو سامنے رکھیئے۔ اور پھر سوچیئے کہ آپ کی ذمہ داری کس قدر عظیم ہے اور آپ کی زندگی کا ایک ایک سانس کس قدر قیمتی ہے۔ اس صفحۂ ارض پر صرف آپ کی مٹھی بھر جماعت ہے جو قرآنی نظام کے قیام کی دعوت لے کر اٹھی ہے۔ دنیا کی نگاہیں یہ دیکھنے کے لئے آپ کی طرف لگ رہی ہیں کہ جس نظام کے متعلق یہ بلند آہنگ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی تمام مشکلوں اور مصیبتوں کا حل اپنے اندر رکھتا ہے وہ کب قائم ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے ریسرچ اسکالرز مجھے ملنے کے لئے آتے ہیں۔ میں ان کے سامنے قرآنی نظام کا تصور پیش کرتا ہوں تو ان کی نگاہوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس کے لئے ہمہ تن ستائش ہوتے ہیں لیکن دبی زبان سے کہتے ہیں کہ معلوم نہیں اس زمانے میں اس قسم کا نظام عملاً متشکل بھی ہو سکے گا یا نہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ہم اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں تو ان کا الوداعی فقرہ یہ ہوتا ہے کہ ہم آپ کی کوششوں کے نتائج کا بڑی بے تابی سے انتظار کریں گے۔ اس سے برادرانِ من! اندازہ لگایئے کہ آپ نے کتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے۔ اور اس سے عہدہ برا ہونا کس قدر ضروری ہے۔ آپ کی کوششوں کے ساتھ پوری کی پوری انسانیت کا مستقبل وابستہ ہے۔ اگر آپ نے اپنے فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کی تو سوچیئے کہ آپ کائنات کی عدالت میں کتنے بڑے مجرم قرار پائیں گے۔ اس لئے اس پیغام کے عام کرنے میں پوری تندہی سے کام کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ انسان کی تقدیر، جس نے آپ سے اس قدر درخشندہ توقعات وابستہ کر رکھی ہیں، پھر مایوس ہو جائے اور باصد حسرت و غم پکار اٹھے کہ

مدتوں کے بعد اذنِ تبسم ملا ہمیں!
وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

عزیزانِ گرامی قدر! میں نے آپ سے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا۔ امسال میرا یہ خطاب مقابلتہً مختصر ہے۔ یہ اس لئے کہ قرآنی آئین کے متعلق مجھے جو کچھ آپ سے تفصیل سے کہنا ہے اسے عام اجلاس میں پیش کیا جائے گا۔ میں آپ احباب کا بدل مشکور ہوں کہ آپ سفر کی صعوبات برداشت کر کے اِس اجتماع میں شریک ہوئے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، آپ احباب کے یہ اجتماعات میری تنہائیوں کو انجمن میں بدل دیتے ہیں اور اس سے میری زندگی بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالٰے آپ کے اخلاص و محبت کی وسعتوں اور گہرائیوں میں اضافہ کرے اور جس مقدس مقصد کو لے کر آپ اُٹھے ہیں اس کامیابی میں اس کی کائناتی قوتیں آپ کے شریکِ حال ہوں۔ میری تو اب کیفیت یہ ہے کہ زندگی کا ایک ایک لمحہ اس نظامِ ربوبیت کے انتظار میں گزر رہا ہے جو جنت سے نکلے ہوئے آدم کو پھر سے فردوس بداماں کر دینے کا ضامن ہے۔ میں دن رات اسے پکار پکار کر آوازیں دیتا ہوں کہ

آ۔ اے میری بیتاب نگاہوں کے سہارے
مدت سے تیری راہ گذر دیکھ رہا ہوں

مجھے یقین ہے کہ میری اس معصوم آرزو میں آپ تمام احباب کی حسین آرزوئیں بھی شامل ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

پرویز

دُوسرا اجلاس

۸ را پریل ۔۔۔ دن کے چار بجے ہیں اور ایوانِ کنونشن میں اپنی نوعیت کا وہ عدیم المثال اجلاس شروع ہوتا ہے جس میں مفکرِ قرآن آئینِ پاکستان کے سلسلہ میں وہ تاریخی خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں جو پاکستان کی تاریخ میں نشانِ منزل کی حیثیت اختیار کرے گا اور انسانی فکر و بصیرت کے شاہکاروں میں ایک نئے اور لازوال شاہکار کا اضافہ کرے گا۔

اجلاس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے کھلا اجلاس قرار دیا گیا ہے اور سب کے لئے شرکت کا اذنِ عام ہے۔ اس لئے وقت مقررہ سے پہلے ہی ایوانِ کنونشن میں کافی گہما گہمی نظر آ رہی تھی اور جب

اجلاس شروع ہوتا ہے تو ایوان آخری گوشوں تک کھچا کھچ بھر چکا ہے اور باہر سے لوگ قطار در قطار چلے آرہے ہیں۔ اسٹیج کے دامن میں ٹیپ ریکارڈروں کی ایک قطار سی میزوں پر سج گئی ہے ان ریکارڈروں کے ذریعے یہ آواز پاکستان سے باہر غیر ممالک میں بھی پہنچ جائے گی۔

تلاوتِ کلامِ پاک اور نظم کے بعد پرویز صاحب کو دعوتِ خطاب ملتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اسٹیج پر پہنچ کر اپنی مخصوص نشست سنبھال لیتے ہیں اور منتظر نگاہوں کی کشمکشِ انتظار ختم کر دیتے ہیں۔ پوری فضا اس پیامِ حیات کے لئے گوش بر آواز دکھائی دیتی ہے جو پاکستان اور اسلامی دنیا کے صدیوں کے اُلجھے ہوئے عظیم ترین مسئلہ کو حل کر کے رکھ دے گا۔

مفکرِ قرآن کی آواز آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہوتی ہے۔ ٹیپ ریکارڈنگ کی مشینیں حرکت میں آ گئیں اور اس کے ساتھ ہی رپورٹروں کے قلم بھی۔ پرویز صاحب کے ولولہ ہائے شوق کی سرمستیاں اور حسنِ خطابت کی معجز نمائیاں نہ پوچھئے! اسی مسئلہ کا حل ساری زندگی ان کا شاہدِ مقصود بنا رہا۔ اسی کے محور پر سالہا سال تک ان کے فکر و بصیرت کی گردش جاری رہی۔ اسی متاعِ بے بہا کو وہ مدت سے اپنے قافلے میں لٹاتے اور ٹھکانے لگاتے چلے آئے۔ اسی فلسفۂ انقلاب کو محسوس و مشہود دیکھنے کے لئے ان کی زندگی کی سینکڑوں راتیں طلسمِ پیچ و تاب بنی رہیں۔ اور آج جب کہ اربابِ بست و کشاد کا قافلہ خود آگے بڑھ کر قرآن کے بابِ عالی پر دستک دے رہا ہے۔ پردۂ شب سے اُبھرتی ہوئی اس صبحِ امید کی ایک ایک کرن اس دانائے راز کی حسین ترین آرزوؤں اور قلندرانہ دعاؤں سے ہم آغوش ہوتی نظر آرہی ہے۔

پرویز صاحب کا خطاب شروع ہوتا ہے :-

"اسلامی آئین کے بنیادی اصول[1]"

خطاب کیا ہے بارہ ابواب پر مشتمل اسلامی آئین کا اُجلا اُجلا اور نکھرا نکھرا خاکہ ——— جس کے ایک ایک گوشے میں قرآنی فکر و بصیرت کی کرنیں جگمگا رہی ہیں۔ اور ایک ایک باب نور و نکہت کا شبستانِ جمال نظر آتا ہے۔ کم و بیش دو گھنٹے تک ایوان کی فضا جذب و مستی کی لذتوں میں کھوئی رہی اور عین اس

---

[1] یہ خطاب پرویز صاحب کے مجموعۂ مضامین ——— بہارِ نو ——— میں شائع ہو چکا ہے۔

وقت جب کہ سورج کی کرنیں کیف و سرور کی اس متاعِ بے بہا کو اپنے دامن میں سمٹائے افقِ مغرب میں غائب ہو رہی تھیں۔ پیرِ خمخانہ قرآن کے اس دو آتشہ کے آخری قطرات یہ کہہ کر وجہِ نشاطِ روح بنا رہے تھے کہ

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (۷/۴۷)

اگر تم نے قانونِ خداوندی کی ترویج و تنفیذ میں امداد کی تو خدا کا قانونِ حیات تمہاری مدد کریگا۔

اور تمہیں ثبات و قرار عطا فرمائے گا۔

وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹/۱۱۱)

اور یہ زندگی کی سب سے بڑی کامرانی ہے۔

پرویز صاحب کا یہ خطاب ختم ہوتے ہی بہت سے معزز مہمان دیوانہ وار اسٹیج کی طرف بڑھ رہے ہیں، تحریکِ پاکستان کے ایک مخلص اور ممتاز رہنما جو غیر ممالک میں سفارتی مناصب پر بھی فائز رہے ہیں، جھوم جھوم کر کہہ رہے ہیں۔

بہت خوب! بہت خوب! بڑی ہی لاجواب تھی علامہ پرویز کی یہ تقریر۔ ایسی علم افروز تقریر آج زندگی میں پہلی بار سنی ہے۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔

سیکورٹی اسٹاف کا ایک افسر ایک گوشے میں بیساختہ کہتا سنائی دے رہا ہے۔

یہ تقریر ملک کی قسمت بدل سکتی ہے۔ پرویز صاحب کا نام تو بہت سنا تھا لیکن ایسی جامع تقریر

واہ واہ! رپورٹ لینے آئے تھے لیکن بہت کچھ حاصل کر کے جا رہے ہیں۔

ایک کمیونسٹ جسے اس کا ساتھی مجبور کر کے ساتھ لایا ہے، پُرشوق نگاہوں سے پرویز صاحب کو ملاقاتیوں کے ہجوم میں گھرے ہوتے دیکھ رہا ہے اور اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔

ہاں رفیق! تم نے جو کچھ کہا تھا واقعی درست ہے۔ بڑی انوکھی فکر ہے اس شخص کی۔ اسلام اسے کارل مارکس کے مقابلے میں لا سکتا ہے۔ میں تو بے حد متاثر ہوا ہوں اس سے۔ کیا یہ تقریر چھپی ہوئی مل سکے گی!

الغرض ہر خیال اور ہر فکر کے لوگ اس مفکرِ قرآن کو اپنے اپنے الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ جس نے اپنی زندگی خدا کے اس آخری پیغام کو سمجھنے اور سمجھانے میں وقف کر دی۔ قرآن سے یہ والہانہ عشق

زندگی کی سب سے بڑی خوش نصیبی ہے۔

سالہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

—— (۰) ——

مجلسِ استفسارات

۹ر اپریل — چار بجے بعد دوپہر مجلسِ استفسارات کی صورت میں کنونشن کا پانچواں اجلاس شروع ہوتا ہے۔ کنونشن کے سالانہ اجتماعات میں اس مجلس کو شروع سے ایک خصوصی اور دلپذیر اہمیت حاصل رہی ہے۔ زندگی کے اہم ترین علمی مسائل سے متعلق بڑے دقیق سوالات مفکرِ قرآن کے سامنے لائے جاتے ہیں اور اسلامیات کا یہ عظیم اسکالر قرآنی فکر و بصیرت کی روشنی میں بڑی تفصیل سے ان کا جواب دیتا ہے۔ چنانچہ اس دفعہ بالخصوص تحریری سوالات کا جو پلندا ان کے سامنے لایا گیا ان میں سے ایک ایک سوال انتہائی دقتِ نظر کا محتاج ہے۔ اور پرویز صاحب اپنے مخصوص انداز میں ایک ایک سوال کا جواب اس حسن انداز سے نکھار نکھار کر پیش کرتے ہیں کہ ایوان وجد میں آجاتا ہے۔ قرآنی فکر و بصیرت کی ان معجز نمائیوں سے ہر طرف بے ساختہ یہ نعرۂ تحسین گونج اٹھتا ہے۔

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

اور اسٹیج کے پہلو سے ایک فقیرِ بے نوا جذب و مستی کے عالم میں پکار اٹھتا ہے

غواصِ محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

استفسارات کی کثرت اور وقت کی کمی کی وجہ سے طے یہ پایا کہ پہلے ان سوالات کو لیا جائے جن کا تعلق زندگی کے عملی مسائل سے ہے اور اس کے بعد نظری مسائل کی باری آئے۔ چنانچہ اول الذکر میں حسب ذیل استفسارات سامنے آئے۔

(۱) ربٰو اور بیع کی تعریف کیا ہے اور قرآن کی رُو سے ان کے احکام کیا ہیں؟

(۲) انشورنس کے متعلق، قرآن کا کیا حکم ہے؟

(۳) خاندانی منصوبہ بندی (FAMILY PLANNING) اور برتھ کنٹرول کے متعلق قرآن کی تعلیم کیا ہے۔؟

آپ نے غور فرمایا کہ یہ سوالات آجکل کس قدر اہمیت حاصل کئے ہوئے ہیں۔ لیکن جب اس قرآنی مفکر نے ان کے جوابات دیئے تو دلوں سے شکوک و شبہات کے تمام بادل چھٹ گئے اور اطمینان وسکون کی فضائیں جنتِ قلوب بن گئیں۔ پھر یہ سوالات سامنے آئے۔

(۱) طلوع اسلام کا دعویٰ ہے کہ اس کا تعلق کسی فرقے سے نہیں اور نہ ہی یہ خود کوئی نیا فرقہ پیدا کر رہا ہے؟ اس کا ثبوت کیا ہے؟

(۲) طلوع اسلام کہتا ہے کہ تم اسی طرح نماز پڑھو جس طرح پڑھتے چلے آرہے ہو۔ اس میں کسی قسم کی جدت پیدا نہ کرو۔ اس میں اور تقلید میں کیا فرق ہے؟

پرویز صاحب نے ان سوالات کا جواب اس حسن و خوبی سے دیا کہ مخالفین تک اس اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ واقعی طلوع اسلام اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔

ازاں بعد، قرآن کریم کی بعض اہم آیات کے مطالب کی باری آئی۔ پرویز صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں، ان کی تفسیر، لغت اور قرآن سے اس طرح کی کہ ان کے سمجھنے میں کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہا۔

یہ محفل اس قدر جذب و انہماک کا رنگ لئے تھی کہ کسی کو محسوس تک نہ ہوا کہ دو گھنٹے گذر گئے ہیں۔ تا آنکہ نمازِ مغرب کی اذان نے اس کے ختم کر دینے کی اطلاع دی۔ اس محفل کی یاد برسوں تک دلوں سے نہ جائے گی۔

افسوس ہے کہ ان سوالات کے جوابات فی البدیہہ دیئے گئے اس لئے ضبطِ تحریر میں نہ لائے جا سکے۔ ورنہ یہ ہمارے لئے بڑی قیمتی متاع ہوتی۔

(٥)

چھٹا اجلاس

ساڑھے آٹھ بجے شب کے قریب اس کھلے اجلاس کا آغاز ہوتا ہے۔ تلاوتِ کلامِ پاک اور نظم کے بعد پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم شروع ہوا۔ عنوان تھا۔

"قرآنِ کریم کی مستقل اقدار"

قارئین طلوعِ اسلام اور سامعین درسِ پرویز اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ پرویز صاحب کا قرآنی پیغام اس محور کے گرد گردش کرتا ہے کہ قرآن نے نوعِ انسان کو مستقل اقدار سے روشناس کرایا۔ اور اس طرح ان کے لئے زندگی کی نئی راہ متعین کر دی۔ آج کا درس اسی اجمال کی تفصیل پر مشتمل تھا۔ کنونشن کا اجتماع شہر سے بہت دور، ایک الگ بستی کی کھلی فضا میں ہوتا ہے۔ یہ درس رات کے وقت شروع ہوا۔ اور لوگوں کو اس کا علم تھا کہ یہ نصف شب سے پہلے ختم نہیں ہوگا۔ لیکن پرویز صاحب کے درسِ قرآن کی کشش کا یہ عالم ہے کہ شہر سے کثیر تعداد میں شمعِ قرآنی کے پروانے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں کہ وہ آدھی رات کے قریب وہاں سے شہر کس طرح واپس آئے؟ لیکن ولولۂ شوق ان موانعات کی پرواہ کب کرتا ہے!

قریب تین گھنٹے تک بصیرتِ قرآنی کی گہرباریوں کا یہ سلسلہ وجہ تسلی قلب ونظر بنا رہا۔ جذب و انہماک کا یہ عالم تھا کہ کسی گوشے سے اونچی سانس کی آواز تک نہیں آرہی تھی۔ درس کیا تھا، قرآنی حقائق اور علومِ حاضرہ کے افکار کا بے پایاں سمندر تھا جو اپنی تلاطم انگیزیوں سے، ریب و شکوک کے خس وخاشاک کو بہائے لئے جا رہا تھا۔

ساتواں اجلاس

۱۱ اپریل کا آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ آج کنونشن کا آخری اجلاس شروع ہو رہا ہے اور پرویز صاحب اس آخری اجلاس میں

"کیریکٹر کیا ہے؟"

کے موضوع پر خطاب فرما رہے ہیں۔ اتوار کی فراغت ہے۔ اس قدر اہم موضوع اور پھر سب سے بڑھ کر پرویز صاحب کا حسنِ بیان۔ جو دیوانے گزشتہ شب شہر سے اس دور افتادہ بستی میں ذرائع آمد و رفت کے فقدان کے باوجود کھنچے چلے آئے اور آدھی رات کے قریب واپس لوٹے تھے، ان کا وفورِ شوق اتوار کی صبح کے اس خطاب سے بے نصیب رہنا کیونکر قبول کرتا۔ چنانچہ جب .... نو بجے اجلاس شروع ہوا تو ایوان کی حاضری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اجلاس سے قبل ہی ایوان میں کہیں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور دوسری طرف خواتین کے حلقہ میں بھی یہی کیفیت نمایاں تھی۔

تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد ایک پُرسوز اور اثر آفریں نغمہ ایوان کی فضا میں مرتعش ہوا۔

آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است

اور جذب و مستی کی یہ والہانہ نذر حضور رسالتمآبؐ میں پیش ہوئی۔

زباں پہ بار الٰہا یہ کس کا نام آیا

فضا کیف و سرمستی کے عالم میں جھومنے لگی اور دل سوز و گداز کے تأثر سے گرما اُٹھے ــــ یہ آتش نوائی آہستہ آہستہ وقفِ سکوت ہو گئی لیکن قلب و نظر کو جس دولت سے مالا مال کر گئی وہ سرور انگیز اور لازوال تھی۔

اب پرویز صاحب خطاب کے لئے اپنی مخصوص نشست سنبھالتے ہیں۔ ان کی دلنشیں آواز آہستہ آہستہ فضا میں اُبھرتی ہے اور پھر اُس ساحرانہ انداز سے گونجنے لگتی ہے کہ سارے ہنگامے اس میں سمو جاتے ہیں۔

کیریکٹر کیا ہے؟ عملی زندگی کا یہ کس قدر اہم موضوع ہے چنانچہ وہ پہلے اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہر جگہ یہ چیخ و پکار سنائی دیتی ہے کہ لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ لیکن اگر بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ کیریکٹر کا کوئی قطعی اور طے شدہ مفہوم کہیں بھی ذہنوں میں موجود نہیں۔

پرویز صاحب نے پہلے کیریکٹر کے بارے میں مفکرینِ عالم کے مختلف اور متضاد مفہوم بالتفصیل پیش کئے اور واضح کیا کہ ان عظیم مفکروں میں کیریکٹر کے مفہوم کے متعلق بجائے خود کس قدر اختلاف اور تضاد موجود ہے۔

پھر انہوں نے ان مبہم تصورات کا خاکہ پیش کیا جو عام افراد کے ذہنوں میں کیریکٹر کے بارے میں جاگزیں ہیں۔ اور اس کے بعد انہوں نے کیریکٹر کے اُس جامع اور دو ٹوک مفہوم کی تفصیل شروع کی جو قرآنی فکر کی روشنی میں متعین ہوتا ہے۔ انہوں نے گزشتہ شب کی پیش کردہ مستقل اقدارِ قرآنی کا اعادہ کیا اور واضح کیا کہ ان مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا، اور جہاں ان مستقل انسانی اقدار میں سے کسی ایک قدر کی طبعی زندگی کی اقدار سے (TIE) پڑ جائے وہاں اُس کے مقابلے میں طبعی زندگی کی بڑی سے بڑی قدر کو قربان کر دینا، کیریکٹر ہے۔ انہوں نے مزید وضاحت فرمائی کہ دوسرے لفظوں میں انسانی اقدار کے مطابق زندگی گزارنے کا تصور ایمان کہلاتا ہے ــــ

اور جب ان اقدار کا طبعی اقدار سے مقابلہ ہو جائے تو ان کی حفاظت کے لئے بڑی سے بڑی طبعی قدر دے دینے کہ تمام طبعی اقدار کی قربانی "تقویٰ" قرار پاتی ہے۔

انہوں نے مزید واضح کیا کہ قرآن انسانی زندگی کی مستقل (اور اضافی) اقدار کا تعین کرتا ہے۔ اور پھر ان کی عالم آرا اہمیت کے پیش نظر ان کو بڑی ہی تفصیل کے ساتھ نکھار کر سامنے لاتا چلا جاتا ہے۔ مقامِ مومن یہی ہے کہ ان مستقل اقدار کو زندگی کا مرکز و محور قرار دیا جائے اور جب ان میں سے کسی ایک کی طبعی زندگی کی اقدار سے (TIE) پڑ جائے تو طبعی اقدار کو ان پر بے دریغ قربان کر دیا جائے۔ اسی سے اس عظیم اور لازوال کیریکٹر کی تعمیر ہوتی ہے جو ایک مومن کی زندگی کا طرۂ امتیاز ہے اور جو اسے حیاتِ جاوید عطا کر کے زندگی کی آئندہ منازل طے کرنے کا استحقاق بخشتا ہے۔ کیونکہ زندگی طبعی دائروں تک محدود نہیں' بلکہ ایک جوئے رواں و دواں ہے جس کا مقصود ہے مراحل و منازل کو حسن کارانہ انداز سے طے کرتے اور آگے بڑھتے چلے جانا ہے اور یہ مقام کیریکٹر سے حاصل ہوتا ہے جو قرآن کی عطا فرمودہ مستقل انسانی اقدار پر ایمان کا لازمی نتیجہ ہے۔

پرویز صاحب نے کیریکٹر کی یہ تفصیل اس حسین اور حقیقت کشا پیرائے میں بیان کی کہ کیریکٹر کے مفہوم کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کا مقصد اور مردِ مومن کا حقیقی مقام نکھر کر نگاہوں کے سامنے آ گیا اور فکر و نظر کی پہنائیوں میں گویا چراغ سے جگمگا اُٹھے۔[1]

الوداعی نشست

تین دن کی مسلسل انجمن آرائیوں، جوشِ اخوت کے قہقہوں اور وفورِ مسرت کی مسکراہٹوں کے بعد احباب الوداعی مجلس کی صورت میں جمع ہوتے ہیں۔ اب پھر کیف و سرور کی فضا میں ڈوبی ہوئی یہ انجمن نامعلوم مدت کے لئے بکھر جائے گی۔ غالب کے الفاظ میں:-

---

[1] یہ خطاب "بہارِ نو" میں شائع ہو چکا ہے۔

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ آخری اجلاس بڑی ہی صبر آزما کیفیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جذبات و حسیات کی شگفتگیاں مسکراہٹیں دیکھتے ہی دیکھتے افسردگی اور پژمردگی کی خزاں میں بدل جاتی ہیں جہاں تین دن تک یہ کیفیت رہی کہ

فرش سے تا عرش ایک سا طوفاں تھا موجِ رنگ کا

اُسی ایوان کی تصویر اب یہ تھی کہ

آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر!

بزمہائے طلوعِ اسلام اور رضاکاروں کے لئے تبریک و تشکر کی قرار دادوں کی صورت میں آخری رسمیں پوری ہوئیں اور اس کے بعد اب پرویز صاحب کے الوداعی پیغام کی باری ہے۔ مسکراتے ہوئے چہرے پر اب افسردگی کا غبار ہے اور اشکوں کو بمشکل پلکوں کے دامن میں سمیٹتے ہوئے وہ اس نازک ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مائیک کے سامنے آتے ہیں۔ ان کی آواز تھرتھرا رہی ہے اور جب اس سوزناک فضا میں وہ بھرائی ہوئی آواز سے رفقائے سفر کو مخاطب کرتے ہیں تو دلوں میں ایک قیامت سی برپا ہو جاتی ہے۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
قیامت تھا سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

گلوگیر لہجے میں انہوں نے کہا۔

یہ تین دن کتنی تیزی سے گذر گئے۔ ابھی آپ احباب کے آنے کی خوشی پوری نہیں ہوئی تھی کہ الوداعی منظر سامنے آگیا۔

میں پہلے آپ کو پیغام دیا کرتا تھا لیکن اس بار کام دے رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کام کا یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ تھوڑی سی غفلت آپ کو صدیوں پیچھے پھینک دے گی۔ یوں سمجھئے کہ

آنکھ جھپکی تھی کہ اور سامنے محمل نہ تھا

اس کے بعد پرویز صاحب کے کپکپاتے ہوئے لبوں پر یہ دعا جاری ہو گئی۔

بار الہا! تیرے یہ مخلص بندے یہ مقدس آرزو لے کر اُٹھے ہیں کہ اس سرزمین
پاک میں جو تیرے نام پر حاصل کی گئی ہے تیرے قانون کا تخت اجلال بچھا دیں۔
ہمیں توفیق دے کہ اپنی ان حسین آرزوؤں کو حاصلِ مراد تک پہنچا سکیں اور آئندہ
کونشن میں ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے بغلگیر ہوں۔

اور اس کے بعد انہوں نے احباب پر واضح کیا کہ

یاد رکھیے! اگر آپ کے عزم و ہمت نے یہ معرکہ سر کر لیا تو تاریخ کے صفحات پر آپ
کا نام سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا اور خدا کی کائناتی قوتیں آپ کی کامیابی پر
تحسین و آفرین کے پھول برسائیں گی۔

پیغام کیا تھا؟ خلوص قلب اور سوز و گداز کی دھیمی دھیمی سی آنچ تھی جس نے دلوں کو پگھلا کر رکھ دیا۔

پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

سب کے دلوں میں ذمہ داریوں کا احساس موجزن تھا اور سب کے سینوں میں کچھ کر گزرنے کی تڑپ تلملا رہی تھی۔ پرویز صاحب اسٹیج سے نیچے تشریف لائے اور باری باری سب سے ہم آغوش ہو کر الوداع کہنے لگے۔

ایک بج رہا ہے۔ آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے قوس قزاحی امتزاج میں بالآخر یہ آخری مجلس بھی اختتام پذیر ہے اور تمام احباب رخصت ہونے سے قبل کھانے کی میزوں کا رُخ کر رہے ہیں۔

کھانے کے بعد جدائی کا مرحلہ آگیا۔ چار دن پہلے سب کی آمد آمد کا ہنگامہ تھا اور اب باری باری سب واپس جا رہے ہیں۔ میزبان ایک گوشے میں دم بخود کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔۔۔ جن ستاروں کا انتظار انہوں نے عید کے چاند کی طرح کیا تھا، ان ستاروں کی تنک تابی اب طلوعِ سحر کا سراغ دے رہی ہے۔ کتنا اثر انگیز ہے یہ منظر ایسے میزبان کے لئے۔ ان کی افسردہ نگاہیں گویا پکار پکار کر کہہ رہی ہیں۔

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے میرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

اور واقعی یہ نقشہ اپنے پیچھے بہت سی یادیں چھوڑ گیا۔ ایک سال بعد پھر اسی فضا میں یہ ہنگامے جاگ اُٹھیں گے۔ کتنی ہی محفلیں ہیں جو آراستہ ہوتی ہیں اُجڑنے کے لئے۔ اور کتنی ہی انجمنیں ہیں جو اُجڑتی ہیں پھر آراستہ ہونے کے لئے۔ یہ محفل پھر آراستہ ہوگی۔ باربار آراستہ ہوگی۔ اس کا سلسلہ دراز اقطار السمٰوٰت والارض تک پھیلے گا۔ یہاں تک کہ اس کا قیام، قرطاسِ وقت پر ثبات و دوام اختیار کر جائے گا۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں!
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

———(۱۷)———

مژدۂ صبح[1]

طلوعِ اسلام کی پانچویں سالانہ کنونشن

منعقدہ لاہور

۷ تا ۹ اپریل ۱۹۶۱ء

(روئیداد۔ ماخوذ از طلوعِ اسلام مئی جون ۱۹۶۱ء)

---

[1] مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار

حرفِ آغاز گردشِ لیل و نہار کا طویل و شدید انتظار بالآخر ختم ہوا۔ چھ اپریل کی صبحِ بہار ننھی منھی سفید بدلیوں کے ہجوم میں، اپنے رُخِ کیف بار سے نقاب اُلٹ رہی ہے۔ لالہ و گل کی رعنائیاں جشنِ مسرت کے جھولے جھول رہی ہیں۔ فصلِ بہار کی ان شادابیوں میں کنونشن ہاؤس (شالامار ٹاؤن) کی عنبریں فضاؤں میں جانے پہچانے کاروانِ شوق کے خیر مقدم کا خمار چھایا ہوا ہے۔ کسقدر سہانے ہیں فصلِ بہار کے یہ شام و سحر!

عروسِ صبح نے لی ہے مچل کے انگڑائی
صبا کی نرم رفتار ہے نشاط انگیز!

ہاں! صبحِ چمن کی اِن جان نوازیوں میں کنونشن کمیٹی کے ایثار پیشہ رضاکار، ایک عالم آرا مستقبل کی حسین امنگیں اور دل کشا ارمان سینوں میں لئے کنونشن کے وسیع انتظامات کی حسن کارانہ تکمیل میں سرگرمِ کار ہیں۔ اور نور و نکہت کی اِن سرمستیوں میں جھومتے ہوئے سبزہ زاروں کی بے زبانی، زبانِ حال سے گنگنا رہی ہے ؎

چمن میں یہ کون آرہا ہے تمام موسم بدل رہا ہے

موسمِ بہار کا آفتاب سُہانی بدلیوں سے آنکھ مچولی کھیلتا آہستہ آہستہ نصف النہار کی طرف بڑھ رہا

ہے، اور اس کی دھیمی دھیمی رفتار کے ساتھ کنونیشن ہاؤس کے مختلف گوشوں میں ترتیب و تزئین کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ کیمپ کمانڈر اپنے رضاکاروں کی رفاقت سے ہر گوشہ تعمیر میں امکان کی آخری حد تک شایانِ شان حسن و زیبائی کا نکھار پیدا کئے جا رہے ہیں خلوص و ایثار اور حسنِ اخلاق کے یہ بلند کردار پیکرِ قرآنی تحریک کے اس مختصر سے نشیمن کی تعمیر میں اس لازوال یقین و اعتماد سے منہمک ہیں کہ یہ چھوٹی سی بستی ایک دن پورے انسانی نظام کو اپنی آغوشِ مرحمت میں لے لیگی —— یقیناً وہ مبارک و مسعود دن آئے گا جب اس فضا میں پروان چڑھتی ہوئی نظریات و تصورات کی منتظم کوششیں نوعِ انسانی کے لئے نشانِ منزل قرار پا جائینگی۔

ہمصفیرانِ چمن کی آمد آمد

ایک طرف تعمیر و تزئین کا یہ سلسلہ جاری ہے اور دوسری طرف سالہا سال سے مانوس احباب، دور دراز فاصلوں سے اس مرکزِ امید کا رُخ کئے آ رہے ہیں۔ شالامار کی شمیمِ جانفزا انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے یہ پیام سنا رہی ہے کہ

آبِ کوثر سے آنکھ کو دھو لو
میکدہ پھر قریب آیا ہے!

اور واقعی یہیں سے میکدہ کے نشان سامنے نظر آنے لگتے ہیں۔ کتنے ہی حسین تصورات ان کے ذہن میں یہاں پہنچکر جگمگا اُٹھتے ہیں۔ یہی خمکدۂ فکرِ قرآنی ہے جہاں بادہ نوشوں کی مجلسیں از سرِ نو آراستہ ہونگی۔ جہاں پیرِ مغاں کی بارگاہِ جذب و مستی سے نئے جام و سبو گردش میں آئینگے۔ فکر و بصیرت کے کاشانوں میں سرور انگیز کیف برسے گا۔ زندگی کے آبگینے نئے ولولہ ہائے شوق سے لبریز ہوں گے۔ نگاہِ عشق و مستی نئے شاہدِ مقصود سے مالا مال ہوگی۔ عزائم کو ایک نئی دعوتِ انقلاب ملے گی اور ولولہ ہائے شوق کے نصیب پھر جاگ اٹھیں گے۔

قرآنی تصورات کے یہ طائرانِ پیش رس اپنے سالانہ معمول کی وابستگی سے اب اس فضا کو اپنے لئے مانوس ہی نہیں پاتے بلکہ اقبال، جو کے ہنگامہ خیز لاہور کا یہ دور دراز اور پُرسکون گوشہ، اب انکی آرزوؤں کا گہوارہ اور قلب و نگاہ کی شاہراہوں کا مرکز و محور قرار پا چکا ہے۔ کنونشن ہاؤس کے ایک ایک ذرہ کی تابانی اور ایک ایک پھول کی مسکراہٹ میں انہیں مستقبل کے فکری و نظری انقلاب کی وہ بساط بچھتی نظر آ رہی ہے جس پر فلسفہ و حکمت کے بہارستان رشک کریں گے اور جس کے لہلہاتے ہوئے سرو و سمن

اِس جنتِ ارضی کے آئینہ دار قرار پائینگے، جو قرآن کے زندہ و پائندہ تصورات کی اساس پر انسانی زندگی میں قائم ہوتی ہے۔

یہ طائرانِ پیش رس سالہائے گذشتہ کی طرح اس فضا میں وارد ہو رہے ہیں، اور ان کی خلوص بھری ہم آغوشیوں، میل ملاپ، سلام و پیام اور ربطِ باہمی سے ایک بار پھر وہ مسرت انگیز محفل آراستہ ہو رہی ہے جسے دیکھ کر طلوعِ اسلام کی تحریک کے میرِ کارواں کا شباب رفتہ واپس لوٹ آتا ہے۔

کنونشن کی شبِ اول

افقِ مغرب میں غائب ہوتے ہوئے چھ اپریل کا آفتاب کنونشن ہاؤس کی فضا کو ہنگاموں اور قہقہوں سے بھرپور پا رہا تھا۔ مہمانوں اور نمائندوں کی بہت بڑی تعداد اس وقت تک کیمپ میں داخل ہو چکی تھی، اور میرِ کارواں کے انتظار میں سب کی نگاہیں بار بار بابِ عالی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ غروبِ آفتاب کے تھوڑی دیر بعد جبکہ آسمان پر ستاروں کی چمکیں شروع ہو چکی تھیں، وہ پنڈال میں داخل ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی منتشر ولولے چاروں طرف سے سمٹ کر صحنِ چمن میں مرکوز ہو گئے۔ آناً فاناً دفترات قبالیہ کے سامنے شائقینِ دید کا ایک جمگھٹا سا نظر آنے لگا۔ پرویز صاحب سب سے باری باری بغلگیر ہو رہے ہیں ـــــ ستاروں نے اپنے ماہتاب کے گرد ہالہ سا بنا رکھا تھا ـــــ یہ وہی تھے جنہیں ایک سال قبل پرویز صاحب نے اشک آلود نگاہوں اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں اس شدتِ آرزو کی بیتابیوں میں رخصت کیا تھا کہ ؏

ہزار بار برو صد ہزار بار بیا!

اور شمعِ قرآنی کے یہ پروانے آج پھر اس خضرِ راہ کو اپنے درمیان پا رہے تھے جس نے انہیں مدتوں کی گم گشتہ منزلوں کا سراغ دیا۔ وہ مسیحائے ملت آج پھر انہیں گلے لگا رہا تھا جس کی قرآنی فکر و بصیرت اور مسیحا نفسی انہیں حیاتِ نو کے جذب و مستی سے سرشار کر گئی۔ ان سب کے دلوں کی عقیدت بھری دھڑکنیں برملا کہہ رہی تھیں:۔

زندگی آپ کی نوازش ہے
ورنہ ہم لوگ مر گئے ہوتے

پرویز صاحب نے بالآخر سب سے رخصت ہو کر اپنی قیام گاہ کا رخ کیا۔ لیکن اس یادگار تقریب پر دلِ بیقرار کو قرار کہاں! ساز و سامان کو ترتیب دے کر وہ بے تابانہ پھر باہر نکل آئے اور مہمان کیمپ کی

طرف چل پڑے۔ وہ کیمپ جہاں احباب اب جدا جدا ٹکڑیوں میں تقسیم ہوکر قلب ونظر کی گہرائیوں سے وابستہ، زندگی کی مقدس ترین یادوں کو تازہ کر رہے تھے۔ اپنے محبوب خضرِ راہ کو سامنے پاکر سب کی نگاہیں وارفتہ داران کی راہ میں بچھ گئیں۔ مخصوص مسکراہٹ پرویز صاحب کے چہرے پر کھیل رہی تھی۔ جب انہوں نے کیمپ میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور پھر چند دیہاتی نمائندوں کی ایک ٹولی کے قریب پہنچ کر ذرا رکے اور بیٹھ گئے۔ چند ہی لمحوں میں قرآنی فکر کی جوئے خموش حرکت میں آگئی اور اس کی موجیں ایک نغمۂ نوبہار کی دلکشی اختیار کر گئیں۔ ہمصفیرانِ چمن کا ایک خاموش اور طویل سلسلہ اب مفکرِ قرآن کے گرد پھیل چکا تھا اور ان کے قلب ونگاہ ان ضوفشانیوں سے منور ہو رہے تھے۔

کنونشن کی شبِ اول کی یہ نشاط انگیز محفلیں سکوتِ نیم شبی میں بھی جاری رہیں۔ سال بھر کی جدائی کے بعد قرآنی احباب کا اس طرح پھر جمع ہونا کس قدر وجہِ نشاط تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ رات گئے کچھ احباب طویل سفر کی تکان کے باعث اگر سو گئے تو نور کے تڑکے بیدار ہو کر وہ پھر بزم آرائی کا سامان کرنے لگے۔ اور اذانِ سحر کے وقت بھی زاہدِ شب زندہ دار کی طرح وہ اپنی ذکر وفکر کی انجمن سجائے ہوئے تھے اور سرمستیوں کی کیفیت یہ تھی کہ:۔

صبح کا تارا پوچھ رہا تھا
کب تک دورِ جام رہے گا

پہلا اجلاس

احباب کی زندگی کی یہ شبِ یادگار آہستہ آہستہ اختتام پذیر ہوئی۔ ۷ اپریل کا آفتاب طلوع ہوا۔ اور ناشتہ کے بعد ۹ بجے صبح کنونشن کا پہلا اجلاس شروع ہوا۔ اور نغمۂ اقبالؒ سے سحر انگیزیوں کے بعد احباب کے تعارفِ باہمی کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ سلسلہ تعارف دو گھنٹوں سے زیادہ عرصہ جاری رہا۔ احباب کی زندگی اور اس کے پس منظر کی نقاب کشائی ہوتی چلی گئی۔ انفرادی تعارف کی یہ مختلف کڑیاں' دراصل ایک اجتماعی داستانِ حیات کا سلسلہ مربوط بنتی ہیں۔ قرآنی منزلِ مقصود کے مسافروں کی یہ آپ بیتیاں ایک کاروانِ بہار کی تاریخ قرار پائیں گی، اور گلہائے چمن کی یہ کہانی حقیقت میں ایک بہارستان کی تفصیل شمار ہو گی۔

پھولوں نے گلستاں سے تعارف کرا دیا
لفظوں نے داستاں سے تعارف کرا دیا

پرویز صاحب کا استقبالیہ حسب سابق، استقبالیہ اور ناظم ادارہ کی رپورٹ کے بعد مرکز والی کے استقبالیہ خطاب کی باری تھی۔ پرویز صاحب مائیک پر آئے۔ اس دفعہ ان کے استقبالیہ کا عنوان تھا:-

مژدۂ صبح

دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند

احباب کے استقبال کے ساتھ ساتھ یہ استقبالیہ مشتمل ہوتا ہے ان اہم واقعات پر جو قرآنی تحریک کی ارتقائی رفتار کے سلسلے میں دوران سال میں وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اور ان ممکنات زندگی پر جو قرآنی تصورات کو محسوس و مشہود پیکروں میں ابھار ابھار کر منظر عام پر لئے چلے آ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے واضح کیا کہ زرعی اصلاحات کے نفاذ اور زمینداری نظام کے خاتمے کے بعد تین ایسی لعنتیں باقی تھیں (جو اقبالؒ کے الفاظ میں) وجہ مرگِ انسانیت ہیں —— یعنی سلطانی، ملائی و پیری۔ اور اب عسکری نظام نے مختصر سی مدت میں ان لعنتوں کی 'مقدس گرفت' کو بڑی حد تک ڈھیلا کر دیا ہے۔

پرویز صاحب نے عائلی ضوابط کے آرڈیننس کے نفاذ پر والہانہ مسرت کا اظہار کیا اور واضح کیا کہ یہ مبارک قدم مذہب و سیاست کی اس ثنویت کے لئے پیام موت ہے جو دور ملوکیت میں پیدا ہوئی۔ اور اس نے صدیوں تک امت بیچاری کو استبداد کے دوہرے شکنجوں میں کسے رکھا۔ اسی عظیم واقعہ کی بنا پر انہوں نے ۲۔ مارچ کو تاریخ اسلام کے ایک "یادگار نوروز" کے الفاظ سے یاد کیا۔

مفکرِ قرآن نے انتہائی مؤثر الفاظ میں اس حقیقت کو پیش کیا کہ زمانے کے تقاضوں نے مجبور کر دیا ہے کہ دنیا بھر کے آستانوں سے ٹھکرایا ہوا انسان، پھر سے خدا کے دروازے پر دستک دے۔ مفاد پرستیوں کی کوئی قوت اب زمانے کے سیلِ رواں کے سامنے روک بن کر نہیں ٹھہر سکتی۔ اب صحنِ عالم کی ہر شاخ جوشِ نمو سے بیتاب ہے۔ پوری فضا قرآن کی آواز سے معمور ہو رہی ہے۔ وہی آواز جو کچھ عرصہ قبل جرم عظیم سمجھی جاتی تھی، اب حکومت کے ایوانوں اور عدالت کے کاشانوں تک سے فردوسِ گوش بن رہی ہے۔ (پرویز صاحب کا یہ استقبالیہ آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیے!)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مژدۂ صبح

بادہ نوشانِ خمکدۂ حجاز کے نام!

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

یارانِ میکدہ! سلام و رحمت!

ماہِ رمضان جشنِ نزولِ قرآن کی طرب انگیزیوں کی نوید جانفزا لے کر آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی پیمانہ بردارانِ خمستانِ قرآنی کی آمد آمد کا خیال دامنِ نگاہ کو صحنِ صد گلستان و کفِ ہزار گلفروش بنا دیتا ہے۔ آپ احباب سے ملاقات کی آرزوئیں سمٹ کر کاشانۂ چشم میں مرکوز ہو جاتی ہیں۔ اور ہر آن یہ محسوس ہوتا ہے کہ

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں!
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

اس تصور سے آپ کی یاد، اُفقِ قلب سے اُبھرتی چلی آتی ہے اور میں ہمہ تن آغوش، آپکے استقبال کے لئے دیدہ و دل فرشِ راہ کئے، ہجومِ کیف و مستی میں یہ پیغامِ تہنیت بار آپ تک پہنچاتا ہوں کہ:

بصحنِ گلشنِ ما صورتِ بہار بیا
کشادہ دیدہ و گل بہرِ انتظار بیا

آپ کنونشن میں شرکت کے لئے سامانِ سفر تازہ کرنے لگتے ہیں تو یہاں۔

ایک اِک کر کے ہوتے جاتے ہیں روشن تارے
میری منزل کی طرف اُن کے قدم آتے ہیں!

اور جہانِ شوق کا ایک ایک ذرہ پکار اُٹھتا ہے کہ

رقص مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
سوئے میخانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں

اور جب آپ مل جاتے ہیں تو میری داستانِ حیات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ خدا آپ کو خوش و خرم رکھے اور جن مقدس آرزوؤں اور حسین تمناؤں کو لے کر آپ یہاں جمع ہوتے ہیں وہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیں اور بار آور و ثمر بار ہوں۔

عزیزانِ من!

پاکستان میں عسکری انقلاب اکتوبر ۱۹۵۸ء میں آیا تھا۔ اس کے بعد جب ہم اپریل ۱۹۵۹ء کی کنونشن میں اسی مقام پر جمع ہوئے تو میں نے اپنے خطاب میں جس کا عنوان "پیامِ فصلِ بہار" تھا، کہا تھا۔

عسکری انقلاب کا استقبال

"سطح بین نگاہوں کے نزدیک یہ انقلاب شاید بساطِ سیاست کی مہرہ بازیوں کا نتیجہ ہو لیکن جن کی نظریں، سطح سے نیچے اُتر کر گہرائی تک پہنچتی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اسکے پیچھے کائناتی قوتوں کا ہاتھ کارفرما تھا۔ یہی وہ قوتیں ہیں جنہیں عام الفاظ میں 'زمانے کے تقاضے' کہا جاتا ہے۔ زمانے کے تقاضے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا!
تماشا دکھا کر مداری گیا!

باقی دنیا تو زمانے کی اس پکار کو دل کے کانوں سے سن رہی تھی لیکن ہماری حالت یہ تھی کہ ہم اپنے کانوں پر مفاد پرستیوں کے لحاف لپیٹ کر سوتے رہنا چاہتے تھے۔ اگر کچھ

وقت تک اور ہمارا یہی حال رہتا، تو کم از کم مجھے تو صاف نظر آرہا تھا کہ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے کمیونزم کا سیلاب اپنی تلاطم خیزیوں کے ساتھ اُمنڈ کر آجائے گا اور ہمارے تمام نظریاتِ زندگی اور تصوراتِ حیات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کرلے جائے گا غنیمت ہے کہ اس طوفانِ بلا انگیز کی آمد سے پہلے ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے ایسی تبدیلی پیدا کرلی جس سے سرمایہ داری کی پروردہ سیاست کی بساط اُلٹ گئی۔ اس انقلاب کا پہلا مظاہرہ زرعی اصلاحات کی شکل میں سامنے آیا ہے۔"

علامہ اقبالؒ نے زمینداری کو اُن لعنتوں میں شمار کیا تھا جو جسدِ انسانیت پر کابوس بن کر مسلط ہیں۔ اُن کے الفاظ میں:-

سرگذشتِ آدم اندر شرق و غرب
بہرِ خاکے فتنہ ہائے حرب و ضرب

اور زمیندار سے کہا تھا کہ:-

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

اس لئے کہ

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

عسکری انقلاب کے تیشے کی پہلی ضرب اسی آکاس بیل پر پڑی جو شجرِ انسانیت کو بُری طرح خشک کئے جا رہی تھی۔ اگرچہ اس کی ابھی تک جڑ نہیں کٹی، لیکن اس کی شاخ تراشی بڑی حد تک ہو گئی ہے۔

تین اور بلائیں

اقبالؒ نے زمینداری کے بعد تین اور بلاؤں کا ذکر کیا ہے، جو وجہ مرگِ انسانیت ہیں۔ وہ مسلمان سے خطاب کر کے کہتے ہیں:-

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

زرعی اصلاحات کے بعد عسکری حکومت نے اوقاف کو اپنی تحویل میں لے کر "پیری" کی "مقدس کرامت

کو جو سدِ راہ انسانیت کو اپنے شکنجوں میں کسے رکھتی ہے، بڑی حد تک ڈھیلا کر دیا۔ اور خلقِ خدا کو قدرے آسانی سے سانس آنے لگا۔ جہاں تک "سلطانی" کا تعلق ہے، دیگر ممالک میں عسکری انقلاب کا نتیجہ آہنی ڈکٹیٹرشپ کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہی خطرہ یہاں بھی تھا، لیکن حکومت نے جمہوری طرزِ حکومت کے اعلانات اور آئینی کمیشن کے تقرر سے اس خطرہ کے امکانات کا ازالہ کر دیا۔ اب رہی "ملائیت" سو اس کی گرہیں اس قدر مضبوط چلی آ رہی ہیں کہ انہیں کھولنے کے لئے تیز تر ناخنِ تدبیر کی ضرورت تھی۔

ملائیت کا شکنجہ

چودہ سو سال کا عرصہ ہوا جب حضور خاتم النبیّین (صلے اللہ علیہ وسلم) نے قرآنی قوانین کو دنیا میں نافذ فرمایا۔ اس سے انسانیت کو کس قدر سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہوئیں اس پر اس دورِ ہمایونی کی صحیح تاریخ کے درخشندہ اوراق شاہد ہیں ۔۔۔ یہ سلسلہ حضورؐ کے بعد بھی کچھ عرصہ تک قائم رہا لیکن اس کے بعد (ہماری بدبختی کہ) یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی۔ اور خدا کے قوانین کی جگہ پھر انسانوں کے خودساختہ قوانین نے لے لی۔ (یہ کس طرح سے ہوا اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ آپ احباب کو علم ہے کہ اسے میں نے اپنے مقالہ "اسلام آگے کیوں نہ چلا" میں شرح و بسط سے بیان کیا تھا۔ (جو اَب "سلیم کے نام خطوط" میں شائع ہو چکا ہے)۔ اس غیر خدائی قانون کے اشہبِ عنان تاب کی باگیں ملوکیت اور ملائیت کے ہاتھ میں تھیں۔ ملوکیت نے ملکی قوانین سنبھال لئے، اور شخصی قوانین، مذہبی پیشوائیت کے سپرد کر دیئے گئے۔ یوں "برہمن اور کھشتری" کی پرانی گٹھ جوڑ اس امت کے اندر بھی نمودار ہو گئی جو اس ثنویت کو مٹانے کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ یہ دونوں، زمامِ اختیارات ہاتھ میں لئے، ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے، اور مظلوم و مقہور انسانیت جگن ناتھ جی کے اس رتھ کے آہنی پہیوں کے نیچے کچلی چلی جا رہی تھی۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے خاتمہ پر انگریز کی حکومت آئی تو اس میں بھی یہی ثنویت قائم رہی ۔۔۔ اس میں انگریز کی کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ ہر سیکولر حکومت میں یہ تفریق و تقسیم باقی رہتی ہے ۔۔۔ جب تحریکِ پاکستان کی آواز بلند ہوئی تو (جیسا کہ طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت[1] میں بتایا گیا ہے) ہمارے "علمائے کرام" کی طرف سے اس کی

پاکستان کی مخالفت

سخت مخالفت ہوئی۔ اس کی وجہ بالکل عیاں ہے۔ ہندوؤں نے انہیں یقین دلا رکھا تھا کہ حکومت سیکولر انداز کی ہو گی، جس میں

---

[1] اپریل ۱۹۶۱ء۔

شخصی قوانین، مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں رہیں گے۔ اس کے برعکس مطالبہ پاکستان کی بنیاد ہی اس تصور پر تھی کہ اس خطہ زمین میں صحیح اسلامی حکومت قائم کی جائے گی۔ اس حکومت میں ملکی اور شخصی قوانین کی تفریق تو کجا، مذہبی پیشوائیت کی انسٹی ٹیوشن ہی باقی نہیں رہتی۔ اس لئے ملّا اسلامی حکومت کے مطالبہ کی تائید کس طرح کرسکتا تھا؟ ایسی حکومت کون چھوڑنا چاہتا ہے جس میں نہ پولیس کی ضرورت پڑے نہ فوج کی، اور گرفت میں رہیں لوگوں کے قلوب اور اذہان تک! لیکن "فلکِ ناہنجار کی اس کجروی" کا کیا علاج کہ اُن کی سخت مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا۔

عائلی کمیشن

۱۹۵۵ء میں عائلی کمیشن کا تقرر ہوا تو ملائیت کے چہرے کی رنگت اُڑنی شروع ہوئی۔ اس لئے کہ اس کمیشن کا دائرہ تحقیق اُن پرسنل لاز (شخصی قوانین) کو محیط تھا، جن پر ملّا کا قبضہ تھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ اس سلسلہ میں جو اصلاحی قدم بھی اٹھایا گیا وہ اسکے اختیارات کو ختم نہیں تو محدود ضرور کر دے گا۔ اس گروہ کا ایک نمائندہ کمیشن میں بطور رکن شامل تھا۔[۱] چنانچہ جب کمیشن کی سفارشات مرتب ہوئیں تو سب سے پہلے اُس نمائندہ نے ان کے خلاف اختلافی نوٹ لکھا۔ یہ سفارشات اگرچہ قرآن کریم کی تعلیم کے کاملتہً مطابق نہیں تھیں، لیکن اُن کا رُخ اُس کی سمت کو ضرور تھا۔ مُلّا کو بھلا یہ کب گوارا ہوسکتا تھا؟ مظلوم و مقہور، بے زبان عورتوں کی زندگی جہنم میں گزرتی ہے تو گزرے۔ ہزاروں خاندان تباہ ہوتے ہیں تو ہوں۔ بیکس اور لاچار، معصوم اور یتیم بچے اپنے جائز حق سے محروم ہوکر در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں تو کھایا کریں، اسلام غیروں کی نظروں میں اضحوکہ بنتا ہے تو بنا کرے۔ یہ سب کچھ علی الرغم قرآن کے خلاف ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ اس سے مذہبی پیشوائیت کو کیا واسطہ؟ اسے اپنی خدائی کو سنبھالنے اور برقرار رکھنے کی فکر ہوتی ہے، اور چونکہ ان اصلاحی سفارشات کی زد اس کی خدائی پر پڑتی تھی، اس لئے اس نے ان کے خلاف متحدہ محاذ کھڑا کر دیا، اور یہ سفارشات اس شور و غوغا میں گم ہوکر رہ گئیں۔ لیکن زمانے کے تقاضوں کو کب تک روکا جاسکتا تھا۔ عسکری حکومت نے ان تقاضوں کی اہمیت کا احساس کیا، اور نہایت جرأت و بسالت سے کام لیتے ہوئے ان اصلاحات کی طرف پہلا قدم بڑھایا۔ ان اصلاحات کی

---

[۱] احتشام الحق تھانوی صاحب۔

مخالفت کرنے والوں کے متعلق محترم صدرِ پاکستان نے اپنے "پاکستان ڈے" کے پیغام میں کس قدر صحیح کہا ہے کہ:-

"یہ اقدام نوعِ انسانی کے اس مظلوم طبقہ سے عدلِ عمرانی کی خاطر کیا گیا ہے جسے مذہب کے مسخ کردہ نقاب کی آڑ میں، اس کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ جو لوگ اس سے مضطرب و بے قرار ہو رہے ہیں، انہیں چاہیئے کہ اپنے ضمیر کا جائزہ لیں، اور جو جذبہ انہیں اس مخالفت پر آمادہ کر رہا ہے، اور جو خواہشات اس کے پیچھے کارفرما ہیں، ان کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے لئے اپنے دلوں کو ٹٹولیں؟"

۲ مارچ کا نوروز

یہ ہے برادرانِ عزیز! اس ثنویت کو ختم کرنے کی طرف پہلا قدم جو ہمارے دورِ ملوکیت میں پیدا ہوئی اور جس نے اُمت بیچاری کو دوہرے استبداد کے شکنجوں میں کسے رکھا۔ ۲ مارچ کا دن میرے نزدیک اسلام کی تاریخ میں قابلِ یادگار "نوروز" ہے جب قرنِ اول کے بعد پہلی مرتبہ ایک مملکت کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ ہم عورتوں کو وہ حقوق دینا چاہتے ہیں جو انہیں قرآن نے عطا کئے ہیں۔ برادرانِ گرامی قدر! کس قدر جواں بخت ہے ہمارا یہ دور جس میں چودہ سَو سال کے بعد رجعت الی القرآن کی صدائے جمیل نے فضا میں حسین ارتعاش پیدا کیا ہے۔ کس قدر خوش نصیب ہے یہ خطۂ پاک جسے ان آسمانی قوانین کا گہوارہ بننے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ اور کس قدر مستحقِ تبریک و تہنیت ہے وہ ثریا بخت مملکت جس نے دنیا میں پھر سے قرآن کی آواز بلند کی ہے۔

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز!
بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں نے اس عسکری انقلاب کا اس قدر پُرجوش خیر مقدم کیوں کیا تھا۔

تائید و مخالفت کا معیار

اور اس کے اصلاحی اقدامات کو درخورِ تبریک کیوں قرار دیا ہے۔ یاد رکھئے! کسی سے ہماری مخالفت اور موافقت کا جذبۂ محرکہ ایک اور صرف ایک ہے۔ قرآن کی موافقت میں جب اور جہاں سے بھی آواز اُٹھے گی، اُسے ہماری تائید و تعریف حاصل ہوگی۔ اس کے خلاف جو کچھ ہوگا ہم اس کی مخالفت کریں گے۔

نہ ہماری وہ موافقت کسی ذاتی میلان ورجحان کا نتیجہ ہوئی، اور نہ یہ مخالفت کسی شخصی عناد وانتقام کی بنا پر۔ اور اس کی وجہ ظاہر اور بیّن ہے۔ ہمارے سامنے نہ کسی ذاتی مفاد کا خیال ہے، نہ سیاسی اقتدار کا تصور۔ ہم نہ کوئی پارٹی بنانا چاہتے ہیں، نہ مذہبی گروہ بندی۔ ہم نے آج تک (اپنے ہمنوا احباب کے علاوہ) نہ کسی گوشہ سے کوئی مالی امداد لی ہے اور نہ کسی قسم کی کوئی رعایت حاصل کی ہے۔ اس لئے کہ ہمارا ایمان ہے کہ خدا کے پیغام کے عام کرنے کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ اس آواز کا بلند کرنے والا ساری دنیا سے علی الاعلان کہہ دے کہ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۲۶/۱۰۹) "میں اس کے بدلے میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر خدائے رب العالمین کے ذمے ہے"۔ یہی ہے وہ پیغام رساں جو دنیا کے بلند سے بلند تر آستاں سے مستانہ وار بے نیاز گزر جاتا ہے، اور خدا کی چوکھٹ کے علاوہ کسی اور چوکھٹ کے سامنے اپنا سر نہیں جھکاتا۔ اللہ ہمیں اس ایمان و ایقان پر قائم رکھے۔

خواجۂ من! نگاہ دار، آبروئے گدائے خویش
آنکہ ز جوئے دیگراں پُر نکند پیالہ را

ہماری کوشش

عزیزانِ من! بیس سال سے زاید کا عرصہ ہوا جب میں نے قرآنی نظام کی تشکیل اور قوانینِ خداوندی کے احیاء کی آواز بلند کی۔ اس وقت میری یہ آواز بالکل تنہا آواز تھی۔ میں نے معاشرہ کے کمزور ترین طبقہ، یعنی مسلم خواتین کی مظلومی پر نوحے کئے اور ان کے قرآنی حقوق کی بازیابی کے لئے مسلسل و پیہم کوشاں رہا۔ میں نے یتیم پوتوں کی محرومی پر خون کے آنسو بہائے، اور انہیں ان کے جائز حقوق دلوانے کے لئے امکان بھر جدوجہد کی۔ میں نے غریب اور محنت کش، فاقہ زدہ طبقہ کی محتاجی اور ستم رسیدگی پر ہزار داماں چاک کئے، اور سرمایہ داری، زمینداری، اور ہر قسم کی عاجلانہ مفاد پرستی کو خدا کے نظام ربوبیت سے بدلنے کے لئے رات دن ایک کر دیا۔ میں نے امتِ مرحومہ کو سلطانی و ملائی و پیری کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے فکری جہاد کیا، اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ میں نے یہ سب کچھ قرآن کی طرف سے عاید کردہ فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے کیا۔ اس لئے میں اس کے عوض نہ ستائش کا متمنی ہوں نہ صلہ کا امیدوار۔ اس جدوجہد اور سعی و کاوش میں میرے خلاف جس قدر جھوٹا پروپیگنڈہ کیا گیا، اور کیا جا رہا ہے، اس کی ایک

جھوٹا پراپیگنڈہ تازہ مثال ملاحظہ کیجئے۔ روزنامہ "انجام" کراچی کا ایک ذمہ دار اخبار ہے۔ اُس نے اپنی ۵ مارچ کی اشاعت میں عائلی قوانین سے متعلق آرڈی ننس پر اپنے افتتاحیہ میں تبصرہ کیا ہے وہ اس میں لکھتا ہے:۔

"سابقہ حکمرانوں نے ۱۹۵۵ء میں مسلمانوں کے شخصی (عائلی) قوانین پر نظرِ ثانی کے لئے ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین مرحوم کی زیرِ صدارت ایک کمیشن مقرر کیا تھا جس میں علمائے اہلِ سنت والجماعت کے نمائندے کی حیثیت سے جناب مولانا احتشام الحق تھانوی شریک تھے اس میں ایک خاص نقطۂ خیال کے حامل یا صاف الفاظ میں احادیثِ رسولِ کریم (صلے اللہ علیہ وسلم) کے منکر، مسٹر غلام احمد پرویز بھی شامل کئے گئے تھے اور چونکہ پاکستان میں ننانوے فی صد سے بھی زیادہ اکثریت احادیثِ مقدسہ کو قرآن مجید کی تفسیر و تشریح اور قالبِ اسلام کی روح سمجھتی ہے اس لئے اکثر و بیشتر پاکستانی اخبارات نے اس نامزدگی کی مخالفت کی تھی۔"

اور ساری دنیا جانتی ہے کہ مسٹر غلام احمد پرویز بیچارے کو اس کمیشن سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میں ان مخالفتوں کی پرواہ کئے بغیر اپنے فریضہ کی سرانجام دہی میں برابر مصروفِ تگ و تاز رہا۔ اس یقینِ محکم کے ساتھ کہ خدا کا فیصلہ ہے کہ حق آخر الامر غالب آکر رہتا ہے۔ بایں ہمہ مجھے اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میری یہ حقیر سی کوششیں میری زندگی ہی میں نتیجہ خیز ہو جائیں گی۔ لیکن آج میرا سرِ نیاز اُس بارگاہِ صمدیت کے آستانۂ عالیہ پر سجدہ ریز ہے جس کی عاجز نوازیوں کے تصدق مجھے خود اپنی توقعات کے خلاف ایسی عظیم سعادت نصیب ہو گئی۔ اور میں نے یہ نشید بہار اپنے کانوں سے سُن لی کہ مظلوم انسانیت کو پھر سے قرآنی حقوق دیئے جائیں گے۔ بارالہا! تیری ان گہربار نوازشات کا کس طرح شکریہ ادا کیا جائے!!

لیکن برادرانِ من! یہ میری تنہا کوششوں کا نتیجہ نہیں۔ اگر آپ احباب میرے دست و بازو نہ بنتے تو ہمیں یہ مبارک دن دیکھنا کیسے نصیب ہوتا۔ اس لئے اس جشنِ

ھدیۂ تبریک مسرت میں آپ سب احباب میرے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ قرآن کے شیدائیو! تمہیں ہزار ہزار مبارک ہو کہ اللہ کے سحابِ کرم نے تمہاری کشتِ آرزو کو اس طرح لالہ زار

اور پُربہار بنا دیا۔ تم وجد و مسرت سے جھومو۔ خوشیوں کے جھولے جھولو، تبریک و تہنیت کے گیت گاؤ، ایک دوسرے پر مبارک بادیوں کے پھول برساؤ اور ملّتِ پاکستانیہ کو دعوت دو کہ

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

برادرانِ من! جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے، اس وقت تک ملک میں جس قدر اصلاحی قدم اٹھائے گئے ہیں، وہ کاملۃً قرآن کے مطابق نہیں، لیکن میں نے اس کے باوجود ان پر مسرت و تہنیت کے نغمات اس لئے پیش کئے ہیں کہ ان کا رُخ اس منزل کی طرف ضرور ہے جہاں آخرالامر قرآن لے جانا چاہتا ہے۔ ابتدائے کار کے لئے یہ بھی از بس غنیمت ہے کہ ؎

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

اس سے یہ حقیقت بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ زمانے کے تقاضے مجبور کر رہے ہیں کہ دنیا کی چوکھٹوں کا ٹھکرایا ہوا انسان پھر سے خدا کے دروازے پر دستک دے۔ اب ملوکیت، سرمایہ داری، خانقاہیت، ملائیت، غرضیکہ مفاد پرستیوں کی کوئی قوت بھی زمانے کے سیلِ رواں کے سامنے روک بن کر کھڑی نہیں ہو سکتی

زمانے کے تقاضے

صدیوں کی کچلی ہوئی انسانیت اب ہر طاغوتی قوت سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ:

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم!

اب صحنِ عالم کی ہر شاخ جوشِ نمو سے بیتاب ہے۔ اب یہ جوئے رواں کسی کے روکے رُک نہیں سکتی۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اب پوری فضا کس طرح قرآن کی آواز سے معمور ہو رہی ہے۔ وہ آواز جس کا کچھ عرصہ پہلے زبان تک لانا جرمِ عظیم سمجھا جاتا تھا، اب کس طرح حکومت کے کاشانوں اور عدالت کے ایوانوں تک سے فردوسِ گوش بن رہی ہے۔

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

زمانے کے اس تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات میرے اس یقین کو محکم سے محکم تر کئے جاتے ہیں کہ اب وہ وقت دور نہیں جب قرآن کا مہرِ عالمتاب ساری دنیا کو آئینہ پوش بنا دے۔ اور زمین اپنے نشو ونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔" اے کاش! ہمارے قدامت پرست طبقے کو بھی کوئی اتنا سمجھا سکے کہ

ہے اب بھی وقت زاہد، ترمیمِ زہد کر لے ا
سوئے حرم چلا ہے، انبوہِ بادہ خواراں!

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ سعادت ان کے حصے میں نہیں آسکے گی اس لئے کہ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۷:۱۴) "وہ ظلم و تکبر سے اس کا انکار کئے جا رہے ہیں حالانکہ ان کے دل اندر سے اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔ تو دیکھو! معاشرہ میں فساد پیدا کرنے والوں کا انجام کیا ہوا۔"

براد رانِ عزیز! چونکہ میں اپنا تفصیلی خطاب آج شام کی نشست میں پیش کرنے والا ہوں اس لئے اس خطاب کو مختصر کرنا چاہتا ہوں۔ اس مقام پر میں آپ کی خدمت میں ایک بنیادی نکتہ پیش کروں گا۔

حُدی را تیز تر می خواں

دنیا کے عام پروگراموں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جوں جوں وہ کامیابی کے قریب پہنچتے جاتے ہیں سفر کی صعوبتیں کم ہوتی جاتی ہیں لیکن قرآنی نظام کے پروگرام کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں کامیابی و کامرانی مزید ذمہ داریوں کا موجب بن جاتی ہے سورۃ والنصر اس کی زندہ شہادت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ جب اللہ کی نصرت قریب آجائے، اور فتح و کامرانی سامنے کھڑی دکھائی دے اور تو دیکھے کہ لوگ فوج در فوج نظامِ خداوندی میں داخل ہو رہے ہیں تو یہ نہ سمجھو کہ بس اب ہمارا کام ختم ہو گیا۔ اب ہمیں اطمینان کی نیند سو جانا چاہیئے۔ نہیں، فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (۱۱۰:۳)۔ اس وقت نظامِ خداوندی کو وجہ حمد و ستائش بنانے کے لئے اور بھی زیادہ سرگرمی سے مصروفِ عمل ہو جاؤ۔ اور مخالف قوتوں کے

حفاظت طلبی میں اور بھی شدت سے کوشش کرو۔ تم یہ کرو اور پھر دیکھو کہ خدا کی رحمتیں کس تیز خرامی سے تمہاری طرف لوٹ کر آتی ہیں۔

یعنی جس وقت یہ پروگرام منزل تک پہنچ جاتے اور اسے قبولیتِ عامہ حاصل ہو جاتے، تو اس کے بعد بھی تمہاری جدوجہد کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ہمارے سامنے تو ابھی منزل آئی ہی نہیں۔ ابھی صرف اس کے دھندلے سے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے ابھی بہت کام باقی ہے۔ آپ صرف اتنا دیکھئے کہ آپ نے جو تھوڑی بہت کوشش کی ہے، اس کا نتیجہ کس قدر حوصلہ افزا اور اطمینان بخش ہے۔ اگر ہم اپنی کوششوں کی رفتار اور تیز کر دیں تو پھر دیکھئے کہ ان کے نتائج کس قدر تحیر انگیز اور مسرت خیز ہوں گے۔ آپ ذرا سی ہمت اور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ کس طرح یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد
عالمِ پیر دگر بار جواں خواہد شد

آخری اپیل

آخر میں، میں اپنی اُس مخلصانہ اپیل کو ایک بار پھر دہراؤں گا، جسے میں ہر سال آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ

(۱) اپنے ذہن میں کسی غیر قرآنی تصور و خیال کو جاگزیں نہ ہونے دو۔

(۲) اپنے قول سے ہی نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی ثابت کر دو کہ قرآن کی تعلیم انسان کو کس بلند مقام پر لے جاتی ہے۔

(۳) قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دو۔ لیکن جو کچھ کرو خالصۃً لوجہ اللہ کرو۔ اس میں کسی ذاتی مفاد یا جذبہ کو دخل انداز نہ ہونے دو۔

(۴) آپ سے کسی قسم کی کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہونے پائے جس میں فرقہ پرستی یا پارٹی بازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ اپنے دامن کو ان خار دار جھاڑیوں سے قطعاً نہ الجھنے دو۔

(۵) اپنے وقت اور توانائی کو، ضدی طبقے کے ساتھ بحث و تمحیص میں ضائع نہ کرو۔ قرآنی تعلیم کو صرف اُن لوگوں کے سامنے پیش کرو جو علم و بصیرت سے سمجھنے اور سنجیدگی سے اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔

(۶) ہر رات سونے سے پہلے یہ سوچو کہ آپ نے:-
(i) دن بھر میں قرآنی احکام و تعلیم کے خلاف تو کوئی کام نہیں کیا۔ اور
(ii) آپ نے کسی دکھی انسان کو سکھ پہنچانے کے لئے کیا کیا ہے۔ یاد رکھیئے! انسانیت کی بے لوث خدمت، بلند ترین مقصد زندگی ہے۔
(۷) اور آپس میں محبت اور پیار اور مودّت والفت کے ساتھ رہو، کہ دنیا میں قرآنی رشتے سے زیادہ پاکیزہ اور گہرا رشتہ اور کوئی نہیں۔

اللہ آپ کو خوش و خرم رکھے اور آپ کے عزائم کو کامیابی عطا فرمائے۔

والسلام!

پرویز

دوسرا اجلاس

اہم خطاب ۷ اپریل۔ چار بجے دوپہر کونشن کا دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ اس نشست میں پرویز صاحب کا وہ اہم، فکر انگیز اور بصیرت افروز خطاب فردوس گوش بنا تھا جس کا عنوان تھا ـــــ

"اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟"

کس قدر علم افروز تھا یہ موضوع، اور ارتقائے وقت کی کس قدر اہمیت و ضرورت وابستہ ہے اس کے جواب سے۔ ایک مفکر قرآن ہی اس کا موزوں ترین اور علیٰ وجہ البصیرت جواب دے سکتا ہے۔ چنانچہ تلاوتِ کلامِ پاک اور نظم کے بعد جب پرویز صاحب اس اہم موضوع کو لیکر مائیک کے سامنے آئے تو وسیع و عریض اور حاضرین سے بھرپور ہنڈال ہمہ تن گوش تھا۔

آغازِ خطاب کرتے ہوئے پرویز صاحب نے سب سے پہلے ان اخلاقی اقدار کا تجزیہ کیا جنہیں "عالمگیر سچائیوں" کے نام سے، ابوالکلام آزاد مرحوم اور دوسرے بزرگ تمام مذاہب کا مشترک سرمایہ

قرار دیتے رہے ہیں۔ پرویز صاحب نے واضح کیا کہ "اس قسم کی سچائیاں" تو دہریوں اور خدا کے منکروں کے ہاں بھی مروج آرہی ہیں۔ انہیں مذہب سے ہی کیوں مخصوص کیا جائے۔ اور اس کے بعد وہ ایک قدم آگے بڑھے اور مذہب کے مقابلہ میں دین کا ارفع و اعلیٰ مفہوم پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام ایک دین ہے اور دین چند اخلاقی اقدار کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی ہے جو حیاتِ انسانی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ یہ زندگی کو وہ بنیادیں عطا کرتا ہے جن پر اخلاقی اقدار کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔ دین زندگی کے اُن بنیادی تصورات کا حامل ہے، جو نگاہ کے زاویے بدل دیتے ہیں اور انسانی سعی و عمل کا رُخ متعین کرتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے ان تصورات کی تفصیل پیش کرتے ہوئے دینِ اسلام کا تقابل مروجہ مذاہب سے کیا۔

مفکرِ قرآن کا مخصوص اندازِ بیان، دلنشیں دلائل و براہین، منتہائے زندگی کی نقاب کشائی، یہ سب کچھ ایک نہرِ سلسبیل کی طرح قلوب و اذہان کو سیراب کرتا چلا گیا۔ ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کے حیات آفریں اور حسین و جمیل گوشوں سے نقاب اٹھتے چلے گئے۔ قرآنی تصورات کی تابناکیاں فکر و نظر کی پہنائیوں کو جگمگاتی اور اسلام کی ہمہ گیر سچائیوں کو مرتسم کرتی گئیں۔ اور جب غروبِ آفتاب کے ساتھ یہ خطاب ختم ہوا تو ہر زبان بیساختہ پکار رہی تھی کہ واقعی سچا دین صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے دلائل و براہین کی عظمت و رفعت کے اعتبار سے یہ خطاب اس قابل تھا کہ عصرِ حاضر کی ہر مروجہ زبان میں اس کا ترجمہ کر کے اس کی کرنیں دنیا بھر میں پھیلا دی جائیں تاکہ خدا کی یہ زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے، اور مظلوم انسانیت اس روشنی میں دینِ حق کے اس صراطِ مستقیم پر چلنے کے قابل ہو جائے جو اس کے ارفع و اعلیٰ مقاصد کا معراجِ عظیم ہے۔[1]

تیسرا اجلاس

۷ اپریل، رات کے نو بجے کنونشن کا تیسرا اجلاس آغاز پذیر ہوا جس میں مختلف تقاریر کے بعد پرویز صاحب

پرویز صاحب کا درسِ قرآن

کے درسِ قرآن کی باری تھی۔ "انسان اور خدا کے دشمن" ان کے درس کا موضوع تھا۔ یہ دشمن کون تھے؟ وہی سلطانی، ملائی و پیری" کے نمائندے

---

[1] یہ خطاب پرویز صاحب کے مجموعۂ مضامین — سلسبیل — میں شائع ہو چکا ہے۔

جن کے باہمی گٹھ جوڑ نے ہر دور میں انسانیت اور خدا کے سچے دین کو پامال کیا، جنہیں قرآن نے صاحب ضربِ کلیم کے مقابلے میں فرعون، ہامان اور قارون کے نام سے پیش کیا۔ ایک ملوکیت کا نمائندہ، دوسرا مذہبی پیشوائیت کا اجارہ دار اور تیسرا سرمایہ داری کا نقیب۔ حق و باطل کی ہر تاریخی آویزش میں یہ "اقانیم ثلاثہ" شانہ بشانہ اِن داعیانِ حق کے مقابلہ میں آ گئے جو حقِ خداوندی کی روشنی میں احترامِ آدمیت کے پاسبان بن کر اٹھے۔ پرویز صاحب نے تاریخ کے اسی سلسلۂ تفاصل کو اپنے مخصوص اور دلنشیں انداز میں قرآن کی زبان سے بیان کیا، اور انسان اور خدا کے دشمنوں کے چہروں کے دلفریب نقاب تار تار کر ڈالے۔ خطاب کیا تھا، تاریکیٔ شب میں شمعِ قرآنی کی تنویریں تھیں جو قلب و نگاہ کو منور کر رہی تھیں۔ دلوں سے بے ساختہ آواز اٹھ رہی تھی کہ

ساقی! سیاہ خانۂ ہستی میں دیکھنا
روشن چراغ کس نے سرِ شام کر دیا

—————— (۰) ——————

مجلسِ استفسارات

۸ راپریل کی رات کی نشست مجلس استفسارات کے رنگ میں تھی جس میں ہمیشہ کی طرح زندگی کے اہم ترین عملی مسائل کے بارے میں اہم ترین سوالات اور مفکرِ قرآن کی زبان سے قرآنی فکر و بصیرت کی روشنی میں ان کے نکھرے نکھرے جوابات۔ اعلان کے مطابق تمام سوالات تحریری صورت میں آغاز اجلاس سے قبل پرویز صاحب کی خدمت میں پہنچا دیئے گئے تھے۔ حسبِ سابق اس مرتبہ بھی بڑے اہم سوالات سامنے آئے۔ تقدیر کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟ دعا سے کیا ہوتا ہے؟ منصبِ نبوت کے لئے خدا کا قانون کیا ہے؟ کمیونزم کے مقابلہ میں اسلام کی امتیازی حیثیت کیا ہے؟ حلت و حرمت کا قرآنی فلسفہ کیا ہے؟ قرآن کس طرح زندگی کے ہر گوشے میں اصولی راہنمائی دیتا ہے؟ رسولِ اکرم کا اسوۂ حسنہ کس طرح ساری دنیا کے لئے قابلِ عمل راہ ہے؟ (وغیرہ وغیرہ)۔ یہ تھے وہ اہم سوالات، جن کے جوابات مفکرِ قرآن نے اپنے مخصوص بلیغانہ انداز میں شروع کئے۔ قرآنی فکر و بصیرت کی جوئے رواں نے عراقِ دلنشیں کے ساز چھیڑ دیئے اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا

پھر سے نغموں کے تار ہلتے ہیں
پھر سے شاخوں پہ پھول کھلتے ہیں!

سکوتِ نیم شبی تک نغموں کے یہ تار حرکت میں رہے۔ فکر و بصیرت کی شاخیں پھول برساتی رہیں۔ مسائلِ زندگی کے اہم ترین گوشوں کی نقاب کشائی ہوتی چلی گئی۔ قلب و نگاہ کی الجھنوں میں نکھار پیدا ہوتا گیا۔ قرآن کا طالب علم، کس مقامِ بلند سے کاروانِ حیات کی گذرگاہوں کا جائزہ لیتا ہے؟ اس کی عقابی نگاہ کس طرح زندگی کی کٹھن راہوں کا اندازہ اور پُرخطر گھاٹیوں کی نشاندہی کرتی ہے؟ کس نکھرے ہوئے انداز میں مختلف گتھیوں کو سلجھاتی ہے؟ یہ مجلس، ان سوالات کا جیتا جاگتا جواب بن رہی تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ایوان کی پوری فضا پر ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ مجلس برخاست ہو۔ بلکہ دلوں سے برملا دعائیں ابھر رہی تھیں کہ

دلچسپ ہوگئی ہے پریشانیٔ حیات
اے زلفِ عنبریں تری الجھن دراز ہو

محفلیں جمتی ہیں اور پھر اُٹھ جاتی ہیں اور اس طرح پھر بار بار جمتی ہیں۔ اس محفل کو بھی بالآخر اٹھنا پڑا۔

آخری اجلاس

۹ر اپریل کی صبح، آخری اجلاس کی آئینہ دار بن کر طلوع ہوئی۔ پرویز صاحب کا اہم خطاب سامنے آرہا تھا جس کا عنوان تھا۔

"فردوسِ گم گشتہ"

(جس کی تلاش میں یورپ مارا مارا پھرتا ہے)

پرویز صاحب کا خطاب

تلاوتِ کلامِ پاک اور نظم کے بعد پرویز صاحب نے اپنا خطاب شروع کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے یورپ میں مروجہ مذہب عیسائیت کے متعلق وہاں کے اربابِ بصیرت کا ردِّ عمل پیش کیا اور واضح کیا کہ ان عظیم مستشرقینِ مغرب کے نزدیک عیسائیت، شکست خوردوں کا مذہب" قرار پاچکی ہے۔ پھر انہوں نے عیسائیت (اور خود نفسِ مذہب) کے خلاف اس شدید ردِّ عمل کا تجزیہ کیا جو مادی تصورِ حیات کی صورت میں وہاں رائج العام ہوا۔ اور تہذیبِ مغرب کی موجودہ ترقی یافتہ صورت میں برگ و بار لایا۔

تہذیبِ مغرب، اخلاقیات، سیاسیات، معاشیات اور زندگی کے دیگر اہم شعبوں میں کس قدر ہلاکت خیزیاں لیکر آئی، اس کی تفصیل بھی مفکرِ قرآن نے، مفکرینِ مغرب کی شہادتوں سے پیش کی۔ اور انکی وہ چیخ وپکار اور نالہ و فریاد بھی، جو ہلاکت خیزیوں کے اس سیلاب میں سنائی دے رہے ہیں۔

یورپ کو اب کس قسم کے مذہب کی تلاش ہے اور اسلام کس حسن و خوبی سے اُن کے یہ تقاضے پورے کر سکتا ہے؟ یہ تھا پرویز صاحب کے موضوع کا گوہرِ مقصود۔ اور قرآنی فکر کی جس قوتِ استقلال سے وہ اسے ایوان کے سامنے لاتے وہ انہیں کا طرۂ امتیاز ہو سکتا ہے کسی دوسرے کا نہیں۔ انہوں نے بدلائل و براہین اور علیٰ رؤس الاشہاد، اس حقیقتِ ثابتہ کی نشاندہی فرمادی کہ یورپ جس جدید نظام کی تلاش میں مضطرب اور سرگرداں ہے، وہ اُسے قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔

الوداعی مجلس

آخری اجلاس کے اختتام سے کنونشن کا باضابطہ پروگرام بھی تکمیل پاگیا۔ اب وہ نازک لمحے سامنے تھے جو زبانِ حال سے پکار رہے تھے کہ

غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو
جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے!

چنانچہ آخری اجلاس ختم ہونے پر بھی ایوان میں سے کوئی اپنی جگہ سے حرکت پر آمادہ نہ ہو سکا۔ کوئی بھی مل بیٹھنے کی ان ساعتوں سے محروم ہونے پر آمادہ نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں احباب کے چہرے حزن و ملال کی تصویر بن گئے تھے۔ جدائی کے تصور نے ان کے جذبات و احساسات میں الم انگیز کیفیت پیدا کر دی تھی۔ ذہنی اور نفسیاتی تغیر کا یہ ملال آگیں مرحلہ پورے پنڈال بلکہ پورے کنونشن ہاؤس کی فضائیں اُداسیاں پیدا کر چکا تھا۔ ایوان پر گہری خاموشیاں طاری تھیں اور نگاہوں سے ایک عجیب حسرت سی ٹپک رہی تھی۔

جہاں مے کے چھینٹے مسرت فشاں تھے
اُسی بزم میں اشکِ غم بھی رواں ہیں

یہ تھا وہ ماحول جس کی فضائے سوزناک میں میرِ کارواں نلخابہ شیریں کو ہاتھ میں لئے مائیک پر نمودار ہوتے۔ سہ روزہ پروگرام کی رفتار میں یہ پہلا اور نازک ترین مرحلہ تھا جب اس الوداعی رسم کی ادائیگی میں زبان ان کے احساسِ غم کی ترجمانی میں اظہارِ عجز کر رہی تھی اور الفاظ ان کا ساتھ دینے میں پس و پیش کر رہے تھے۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے وہ کچھ دیر اپنے، زندگی اور موت کے ساتھیوں پر نگاہ جمائے رہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ ان کے لبوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ پنڈال میں اب ان کی تھرتھراتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی اور وہ ممکناتِ زندگی کی نقاب کشائی کر رہے تھے۔

الوداعی پیغام

برادرانِ عزیز!

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

"سال بھر کے انتظار کے بعد آپ آتے ہیں تو ایک ایک قدم سے میری قسمت کے ستارے روشن ہوتے جاتے ہیں۔ تین دن کن خوشیوں کے ہجوم میں گزرتے ہیں اور پھر جب رخصت کا وقت آتا ہے تو ایک جانگداز سی کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن! یہ جانا بھی تو ضروری ہو جاتا ہے تاکہ آپ پھر آئیں تو مسرتوں سے بھرے ہوئے دامن سمیٹے آئیں۔ آپ جو نقوش اس فضا میں چھوڑ جاتے ہیں وہ میرے لئے سال بھر کا فی سامانِ طمانیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہ نقوش دل کی زمینوں میں مرتسم ہوتے ہیں اور سال بھر آپ کی یاد تازہ کرتے اور مجھ سے گویا باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس موقعہ پر میں آپ کو کونسا الوداعی پیغام دوں؟ اب آپ ایک مجسم پیغام بن چکے ہیں۔ آخری پیغام ایک ہی ہو سکتا ہے — وہی پیغام جو دینے والے نے (روحی فداہٗ) آخری بار سب کو دے دیا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا پیغام اور کیا ہو سکتا ہے؟ — وہ پیغامِ بہار اور نویدِ جشنِ نو روز جسے اگر عام کر دیا جائے تو صحنِ چمنِ عالم کی کلی کلی متبسم ہو جائے۔

اس پیغام کو عام کرنے کی جدوجہد جاری رکھیئے۔ اور اب تو

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہو گا

آپ کی جدوجہد کے نتائج محسوس و مشہود طور پر منظرِ عام پر آ رہے ہیں اور آپ کی کوششوں سے فضا دن بدن نشید قرآنی سے معمور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ابھی اور کتنی سعادتیں ہیں جو ہماری قسمت میں لکھی ہیں۔ یقین رکھیئے کہ یہ سب کچھ ہو کر رہے گا۔ کوئی طاقت اب اسے روک نہیں سکتی۔ اس کے باوجود یہ آپ کا فریضہ ہے کہ ایک ایک لمحہ کی قیمت کو سمجھیئے۔ زمانہ کرب و اضطراب سے کروٹیں بدل رہا ہے۔ اور اگر پاؤں سے کانٹا نکالنے کے تقاضے سے ذرا بھی رکے تو وہ روندتا ہوا گذر جائے گا۔ اس لئے ایک ایک لمحہ کو جاودانی سمجھیئے۔ نہیں بلکہ سورج کی کرنوں سے اپنے لئے کچھ اوقات ادھار مانگ لیجئے۔ یہ ہماری سعادت بخت ہے کہ ہم سے کسی بڑی قربانیوں کا مطالبہ نہیں کیا گیا، ورنہ اس راہ میں تو پہلا قدم ہی بدر کا میدان ہوتا ہے"۔

الوداعی پیغام سے فارغ ہونے کے بعد پرویز صاحب اسٹیج سے نیچے آئے اور باری باری احباب سے گلے ملنے لگے۔ اور اس کے بعد بزمِ قرآنی کے یہ طائرانِ ہمیشہ رس، مخلصانہ آرزوؤں کے جلو میں ایک دوسرے سے رخصت ہونے لگے۔ ستاروں کی انجمن آہستہ آہستہ بکھرتی چلی گئی۔ اور جب آفتاب اپنے نصف النہار سے آگے بڑھا تو اس کی نگاہیں کنونیشن ہاؤس کی رونقوں کو اجڑتے دیکھ رہی تھیں۔ جہاں تین دن اور تین راتیں مسلسل نشیدِ قرآنی سے لالہ و گل کی فضا جھومتی رہی، وہاں اب گہری خاموشیاں طاری ہوتی جا رہی تھیں۔ کنونشن کمیٹی کے صدر اور کنونیشن ہاؤس کے زندہ دل میزبان، جس کے چہرے پر ہمیشہ ایک مسکراہٹ سی کھیلتی نظر آتی ہے، اب خاموش اور اداس اداس سا دکھائی دیتا تھا۔ اب وہ سال بھر ان انوکھے مہمانوں اور زندگی کے ساتھیوں کا انتظار کریں گے۔ اور آئندہ موسمِ بہار، اور جشنِ نزولِ قرآن کے ساتھ پھر خیر مقدم کی تیاریوں میں لگ جائیں گے۔

کنونشن ہاؤس کے میزبانوں! اور بزمِ قرآنی کے ہمسفرو!! تم سب پر سلام ہو کہ تمہارے ربطِ باہمی اور ذوقِ سفر کے صدقہ میں آج قرآنی صبحِ انقلاب کی کرنیں، قدامت پرستی کی تاریکیوں اور سازشِ مجسم کی چلمنوں سے ابھر ابھر کر پاکستان کی فضا کے بسیط میں پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ تم نے دیارِ عشق میں اپنے مقام کا تعین کر لیا۔ اور ایک نیا زمانہ اور نئے شام و سحر تمہارے قدم لینے کو آگے بڑھ رہے ہیں۔ مبارک ہوں زندگی کی یہ کامرانیاں اور سعد بختیاں، جن پر تاریخ ناز کرے گی۔ اور

آنے والا وقت لکھے گا کہانی اِک نئے مضمون کی

شعلۂ نمناک

طلوعِ اسلام کی چھٹی سالانہ کنونشن

منعقدہ گلبرگ (لاہور)

۱۳ تا ۱۵ اپریل ــــــ ۱۹۶۲ء

(روئیداد، ماخوذ از طلوعِ اسلام - مئی، جون ۱۹۶۲ء)

لہ ساقیا! برجگرم شعلۂ نمناک انداز :. دگر آشوب قیامت بکفِ خاک انداز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

بادہ مستانِ حرم کے شوق و مستی کی بساط
بچھ رہی ہے پھر سحاز نور کی آغوش میں

صدیوں کے پے در پے اور ناکام تجربوں نے نوعِ انسانی کو مایوسی اور شکست کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں لا کھڑا کیا ہے۔ ذہنِ انسانی کی مسلسل کاوشیں صحرائے نامرادی میں دم توڑ رہی ہیں اور کوئی نشانِ منزل نگاہوں کے سامنے موجود نہیں۔ نوعِ انسانی نامرادیوں اور حرماں نصیبیوں کے اس نازک مرحلے سے دوچار تھی اور فضائے کائنات پر مایوسیوں کا یہ اندوہناک سماں طاری تھا کہ فضاؤں میں ایک انوکھی اور دلنشیں آواز، فردوسِ گوش بنی سنائی دی۔ یہ آواز انسانی نجات و سعادت کے اس آخری اور مکمل ضابطۂ حیات کی نقیب تھی جو چودہ سو برس قبل خالقِ کائنات اور رب العالمین کی بارگاہِ عظیم سے حضور رسالتمآبؐ کی وساطت سے انسانوں کو عطا ہوا۔ اور اپنی عالم آرائی کے درخشندہ اور حسین ترین نقوش صفحۂ ارض پر قائم کرنے کے بعد اب ریشمی غلافوں میں لپٹا پڑا تھا۔

یہ تھا تاریخِ انسانی کا وہ نازک مرحلہ جبکہ طلوعِ اسلام نے عراقِ دلنشیں کے اس ساز کو چھیڑا۔ اور کوثر و تسنیم کی موجوں میں ڈھلے ہوئے نغمے اس کے کالموں میں گونجنے لگے۔ گذشتہ چونتیس[1] سال سے یہ دعوتِ انقلاب ہزاروں قلوب و اذہان میں اپنی صداقت کے نقوش قائم کرتی جا رہی ہے۔ اس

---

[1] طلوعِ اسلام کے دورِ اول کا اجرا ۱۹۳۸ء میں ہوا تھا۔

کے عالم آرا مقاصد نکھر اور ابھر کر منظرِ عام پہ آ رہے ہیں۔ اور اب نہ صرف پاکستان، بلکہ بیرونِ پاکستان میں بھی، جگہ جگہ اسے پُرخلوص اُمنگوں اور انتہائی تڑپ اور خلش سے لبیک کہا جا رہا ہے۔

پس منظر نومبر ۱۹۵۶ء میں طلوعِ اسلام کنونشن کے نام سے پہلی بار اس تحریک کے ہم نوا اور اس فکر سے ہم آہنگ احباب کا اولین اجتماع لاہور میں ہوا۔ اور اس دعوتِ قرآنی کو منظم طور پر آگے بڑھانے کے لیئے رابطہ باہمی اور مشاورت کی خوشگوار صورت سامنے آئی۔ اگلے سال راولپنڈی نے اس سلسلہ میں اپنے مہمانوں کی میزبانی کی اور پھر اس کے بعد لاہور کی سرزمین کو ان مسلسل سالانہ اجتماعات کے خیرمقدم کا شرف حاصل ہوتا چلا آیا۔ طلوعِ اسلام کنونشن کے اس چھٹے سالانہ اجتماع کے لئے قرعۂ فال بھی لاہور ہی کے نام پڑا۔ اور موسمِ بہار کی شاداب فضاؤں میں گلبرگ کا ایک وسیع و عریض بنگلہ، آراستہ و پیراستہ ہو کر، قرآنی فکر کے طائرانِ چمن رس کے سالانہ اجتماع کا نشیمن قرار پا گیا۔

لاہور، جسے بجا طور پر پانچ دریاؤں کی عروسِ بہار کا دھڑکتا ہوا دل کہنا چاہیئے، اپنی پہنائیوں میں عظمتِ رفتہ کے کتنے ہی نقوشِ تابندہ اور گہرہائے رخشندہ کو سمٹاتے ہوئے ہے، لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے تو اس کی دھڑکنیں نشیدِ قرآنی کے جن زمزموں سے مالا مال چلی آ رہی ہیں، اس کا اعزاز کسی دوسرے شہر کو حاصل نہیں۔ اپریل ۱۹۳۸ء تک اسی خیابانِ آرزو سے اقبالؒ کا یہ نغمۂ حیات گونجتا رہا کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اور پھر مشرق کا یہ آتش نوا فقیر ہم سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا کہ

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

لیکن اس نالۂ فراق کے ساتھ اس کی یہ نوید جانفزا بھی سنائی دی کہ

بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

یہ مبداءِ فیض کی کرم گستری کا اعجاز تھا کہ عین اس وقت جبکہ اس داتا کے راز کے ماتم میں خون کے آنسو

بہائے جا رہے تھے، طلوعِ اسلام کی ننھی ننھی کرنیں بہ نغمۂ الاتی منظرِ عام پر آگئیں کہ

اگرچہ میکدہ سے اُٹھ کے چل دیا ساقی
وہ مے وہ خُم وہ صراحی وہ جام باقی ہے

وقت کا قافلہ رواں دواں آگے بڑھتا گیا۔ "دولتِ پرویز" اقبال کی نواؤں کا صلہ بن کر اس کے قافلے میں لٹتی چلی گئی۔ طلوعِ اسلام کی پہلی کرن اقبال کے ماتم میں سیاہ پوش ہو کر منظرِ اشاعت پر آئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اس کے نورِ بصیرت کی امین و ترجمان اور پاسبان بھی قرار پا گئی۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا یہ حسین و جمیل سلسلہ اپریل ۱۹۳۸ء سے فضاؤں کو تابناک بنائے چلا آرہا ہے۔ تقسیمِ ہند سے پہلے دہلی کا دار الحکومت اس مقصدِ عزیز کا سرچشمہ تھا۔ حصولِ پاکستان کے بعد دار الحکومت کراچی کو اس کا مرکز بننے کا شرف حاصل ہوا اور پھر ۱۹۵۸ء سے خود اقبال کے لاہور نے اپنی چشمِ انتظار اس کی راہ میں بچھا دی۔ اب چار سال سے لاہور نہ صرف طلوعِ اسلام کا مرکز اور قرآنی فکر کا سرچشمہ بلکہ مفکرِ قرآن کا مسکن بھی ہے۔ اس کا یہی اعزاز طلوعِ اسلام کنونشن کے سالانہ انعقاد کے لئے وجہ جواز جاتا ہے۔ اور اسی بنا پر یہ ضروری ہو گیا کہ کنونشن کے چھٹے سالانہ اجتماع کے لئے بھی نگہ انتخاب اسی کے حق میں فیصلہ کرے۔

کنونشن کی تیاریاں

نئے حالات کے نئے تقاضوں میں اس سالانہ کنونشن سے متعلق بڑھتے ہوئے طلوعِ اسلام پہلے سے کہیں بڑھ کر دلچسپیوں اور ذوق و شوق کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور منتظمین کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس مقصد کے پیشِ نظر ایسی جگہ تلاش کی جائے جو ان بڑھتی ہوئی ضروریات کے شایانِ شان کفیل ثابت ہو۔ بعد از تلاشِ بسیار ای/۱۲۸ دسی سکیم گلبرگ کا طویل و عریض بنگلہ سامنے آیا اور مالکان نے بمسرت تمام اسے کنونشن کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ یہ بنگلہ زیرِ تعمیر تھا اور اس کی وسعتوں میں سامانِ تعمیر کے ڈھیروں کے ڈھیر پھیلے ہوئے تھے۔ سہ روزہ عارضی ضروریات کے لئے بہت سی فوری لیکن عارضی تعمیرات کی بھی ضرورت تھی۔ پانی، بجلی اور ٹیلیفون کے کنکشن بھی اشد ضروری تھے۔ کنونشن کی تاریخیں تیزی سے قریب آ رہی تھیں اور کنونشن کمیٹی کو چند دنوں کے مختصر سے وقفے میں بڑے اہم اور ضروری انتظامات سے عہدہ برآ ہونا تھا۔ مسئلہ بڑا کٹھن تھا لیکن خارہ شگافانِ دشتِ قرآنی کی ہمت نے اس ویرانے میں جہاں مواصلات تک کا کوئی ادنیٰ انتظام نہیں تھا، ایک نئی

دنیا بسا دی۔ ہر کام تیزی اور خوش اسلوبی سے تکمیل پانے لگا۔ اور بارہ اپریل کی صبح کو جبکہ ملک کے دور دراز گوشوں سے نمائندگان کی آمد آمد شروع ہوئی، ہر شئے حسنِ ترتیب کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی مہمانوں کے لئے چشم براہ تھی۔

احباب کا داخلہ

۱۲ اپریل کی صبح کو طلوعِ آفتاب کے فوراً بعد کنونشن ہاؤس میں احباب کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دور دراز کی بزموں کے نمائندے مختلف ٹرینوں اور بسوں سے سارا دن لاہور پہنچتے رہے۔ لاہور پہنچ کر گلبرگ کے دور افتادہ ویرانوں میں کنونشن ہاؤس کو تلاش کرنا، پہاڑوں سے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ یہ کٹھن مرحلہ بھی کسی نہ کسی طرح طے ہوتا رہا۔ تلاشِ منزلِ لیلےٰ میں بھٹکے ماندے قیس درِ مقصود پر پہنچکر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ آتے۔ اور کنونشن ہاؤس کی آغوشِ عاطفت خیر مقدم کہتے ہوئے انہیں اپنے دامن میں سمٹا لیتی۔ مختلف کمروں میں چارپائیوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا اور جب سورج افقِ مغرب میں غائب ہو رہا تھا تو مہمانوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے کمرے مسکراہٹوں اور قہقہوں کی تازہ بستیاں آباد کر چکے تھے۔ ایوانِ کنونشن رنگا رنگ کے قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ اس وقت تک اس کاروانِ شوق کے قافلہ سالار جناب پرویز بھی کنونشن ہاؤس میں پہنچ گئے تھے۔ ان کی تشریف فرمائی اور ایک ایک کمرے میں پہنچکر ہمصفیرانِ چمن سے ان کی ہم آغوشیوں نے اس فضا کو مزید رنگینیاں اور شادابیاں بخش دیں۔ میرِ کارواں کی آمد! یوں سمجھیئے۔

اک جہانِ تازہ کی صبحِ نمود
اک حیاتِ نو کی شامِ افتتاح

ماحول کے ویرانوں میں مسرتوں اور قہقہوں کا یہ ہجوم زبانِ حال سے یہ گیت گا تا سنائی دے رہا تھا کہ

کانٹوں کو سنبل و گل و ریحاں کریں گے ہم
ذروں کو آفتاب درخشاں کریں گے ہم
روشن کریں گے حق و صداقت کی مشعلیں
باطل کی ظلمتوں میں چراغاں کریں گے ہم

فضا مسرت بھرے قہقہوں سے گونج رہی تھی اور رات کے کھانے سے فراغت پاکر سب تعارفی اجلاس کے منتظر تھے کہ یکایک برقی رو بھی وفورِ مسرت کے ان ہنگاموں سے متاثر ہوئی۔ اور ستاروں کو بلانے اور

شعلے برساتے ہوئے آنِ واحد میں اُس نے روشنی کا سارا نظام تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ اب کمرے شب دیجور کی تاریکیوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ایوانِ کنونشن پر الگ شب ہجر کا سا سماں طاری تھا اور روشنی کی بازیافت کئی گھنٹوں تک ناممکن ہو کر رہ گئی۔ رات کا تعارفی اجلاس مجبوراً اگلی صبح پر ملتوی کرنا پڑا۔ اس سے صبح کے اجلاس کی اہمیت کافی بڑھ گئی۔

اس تعارفی اجلاس کو اب صبح کے افتتاحی اجلاس سے ہم آہنگ ہونا تھا اور ستاروں کی چشمکیں برملا کہہ رہی تھیں کہ

دمِ سحر انکشاف ہوگا جو نبض ہے موجِ شبنمی کا !!
گلوں کے دل پر گری سجدے وہ تپتی کہ باوضو ہے

جھلملاتے ہوئے ستاروں اور اذانِ سحر کی دلکشی ۱۳ اپریل کی صبح بہار کے نقیب بن گئے۔ احباب انگڑائیاں لیتے بستروں سے اٹھ بیٹھے۔ اور تھوڑی دیر بعد قرآن کے یہ شیدائی صفیں باندھے کھڑے تھے اور ترتیلِ قرآنی کے تاثر سے نگاہیں نمناک تھیں۔ نماز کے بعد احباب نے جلدی جلدی غسل اور ناشتہ وغیرہ سے فراغت حاصل کی۔ اب سب کا رخ پنڈال کی طرف تھا اور ایوانِ کنونشن کے دروازے انہیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ پہلے اجلاس میں حسبِ معمول تعارف ہوا۔ پھر استقبالیہ اور ناظم ادارہ کی رپورٹ۔

پرویز صاحب کا استقبالیہ خطاب

اس کے بعد پرویز صاحب اپنا استقبالیہ خطاب لے کر اسٹیج پر تشریف لائے۔ اس خطاب کا عنوان تھا۔

ساقیا! برجگرم
شعلۂ نمناک
انداز
دگر آشوبِ قیامت بکفِ خاک انداز

احباب کا خیر مقدم کرتے ہوئے پرویز صاحب نے اسے مبدا فیض کی کرم گستری سے تعبیر کیا کہ ان کی حقیری کوشش اب بے مثال کامرانیوں سے سرفراز ہے اور ان کے مٹھی بھر بے سروسامان ساتھیوں نے حالات کی نامساعدت کے باوجود جس سعیٔ مشکور سے کام لیا ہے اس کی بدولت دعوتِ قرآنی کے پرچے یورپ اور امریکہ تک پہنچ گئے ہیں۔ پرویز صاحب نے اس یقینِ کامل کا اظہار کیا کہ ان کی امیدیں اور آرزوئیں لازماً

ایک حقیقت ثابتہ قرار پائیں گی۔ اور ایک ایک آواز اس کی تائید پر مجبور ہو جائے گی۔

تحریک کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے پرویز صاحب نے فرمایا کہ ہم مطمئن ہیں کہ نشر و اشاعت کے سلسلے میں ہمارے وسائل کی کمی مخالفین کے زور مخالفت سے پوری ہو رہی ہے۔ مخالفین کے بے پناہ پروپیگنڈہ نے جس تیزی سے ہمارے مقاصد کی تکمیل کی ہے وہ ہمارے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ انہوں نے پورے اعتماد سے اعلان کیا کہ قرآن کی آواز کو اب رد کیا نہیں جا سکتا اور مخالفت کی خس و خاشاک اسکے سیلِ رواں کی روانی میں حائل نہیں ہو سکے گی۔

پرویز صاحب نے تحریک کے "نادان دوستوں" کو خاص طور پر متوجہ کیا اور ان پر واضح کیا کہ ہمارے دشمن اس تحریک کو اس نقصان کا عشر عشیر بھی نہیں پہنچا سکتے جو نادان دوستوں کی غیر ذمہ دارانہ روش کے ہاتھوں پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ قرآنی تحریک کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے احتیاط سے کام لیں اور ایسی باتوں سے اجتناب کریں جو اس معاملہ میں غلط فہمیوں کا باعث ہوں۔

پرویز صاحب نے احباب پر واضح کیا کہ معاملہ قرآن کو سمجھ لینے پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ سیرت و کردار کو قرآن کے سانچوں میں ڈھالنے کی اشد ضرورت ہے۔ جس انقلاب کو ہم محسوس و مشہود پیکروں میں دیکھنا چاہتے ہیں اسے سب سے پہلے ہمارے قلوب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہونا چاہیئے۔

مفکرِ قرآن کا یہ خطاب قرآنی فکر کے طائرانِ پیش رس کے لئے نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس خطاب میں انہوں نے تحریک کے ہر گوشے کو وضاحت کے ساتھ نمائندگان کے سامنے پیش کیا۔ اور ہر نقطۂ نظر سے انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ اختتام پر انہوں نے اس عزم کا اظہار فرمایا کہ

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیِ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کر کے رہیں گے

(پرویز)

(یہ خطاب آئندہ صفحات میں پیشِ خدمت ہے)

(۰)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شعلۂ نمناک

یاران ہم سفر کے نام

دریں صحرا گذر افتاد نشاید کاروانے را
پس از مدت شنیدم نغمہ ہائے ساربانے را

عزیزانِ ہم عناں۔ سلام و رحمت!

ایک سال کی مدتِ فراق، بڑی طویل و صبر آزما ہوتی ہے۔ لیکن میں اس کی زہرہ گدازی و جگر خراشی کو کم کرنے کے لئے کرتا یہ ہوں کہ جب کبھی کچھ لکھتا ہوں تو آپ احباب کو تصور میں سامنے رکھ لیتا ہوں۔ اور چونکہ لکھتا رہتا ہوں سال بھر برابر اس لئے آپ مجھ سے کسی وقت بھی جدا نہیں ہوتے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس طرح میں فراق کی گھڑیوں کو، وصال کے لمحات میں بدل لیتا ہوں، اور ہر پوچھنے والے سے ایک تبسم زیر لبی سے کہہ دیتا ہوں کہ

بیادِ گیسو و رخسارِ یار گذری ہے
بڑے مزے میں شبِ انتظار گذری ہے

لیکن یہ تسکین، بہر حال ایک خوشگوار فریب سا ہوتا ہے۔ اس جدائی کی کوفت، فی الواقعہ اس وقت دور ہوتی ہے جب آپ احباب اپنی محبت و خلوص کے خرمن لئے، وجہ شادابیٔ قلب و نظر ہو جاتے ہیں

اور یوں، سال بھر کے انتظار کے بعد، پھر ساری فضا پر بہار چھا جاتی ہے۔ اور میری تیرہ سامانی بے تابانہ پکار اٹھتی ہے کہ

حیرت کے غم کدہ میں خوشی کا گزر کہاں!
تم آگئے تو رونقِ کاشانہ ہو گئی!

خدا آپ کے جذبۂ رہ نوردی کو تیز سے تیز تر کر دے، کہ اسی سے آپ کا یہ کاروانِ شوق، بایں ہمہ جذب و کیف، قرآنی منزل کی طرف جادہ پیما ہے۔

میرس از کاروانِ جلوہ مستاں　　　　زاسبابِ جہاں برکندہ دستاں
بجانِ شاں، زآوازِ جرس شور　　　　چو از موجِ نسیمے در نیستاں

برادرانِ گرامی قدر!

مبدا فیض کی کرم گستری ہے قرآنی فکر کی اس حقیر سی کوشش کو جس قدر کامیابی ہوئی ہے میں جب اس پر نگاہ ڈالتا ہوں تو میرا سر نیاز بدرگاہِ رب العزت، قدم قدم پر سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ تعداد کے اعتبار سے مٹھی بھر انسانوں کی یہ جماعت، ساز و سامان کے لحاظ سے بالکل بے بضاعت نہ کسی دنیادی سہارے کی کوئی تائید، نہ کسی گوشے سے کسی قسم کی کوئی امداد۔ ایسے نامساعد حالات، اور ان

تحریک کی مقبولیت

میں کامیابی کا یہ عالم کہ ملک کا کوئی بعید سے بعید تر گوشہ بھی ایسا نہ ہوگا جو اس آواز سے متعارف نہ ہو۔ قوم کے تعلیم یافتہ ہوشمند طبقہ (INTELLIGENTSIA) میں، کسی نہ کسی نوعیت سے اب قرآن کا چرچا ہو رہا ہے۔ نوجوان طالب علموں کا حلقہ اس آواز سے متأثر ہو رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ تک کے علمی گوشوں میں یہ آواز پہنچ چکی ہے اور وہاں کے ریسرچ اسکالرز اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے اکثر آتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں، ایک جرمن مصنف نے، اپنی سیاحتِ ہندوپاکستان سے متعلق ایک دلچسپ کتاب شائع کی ہے جس کے ایک باب میں، اس قرآنی تحریک کے متعلق اپنے انداز میں تفصیل سے لکھا ہے — وہ مجھ سے ملنے آیا تھا — اس محیر العقول کامیابی کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ حق کی آواز میں خود اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ ساز و براق کی کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیتا ہے اور جو جماعت اس آواز کو لے کر آگے

بڑھتی ہے، خدا کی کائناتی قوتیں آگے بڑھ کر اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ اور دنیا اس نظارہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے کہ

شعاعِ مہر خود بےتاب ہے جذبِ تمنا سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

مجھے علیٰ وجہ البصیرت اس کا یقین ہو رہا ہے اور اس سے یہ امید ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر میرے سامنے آ رہی ہے کہ

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی دردآشنا ہو جائے گی!

مخالفت کا فائدہ

حق کی آواز کی تائید کے سلسلہ میں بعض اوقات فطرت کا پروگرام عجیب ہوتا ہے۔ وہ حق کے موئیدین کے ذرائع کی کمی کو مخالفین کے زورِ مخالفت سے پورا کر دیتی ہے۔ ہماری قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں بالکل یہی ہوا ہے۔ ہمارے پاس اتنے وسائل کہاں تھے کہ ہم اتنی قلیل سی مدت میں اسے اس قدر عام کر سکتے مخالفین کے بے پناہ پروپیگنڈہ نے یہ مقصد جس تیزی سے پورا کر دیا وہ ہمارے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔

گہے باشد کہ کارِ ناخدائی کند طوفاں!
کہ از طغیانِ موجے کشتیم بر ساحل افتاد است

سچ ہے۔ گرگٹ آتشِ نمرود کو بھڑکانے کے لئے پھونکیں مارتا ہے اور نتیجہ اُس کا گلزارِ ابراہیمؑ کی نزہت فشانیاں ہوتا ہے[1]۔ خدا اس کے پھیپھڑوں کی قوت کو اور زیادہ کرے۔

محتسب کی خیر، اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانے کا نام

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو جلانے کے لئے آگ روشن کی گئی تو باقی جانور اسے بجھانے کی فکر کرتے تھے لیکن گرگٹ پھونکیں مار مار کر اسے بھڑکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ آگ ٹھنڈی ہو کر پھول بن گئی تھی۔ یہ اپنی مروجہ کہانیوں کی طرف تلمیح ہے جس میں روایات کی صحت و سقم سے بحث نہیں۔

برادرانِ عزیز! کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ طلوعِ اسلام کی اس قدر مخالفت کیوں ہوتی ہے؟

مخالفت کی وجہ

ہمارے ہاں کے مذہبی فرقے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ کیونکہ ہر فرقہ اپنا جتھہ قائم رکھنا اور اسے بڑھانا چاہتا ہے۔ طلوعِ اسلام کوئی مذہبی فرقہ نہیں۔ اس کی ساری تعلیم (قرآن کریم کی روشنی میں) فرقہ بندی اور گروہ سازی کے خلاف ہے۔ وہ وحدتِ امت کا داعی اور اخوتِ اسلامی — بلکہ نوعِ انسان کی عالمگیر برادری — کا نقیب ہے۔ جو لوگ اس کی پیش کردہ قرآنی فکر سے متفق ہیں، وہ نہ کسی نئے فرقے میں داخل ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی نوعیت سے باقی مسلمانوں سے الگ کوئی اپنا گروہ بناتے ہیں۔ وہ اسلامی ارکان (نماز، روزہ وغیرہ) اسی طریق سے ادا کرتے رہتے ہیں جس طریق سے وہ ادا کرتے چلے آتے تھے۔ (میں خود حنفی گھرانے میں پیدا ہوا تھا اس لئے حنفی طریقے کے مطابق نماز پڑھتا ہوں)۔ نہ ہی وہ، ختمِ نبوت کے بعد کسی نئے ظہور کے قائل ہیں — خواہ وہ نبوت کے نام سے ہو یا مسیحیت اور مجددیت کے نام سے — نبوت اور مجددیت تو ایک طرف، یہ تو اشخاص کی سیادت و امارت تک کا بھی قائل نہیں۔ اس کے نزدیک ختمِ نبوت کے بعد وابستگی صرف اسلامی نظام سے ہو سکتی ہے، افراد و اشخاص سے نہیں۔ افراد میں سے نہ کسی کا قول کسی کے لئے سند ہو سکتا ہے، نہ کسی کا عمل کسی کے لئے حجت۔ ظاہر ہے کہ جن کا عقیدہ اور مسلک یہ ہو، ان کے ہاں فرقہ بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا، طلوعِ اسلام کی مخالفت ایک مذہبی فرقہ کی حیثیت سے ہو ہی نہیں سکتی۔

مذہبی فرقوں سے آگے بڑھیے تو سیاسی پارٹیوں کی آپس میں کشمکش رہتی ہے۔ کیونکہ ہر پارٹی کے سامنے اپنے سیاسی مفاد ہوتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے بھی نہیں۔ اس کے نزدیک مذہبی فرقوں کی طرح سیاسی پارٹیوں کا وجود بھی اُمت کی تخریب اور دین کی تباہی کا موجب ہے۔ ملتِ اسلامیہ، غیر مسلموں کے مقابلہ میں خود ایک پارٹی ہے۔ اس کے اندر پارٹیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے سیاسی رقابت کی بنا پر بھی طلوعِ اسلام کی مخالفت نہیں ہو سکتی۔

اس سے واضح ہے کہ طلوعِ اسلام کی مخالفت اس لئے نہیں ہوتی کہ ان حضرات کو ڈر ہے کہ یہ کسی دن ایک طاقتور فرقہ یا پارٹی بن جائے گا۔ اس کی مخالفت، درحقیقت اس قرآنی آواز کی مخالفت

ہے جسے یہ بلند کرتا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں ـــ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۶:۳۳﴾ یہ تیری مخالفت نہیں کرتے۔ یہ مخالفت کرتے ہیں قوانین خداوندی کی جن کا یہ انکار کرتے ہیں ـــ ذرا سوچئے کہ ملک میں لاکھوں کی تعداد میں ایسا لٹریچر شائع ہو رہا ہے جو نہ صرف دین کی اصل و بنیاد کے خلاف ہے بلکہ وہ قوم کے اخلاق تک کو تباہ کرتا ہے۔ ان حضرات نے کبھی متحدہ محاذ بنا کر یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اس لٹریچر کو ضبط کر لیا جائے۔ قوم میں ہزارہا افراد ایسے ہیں جو خدا۔ رسول۔ وحی۔ آخرت کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ ان کا (معاذ اللہ) مذاق اڑاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے دہریہ (ATHEIST) ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ ان حضرات کی طرف سے نہ ان کے خلاف کبھی کفر کے فتوے شائع ہوتے ہیں، نہ ان کی بیویوں پر طلاق پڑتی ہے۔ نہ ان کے نماز جنازہ پڑھنے پر کوئی اعتراض کیا جاتا ہے، نہ انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے سے روکا جاتا ہے۔ لیکن حامیانِ دین متین کی رگِ حمیت پھڑکتی ہے تو ان لوگوں کے خلاف جو خدا، رسول، کتاب، ملائکہ، آخرت پر خالصتہً اس طرح ایمان رکھتے ہیں جس طرح قرآن کا مطالبہ ہے۔ جو اس کی کوشش کرتے ہیں کہ خدا کی کتاب کا نور افضائے عالم میں پھیل جائے۔ جن کی سعی و کاوش کا منتہیٰ یہ ہے کہ مسلمانوں میں پھر سے وہ صحیح اسلامی نظام قائم ہو جائے جو آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے حجاز کی سرزمین میں محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے متشکل ہوا تھا۔ اور جس کے قیام میں انسانیت کی فوز و فلاح کا راز پنہاں ہے۔ ان لوگوں کے خلاف شرق سے غرب تک متحدہ محاذ قائم کیا جاتا ہے[1] اور مخالفت کا طوفان برپا کر دیا جاتا ہے۔ ان کی بارگاہِ تقدس مآب سے فیصلہ صادر ہوتا ہے کہ

> یہ لوگ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ ان کے عقدِ نکاح میں کوئی مسلمان عورت نہیں رہ سکتی۔ اور نہ کسی مسلمان عورت کا ان سے نکاح ہو سکتا ہے۔ نہ ان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ نہ مسلمانوں کے قبرستانوں میں ان کا دفن کیا جانا جائز ہے[2]۔

---

[1] اس زمانے میں پرویز صاحب کے خلاف ایک ہزار علماء کے دستخطوں سے کفر کا فتوےٰ شائع ہوا تھا۔ (طلوعِ اسلام)

[2] صفحہ ۲۰۱ پر ملاحظہ ہو۔

حتیٰ کہ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ یہ واجب القتل ہیں ـــــ یہ سب کس جرم کی بنا پر؟ اس جرم کی بنا پر کہ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ـــــ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا آقا صرف اللہ ہے ـــــ وَ نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ. ہم اسی کے احکام و قوانین کے سامنے جھکتے ہیں کسی اور کے سامنے نہیں جھکتے. جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے، یہ مخالفت ہماری نہیں، قرآن کی اس آواز کی ہے، جسے بلند کرنے کی ہم کوشش کرتے ہیں اور اس کی وجہ ظاہر ہے. قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ

قرآن کی انقلابی آواز

زخمہ بر تارِ رگِ جاں می زند

وہ کسی انسان کا اقتدار و اختیار کسی دوسرے انسان پر رہنے نہیں دیتا. وہ کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائے. وہ خدا اور بندے کے درمیان کسی طاقت کو حائل نہیں ہونے دیتا ـــــ خواہ وہ آسمانی حقوق کی مدعی ملوکیت ہو یا خدائی نیابت کی دعویدار پیشوائیت.

چیست قرآن؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

بالفاظِ دیگر ـــــ موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے ـــــ لہٰذا، جو قوتیں دوسروں کو اپنا محکوم اور غلام رکھنا چاہیں، وہ قرآنی آواز کے عام ہونے کو کب گوارا کر سکتی ہیں. اندریں حالات، ان حضرات کی طرف سے اس فکر کی مخالفت قابلِ فہم ہے. علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

گرفتم حضرتِ مُلّا ترش روست		نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ دارم		مرا از کعبہ می راند، حق اوست

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) ایک ملنے والے نے جو کافی عرصہ کی سوچ بچار کے بعد طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کی طرف آئے ہیں، مجھ سے یہ سوال کیا. وہ کہنے لگے کہ میں ایک عرصہ تک کمیونسٹ خیالات کا رہا. کھلے بندوں مذہب کیخلاف جو جی میں آتا کہتا تھا. اس وقت کسی نے بھی مجھے یہ نہیں کہا کہ تم کافر ہو. تمہاری بیوی تم پر حرام ہے. اب میں اسلام کا گرویدہ ہوں، اور مجھ پر یہ فتویٰ عاید کر دیا گیا ہے. تو میں پھر سے وہی کچھ کیوں نہ ہو جاؤں جو پہلے تھا تاکہ ان فتووں کی زد سے بچ کر مسلمان شمار ہونے لگوں؟ اس کا جواب بھی کافر گر حضرات دے سکیں گے. میں کیا عرض کر سکتا ہوں؟

قرآن کریم سے ان حضرات کی مخالفت (بلکہ معاذ اللہ نفرت) اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی شخص یونہی بلا ارادہ کہہ دے کہ ہمیں اس معاملہ میں قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیئے تو یہ تلملا اٹھتے ہیں اور شور مچا دیتے ہیں کہ یہ پرویزیت ہے اور وہ بیچارا ہکا بکا رہ جاتا ہے کہ مجھ سے کیا قصور سرزد ہو گیا۔ یعنی اب یہ حضرات قرآن کریم کا نام تک سننا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ کتنی گہری نفسیاتی حقیقت تھی جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا (۱۷/۴۱)۔ ہم اس قرآن میں حقائق کے مختلف گوشوں کو لوٹا لوٹا کر لاتے ہیں تاکہ یہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔ لیکن اس سے ان کی نفرت اور زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ خدا ہماری حالت پر رحم کرے۔

ان کی ذہنی سطح

ان میں ایک طبقہ تو ان کا ہے جو دیدہ دانستہ قرآنی تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیونکہ ان سے ان کی مفاد پرستیوں پر سخت زد پڑتی ہے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جن کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں کہ وہ قرآنی حقائق کا ادراک کر سکیں۔ اس لئے ان کے نزدیک، صرف وہی شخص صحیح العقیدہ مسلمان ہو سکتا ہے جو ویسا ہی سوچے جیسا وہ سوچتے ہیں۔ وہی کہے جو وہ کہتے ہیں۔ جو ان کی ذہنی سطح سے ذرا بلند ہو کر قرآن کریم کے متعلق غور و فکر کرے، وہ کافر ہے۔ ان کے نزدیک قرآن کا مصرف اتنا ہی ہے ـــ کہ از یٰسین او آساں میری ـــ انہی کے متعلق حضرت علامہ نے کہا تھا کہ

زانسوئے گردوں دلش بیگانہ — نزد او اُم الکتاب افسانہ
بے نصیب از حکمت دین نبیؐ — آسمانش تیرہ از بے کوکبی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — ملت از قال و اقولش فرد فرد
مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب
کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب (جاوید نامہ)

اقبالؒ کے متعلق ممکن ہے کہہ دیا جائے کہ دین کے متعلق وہ کیا جانتا تھا کیونکہ وہ ڈاڑھی منڈاتا تھا۔ یہ بات میں نے یونہی مزاحاً و قیاساً نہیں کہی۔ ان حضرات کے نزدیک خدا پرستی اور دین شناسی کا یہ اولین معیار ہے۔ پچھلے دنوں میں نے مفتی محمد شفیع صاحب کے خط کے جواب میں لکھا تھا کہ

خدا پرستی کا معیار | جس لٹریچر کی بنا پر مجھے کافر قرار دیا جا رہا ہے، اس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس وقت ملک میں ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوان ایسے ہیں جو اس لٹریچر کی بدولت اسلام کے گرویدہ ہیں اور اگر یہ لٹریچر ان تک نہ پہنچتا تو وہ کبھی کے مغربی مادیت یا روس کی کیمونزم کے آغوش میں جا چکے ہوتے۔

اس پر ایک جریدہ میں[1] جو اس طبقہ کا نمائندہ ہے، لکھا گیا کہ

> کیا جناب پرویز صاحب از رہ کرم ان ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے کسی ایک ایسے نوجوان کی بھی متعین طور پر نشاندہی کر سکتے ہیں (کہ وہ کون ہیں اور کس دنیا میں بستے ہیں) جو ان کا لٹریچر پڑھنے سے پہلے تو مادہ پرست اور ڈاڑھی منڈا ہو، مگر ان کا لٹریچر پڑھنے کے بعد خدا پرست بھی ہو گیا ہو اور ڈاڑھی بھی رکھ لی ہو۔

(ایشیا - ۲۶ مارچ ۱۹۷۲ء)

لہٰذا ان کے نزدیک دین کے معاملہ میں اقبالؒ کا قول بھی کیا وزن رکھ سکتا ہے؟ اس لئے اس امر کی وضاحت کے لئے کہ اس طبقہ کے علمِ دین کی حقیقت کیا ہے میں انہی میں سے دو ایک کی رائے پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ مفتی محمد عبدہٗ، مصر کے نامور عالم گزرے ہیں۔ یہ بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ وہ جامعہ ازہر کے متعلق، جو اسلامی دنیا میں مذہبی علوم کی سب سے بڑی درس گاہ ہے، لکھتے ہیں۔

> جو شخص ازہر یا اس کی قبیل کے مدارس میں جتنی زیادہ مدت تک تحصیل علم کرتا ہے۔ اتنی ہی اس میں تحصیل علم کی صلاحیت مفقود ہوتی جاتی ہے۔

(تفسیر المنار جلد اول صفحہ ۱۸۱)

---

[1] یہ اخبار اس جماعت (جماعت اسلامی) کا ترجمان ہے جو اپنے آپ کو ماڈرن اور لبرل خیالات رکھنے والی کہتی ہے۔ واضح رہے کہ اس وقت میرا مقصد ڈاڑھی کے متعلق کوئی بحث چھیڑنا نہیں۔ نہ ہی ڈاڑھی رکھنے والوں کا کسی طرح استخفاف مقصود ہے۔ میرا مطلب صرف یہ بیان کرنا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک خدا پرستی کا معیار یہ رہ گیا ہے۔

مفتی محمد عبدہٗ کے شاگرد، سید رشید رضا (مرحوم) اپنے استاد کا قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

ان کا خیال تھا کہ علمائے ازہر اور ان کی قسم کے اور بڑے بڑے شیوخ (علماء) وہ بزرگ ہیں جن کی اصلاح کی امید باقی نہیں رہی۔

جب جامعہ ازہر کا یہ حال ہے، تو اسی کے خطوط پر منشکل، ہمارے ہاں کے دارالعلوموں کے متعلق بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) طبقۂ علماء کے سرخیل اور امام الہند سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی مشہور تصنیف، تذکرہ میں علماء کی سیرت و کردار کا جو نقشہ کھینچا ہے میں اس سے درگذر کرتا ہوں۔ ان کے علم کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

مدتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ اُمتِ اسلامیہ کے تمام مفاسد و مصائب کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ سارے برگ و بار و ثمراتِ فساد کا انہی سے ظہور و نمود ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم باسم اصل و اساسِ علومِ شرعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، اگر کسی صاحبِ حکمت کی نظرِ کیمیاوی ان کی تحلیل و تفریق کرے تو کھل جائے کہ کس قدر حصہ ان کا شریعتِ اصلیہ اور دینِ الخاص سے مرکب ہے اور کس قدر اس فتنۂ عالم آشوب، یونانیت اور عجمیت سے کوئی شے اس سے نہ بچی حتیٰ کہ علماً علومِ الٰہیہ و بلاغت و بیان۔ اور عملاً جزئیاتِ اعمال و رسوم و ہیئاتِ معاشرت وغیر ذالک۔ جب یہ حال علوم شرعیہ بلکہ نام نہاد اصولیہ کا ہے، تو پھر ان اساطیر دا دنام کا کیا پوچھنا جن کو بہ لقب شریف "معقولات" پکارا جاتا ہے۔

گذرے ہوئے لوگوں سے آگے بڑھیے تو جو لوگ آج اس طبقہ میں موجود ہیں، وہ بھی اس تنقید میں اِن سے پیچھے نہیں۔ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی طبقۂ علماء کے متعلق لکھتے ہیں۔

یہ طبقہ جس ماحول سے تعلیم و تربیت پاکر آتا ہے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے وہاں دین کے مہمات اور قوم کے مصالح کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ تمام دلچسپیاں سمٹ کر چھوٹی چھوٹی نزاعی باتوں میں جمع ہو گئی ہیں۔ یہ لوگ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی ساخت کو جھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی

نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں۔ ان پر اظہار نفرت تو ان سے جتنا جی چاہے کرا لیجئے لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لئے جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے یہ علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیمیافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سُن کر یا ان کی تحریریں کو پڑھ کر بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچا ہو۔ (تنقیحات صفحہ ۲۸)

آپ کو غالباً اس کا علم ہوگا کہ جس درس نظامیہ کی تکمیل کے بعد ان حضرات کو عالم ہونے کی سند ملتی ہے، قرآن کریم اس کے نصاب ہی میں داخل نہیں۔ صرف آخری سال، سورہ بقرہ کی تفسیر بیضاوی تبرکاً پڑھا دی جاتی ہے۔ لہٰذا اس طبقہ کی طرف سے اگر قرآنی حقائق کی مخالفت ہوتی ہے تو یہ بچارے معذور ہیں۔ قرآنی حقائق کا ادراک ان کے بس کی بات نہیں۔

زخود رمیدہ چہ داند نوائے من زکجاست
جہان او دگراست و جہانِ من دگراست

ان کا تصور وہ ہے جس کی طرف حضرت علامہؒ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ

تیری نگاہ فرومایہ۔ ہاتھ ہے کوتاہ
ترا گناہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ

جو بات ان کی ذہنی دسترس سے باہر ہو وہ ان کے نزدیک کفر ہے۔ اور اس "کفر" کی مخالفت جہادِ عظیم۔

مخالفت بربنائے جہالت

اگر انہیں کہیں ایسی تعلیم مل جاتے جس سے یہ قرآنِ کریم کی پیش کردہ تصورِ حیات اور اس کے حقائق و غوامض سمجھنے کے قابل ہو جائیں، تو پوچھئے نہیں کہ ان کی حالت کیا سے کیا ہو جاتے۔

کیا چاہیئے کیا کہنا — کیا دیکھنا کیا کرنا!
زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں

جب قرآن کریم سمجھ میں آنے لگ جاتا ہے تو پھر انسان کا دامن نگاہ چھوٹی چھوٹی جزئیات اور فروعی اختلافات میں الجھتا ہی نہیں۔ اس کی نظر بہت بلند اور اس کی فکر کا دائرہ بڑا وسیع ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہ دین کے مہمات، اصول اور زندگی کے اہم عملی مسائل پر ہوتی ہے۔ وہ ہر اس شخص کو اپنے قریب بٹھانے کی کوشش کرتا ہے جس کا رجحان ذرا سا بھی دین کی طرف ہو۔ اگر ان حضرات کو توفیق نصیب ہو کہ یہ قرآن کے حقائق سے بہرہ یاب ہو سکیں تو یہ آپ احباب کو، سب سے زیادہ اپنے قریب پائیں جس کی نگاہ قرآن پر ہو، اس کی تو کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جو قرآن سے قریب ہو وہ اس کا عزیز ترین دوست اور رشتہ دار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے میں ان حضرات سے کہا کرتا ہوں کہ

وہ تو وہ ہیں تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے!
اک نظر تم میرا محبوب نظر تو دیکھو

لیکن مشکل یہ ہے کہ انہیں تعلیم ہی کچھ اس انداز کی ملتی ہے جس سے یہ خدا کی اس کتاب عظیم کی طرف آنے ہی نہیں پاتے۔ اور چونکہ انہیں بتایا یہ جاتا ہے کہ جو کچھ اس کے مطابق نہ ہو جو تمہیں پڑھایا گیا ہے، وہ کفر اور باطل ہے، اس لئے یہ حضرات قرآن، اور قرآن پیش کرنے والوں کی اس طرح مخالفت کرتے ہیں۔

یہ ہے مخالفت کرنے والوں کا وہ گروہ جو بربنائے جہالت قرآنی فکر کی مخالفت کرتا ہے۔ انہی کو وہ شاطر اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر قرآنی فکر و نظام کی مخالفت کرتے ہیں۔

لیکن یہ آواز دب نہیں سکتی

لیکن اللہ کا شکر ہے کہ قرآن کریم کی یہ آواز اب اس قدر عام ہو چکی ہے کہ اس کا سیلِ رواں، مخالفت کی ان خس و خاشاک سے رک نہیں سکتا۔

رہیں نہ رند۔ یہ زاہد کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے، دو چار دس کی بات نہیں

جن سمروں میں خدا کی اِس کتابِ عظیم کا سودا سما جاتا ہے، ان کی زبانیں اس کے تذکرہ سے رُک کیسے سکتی ہیں؟ ان کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس بلند و بالا مقصد کے حصول کے لئے وقف ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے ابدی حقائق تابندہ ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کرتے دنیا کے سامنے آجائیں اور خدا کا متعین کردہ نظام، دنیا میں عملاً متشکل ہو جائے تاکہ نوعِ انسانی جن تاریکیوں میں الجھ کر صحیح راستہ کھو چکی ہے وہ تاریکیاں چھٹ جائیں اور جنت سے نکلے ہوئے آدم کو پھر سے جنت میں جانے کا کہکشانی صراطِ مستقیم مِل جائے۔ یہ مقصد حاصل ہو جائے تو اس کے لئے انہیں جو سزا بھی دی جائے یہ اُسے انتہائی مسرت سے برداشت کرینگے۔

آئے کچھ ابر، کچھ شراب آئے   اس کے بعد آئے، جو عذاب آئے
بامِ مینا سے ماہتاب اُترے   دستِ ساقی میں آفتاب آئے
ہر رگِ خوں میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے!

اور اس طرح "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے"۔ دنیا انہیں جو جی میں آئے کہے، ان کی انتہائی آرزو یہ ہے کہ جب یہ بحضورِ داورِ محشر جائیں تو ان کا شمار اس گروہ میں نہ ہو جس کے متعلق حضور رسالتمآبؐ بدرگاہِ رب العزت شکایت کر رہے ہوں کہ

یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ○ (۲۵/۳۰)

اے میرے پروردگار! یہ ہے میرے نام لیواؤں کی وہ قوم جس نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا (یا اس کی آزادی سلب کر رکھی تھی)۔

آپ کو برادرانِ عزیز! اس حقیقت کا علم ہے کہ میں شروع سے یہ اعلان کرتا چلا آرہا ہوں کہ میں قرآنِ کریم کا طالبِ علم ہوں۔ میں جو کچھ قرآن مجید سے سمجھتا ہوں اسے بلا کم و کاست دوسروں کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ حرفِ آخر ہے یا اس میں اصلاح کی گنجائش نہیں۔ میرے اس اعلان پر میری تصانیف شاہد ہیں۔ میں ہمیشہ اربابِ نظر کو دعوت

دیتا ہوں کہ وہ میری قرآنی فکر کو تنقیدی نگاہ سے دیکھیں اور اگر انہیں کسی جگہ کوئی سہو یا سقم نظر آئے تو اس سے مجھے مطلع فرمائیں میں ان کا شکر گذار ہوں گا۔

معیار قرآن ہونا چاہیئے

لیکن اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ صحیح اور غلط کا معیار قرآن کریم ہو۔ میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآن پیش کرتا ہوں' اس لئے اسے قرآن ہی کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔ اگر میری کوئی بات قرآن کے خلاف ہے' اور کوئی جاہل اور عامی بھی اس کی نشاندہی کرتا ہے' تو میں اس کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ ہوں۔ لیکن اگر کوئی فرد یا افراد کی جماعت۔۔۔ خواہ وہ گروہ کثیر ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ یہ کہتی ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہمارے معتقدات کے خلاف ہے' اس لئے غلط اور خلافِ دین ہے' تو میں اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ میں جس خدا پر ایمان لایا ہوں اس کا حکم یہ ہے کہ اِتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳) جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو۔ اس کو چھوڑ کر' اور سرپرستوں اور مددگاروں کی پیروی مت کرو۔ یہ ہے میرے نزدیک غلط اور صحیح' حق و باطل اور کفر و ایمان کا معیار ۔۔۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو کتابِ خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتا تو یہی لوگ کافر ہیں۔

میرے لئے حرفِ آخر اور قولِ فیصل ہے۔ اگر کسی کے نزدیک یہ "کفر" ہے تو مجھے اس "کفر" پر ناز ہے خدا اس پر مجھے زندہ رکھے اور اسی پر موت دے۔

اب برادرانِ عزیز! دوسری طرف آیئے۔ میں نے جو کہا ہے کہ فطرت' بعض اوقات' خود مخالفین کی مخالفت سے حق کی تائید کا کام لے لیتی ہے' تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ احباب' قرآنی

آپ کا کام

آواز کے پھیلانے کے سلسلہ میں اپنی سعی و کاوش میں سست رو ہو جائیں۔ قطعاً نہیں' یہ ٹھیک ہے کہ ٹھوکر (FALL) نہر کے پانی کی رفتار کو تیز کر دیتی ہے' لیکن اسی نہر کی رفتار کو جس کا پانی ٹھوکر کو پھاند کر آگے بڑھ جائے۔ اگر نہر کے پانی کی سطح ٹھوکر کی بلندی سے نیچی ہو' تو وہ نہر دہیں رک جاتی ہے اور اس کی روانی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے

کہ مخالفت کی تیزی کے ساتھ آپ کی کوششیں تیز سے تیز تر ہوتی جائیں۔

اس ضمن میں عزیزانِ من! میں ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ میں سے جو حضرات کچھ عرصہ سے اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ تو اس حقیقت کو سمجھ چکے ہیں لیکن نووارد احباب جو ایک خاص ولولہ لے کر شریکِ محفل ہوتے ہیں، انہیں اس نکتہ کے سمجھنے میں ذرا دقت لگتا ہے۔ جو کچھ میں اس مقام پر کہنا چاہتا ہوں اس کا اولین مخاطب یہی طبقہ ہے۔ ان کا تقاضا یہ

عملی پروگرام

ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی عملی پروگرام نہیں۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی متعدد بار عرض کر چکا ہوں، ہمارے ہاں ہنگامی تحریکوں اور سیاسی جماعتوں نے اس قسم کا تصور عام کر رکھا ہے کہ جس پروگرام میں ہنگامہ خیزیاں اور شورانگیزیاں نہ ہوں، وہ پروگرام عملی نہیں ہوتا۔ عملی پروگرام کے لئے، بگولوں کا سا رقص، اور طوفان کا سا جوش و خروش ضروری ہے۔ طلوعِ اسلام اپنی نوعیت کی پہلی اور منفرد تحریک ہے جس کا مقصد لوگوں کے قلب و نگاہ میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اس لئے کہ اس نے قرآن کریم کی تعلیم سے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (۱۳/۱۱) جب تک کسی قوم میں نفسیاتی تبدیلی نہیں ہوتی اس کی حالت نہیں بدل سکتی۔ طلوعِ اسلام کا مقصد، قوم میں اس نفسیاتی تبدیلی کا پیدا کرنا ہے۔ اور یہ مقصد ہنگامہ آرائیوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ خاموش لیکن استقامت آمیز تبلیغ سے ہو سکتا ہے۔ لاہور کا تو مجھے علم نہیں، لیکن کراچی میں برسوں تک ایک عجیب منظر دکھائی دیتا رہا۔ شام کے وقت، شہر کی سب سے بارونق سڑک الفنسٹن سٹریٹ کے چوراہے پر ایک کونے میں، ایک یوروپین نوجوان خاموش کھڑا دکھائی دیتا۔ عمدہ سوٹ میں ملبوس، ایک تھیلہ گلے میں لٹکا ہے اور ہاتھ میں ایک پمفلٹ لئے، خاموش کھڑا ہے ۔ خاموش، پتھر کے بت کی طرح خاموش، دو دو، تین تین گھنٹے ہر روز اسی طرح کھڑا رہتا۔ اگر کسی نے آگے بڑھ کر پمفلٹ مانگا تو اس نے زبان سے ایک لفظ

خاموش تبلیغ

کہے بغیر، ہاتھ والا پمفلٹ اسے دے دیا، اور ایک اور پمفلٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میں نے اُسے ہفتوں، مہینوں، برسوں اسی طرح دیکھا۔ اس قسم کے اور نوجوان بھی شہر کے مختلف مقامات پر اسی طرح کھڑے ملتے۔ یہ ایک عیسائی، تبلیغی ادارہ کے مشنری تھے۔ لوگ ان کی اس "بے معنی" حرکت کا مذاق اڑاتے، لیکن جب ان کی رپورٹ شائع ہوئی،

تو اس سے معلوم ہوتا کہ ان کی وہ خاموش تبلیغ کس قدر گہرا اور وسیع اثر کرتی جا رہی تھی۔ وہ دراصل اس طرح متجسس لوگوں کا رُخ اپنے مرکزی ادارہ کی طرف موڑ دیتے تھے۔

ہمارے سامنے بھی برادرانِ عزیز! اسی قسم کا پروگرام ہے۔ ہمارا مقصد قرآنی تعلیم کی تبلیغ ہے۔ یعنی اس فکر کو خود سمجھنا اور سمجھنے کے بعد دوسروں تک پہنچانا ـــــ لٹریچر کے ذریعے پہنچانا، اور معاملات میں اپنے حسنِ کردار کے ذریعے اس کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا۔ اس پروگرام کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ یہ ختم ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآنی پروگرام اور اُن خاموش مشنریوں کے پروگرام میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ خاموش کھڑے رہ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ یہ زندگی کا منفیانہ پہلو (NEGATIVE ASPECT) ہے، اور عیسائیت کی خصوصی تعلیم۔ قرآن مثبت پہلو (POSITIVE ASPECT) کو سامنے لاتا ہے اور اسی کو صحیح طریق قرار دیتا ہے۔ یہ وہ طریق ہے جو ملّتِ اسلامیہ کے مؤسس حضرت ابراہیمؑ کو خدا کی طرف سے اس وقت ملا جب آپ نے، قوم کی حالت سے شدید طور پر متاثر ہو کر، بدرگاہِ رب العزت عرض کیا کہ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ مجھے بتا کہ اس قسم کی بے حس اور مردہ قوم کس طریق سے زندہ ہوگی؟ وہ طریق کیا تھا؟ یہ کہ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ۔ یعنی وہی طریق جس سے وحشی پرندوں کو سدھایا جاتا ہے۔

ہمارا پروگرام

ان پرندوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ آپ کے سائے سے دور بھاگتے ہیں۔ ذرا سی آہٹ ہوئی اور وہ جھٹ سے اُڑ گئے۔ ان پرندوں کو سدھانے کے لئے خاموش کھڑے رہنے سے کام نہیں چل سکتا۔ انہیں حسنِ سیرت سے اپنے ساتھ اس قدر مانوس کرنا پڑتا ہے کہ آپ انہیں کھلی فضا میں چھوڑ کر جہاں جی چاہے چلے جائیں۔ ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ (۲/۲۶۰)۔ آپ کی آواز پر وہ دوڑتے ہوئے آپ کی طرف آ جائیں گے۔ یہ مثبت پروگرام ہے۔ لیکن اس میں ہنگامہ آرائی کا کوئی دخل نہیں۔ دخل تو ایک طرف اگر انہیں سدھانے کے دوران میں کہیں ذرا سی آہٹ ہو جائے۔ یا آپ سے کوئی خلافِ معمول اور غیر مانوس خفیف سی حرکت سرزد ہو جائے، تو وہ فوراً بدک جائیں گے۔ لہٰذا اس کے لئے نہایت صبر و سکون کے ساتھ، ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق چلتے جانا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ندی کی سی روانی اور چٹان کی سی استقامت کی ضرورت ہوگی۔ یہی ہمارا پروگرام ہے اور اسی پر ہمیں کاربند رہنا ہے۔ اس تبلیغ کے ذرائع میں عندالضرورت، اور حسبِ اقتضائے وقت تبدیلی آتی

رہے گی، لیکن کسی کی بے تابیِ تمنا کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو، ہمارے پروگرام میں ہنگامہ آرائی کا دخل کبھی نہیں ہوگا۔ جو احباب، اس پروگرام میں شریک ہونا چاہیں، انہیں اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہاں پر دانے کی طرح جلنا ہے۔ مرغِ سحر کی طرح شور نہیں مچانا۔

اس سلسلہ میں ایک اور ضروری بات کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں — اور ان کا تعلق بیشتر قدامت پرست مذہبی طبقہ سے ہوتا ہے — کہ تعصب ضد اور ہٹ دھرمی

ضدی لوگ

جن کا شعار ہوتا ہے، اور انہوں نے پہلے ہی سے فیصلہ کر رکھا ہوتا ہے کہ ہم نے کسی کی سننی ہی نہیں ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہہ دیا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ (۲/۶) جو لوگ پہلے ہی سے فیصلہ کئے بیٹھے ہوں کہ کچھ بھی ہو ہم نے کسی کی بات ماننی ہی نہیں۔ انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے، ان کے لئے یکساں ہے۔ وہ کبھی صداقت کی بات نہیں مانیں گے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے متعلق نبی اکرمؐ سے کہہ دیا گیا تھا کہ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِیۡلًا۔ (۷۳/۱۰) ان سے نہایت حسن کارانہ انداز سے کنارہ کشی اختیار کرلو۔ اس قسم کی جامد، متعصب، ضدی ذہنیتوں کے سامنے قرآنی فکر پیش کرنے میں اپنا وقت اور توانائی ضائع نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر ذرا دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو ایسے لوگوں کو پہچاننے میں چنداں دشواری نہیں ہوتی۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

مئے من از تنک جاماں نگہ دار
شراب پختہ از خاماں نگہ دار
شرر از نیستاں نے دور تر بہ
بہ خاصاں بخش و از عاماں نگہ دار

قرآنی فکر کو ان لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیئے جو زندگی کے عملی مسائل پر غور و فکر کرنے، اور علم و بصیرت کی رو سے۔ انسانیت کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے متمنی اور آرزومند ہوں قرآن کا خطاب ہی اُن لوگوں سے ہے جن میں زندگی کی کچھ رمق اور حرارت ہے۔ لِیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا (۳۶/۷۰) یہی وہ زمین ہے جس میں اس فکر کا تخم صالح شجرِ طیب بن کر پھولتا پھلتا ہے اور انہی کے

متعلق کہا جا سکتا ہے کہ

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

دوسری بات جس کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہے' اس سے بھی اہم ہے۔ مثل مشہور ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا۔ دانا دشمن کس طرح اچھا ہوتا ہے' اس کے متعلق تو میں کہہ نہیں سکتا۔ لیکن نادان دوست کس قدر نقصان پہنچاتا ہے' اس کا تجربہ مجھے آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے یہ

ہمارے نادان دوست

"نادان دوست" ہماری تحریک سے وابستہ ہیں۔ بعض ان میں سے بزموں کے ممبر بھی ہیں۔ طلوع اسلام کا مدت سے مطالعہ کرتے ہیں۔ لٹریچر کا مطالعہ کرنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ لیکن حالت ان کی یہ ہے کہ وہ طلوع اسلام کی تحریک' اس کی پیش کردہ قرآنی فکر اور خود میرے متعلق ایسے ایسے عقاید و نظریات لوگوں سے بیان کرتے ہیں' جنہیں سن کر میں محوِ حیرت رہ جاتا ہوں' اور دعا کرتا ہوں کہ

خدا مجھے میرے ان دوستوں سے بچائے

میرا اندازہ ہے کہ آپ کی تحریک کو اتنا نقصان آپ کے مخالفین کے سب دشنام سے نہیں پہنچا جتنا ان متفقین کی نوازشہائے بیجا سے پہنچتا ہے۔ یہ حضرات تحریک کے لئے بڑے ہی خطرناک واقع ہوئے ہیں اور ان کی اس حرکت کی روک تھام نہایت ضروری ہے۔ اسکا طریق یہ ہے کہ

(۱) جب آپ سے کوئی شخص' تحریک' اس کے نظریات یا میرے عقاید و مسالک کے متعلق کچھ پوچھے تو یہ دیکھئے کہ اس کا جواب ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کسی کتاب' رسالہ یا پمفلٹ میں ہے؟ اگر ہو تو دریافت کرنے والے سے کہئے کہ میں فلاں تحریر آپ تک پہنچا دوں گا۔ اس میں آپ کو اسکا جواب مل جائے گا۔

(۲) اگر آپ کی دانست میں' اس کا جواب شائع شدہ لٹریچر میں نہ ہو۔ تو اس سے کہہ دیجئے' کہ مجھے اس کے متعلق علم نہیں۔ ادارہ کا پتہ یہ ہے۔ آپ ان سے براہِ راست دریافت کر لیں۔

مختصراً یہ کہ آپ اپنی طرف سے اس قسم کے سوالوں کا جواب بالکل نہ دیجئے۔ سند تحریر کی ہے۔

اس کے سامنے تحریر پیش کیجئے۔ زبانی باتیں "روایات" کے تابع آجاتی ہیں۔ "روایات" میں نہ الجھئے۔

میں مختلف بزموں کے نمایندہ حضرات سے درخواست کروں گا کہ وہ براہِ کرم، اپنے اراکین پر اس سلسلہ میں کڑی نگاہ رکھیں اور اگر کوئی رکن اس کی خلاف ورزی کرے تو اس سے مواخذہ کریں۔ اگر کوئی رکن تنبیہہ کے باوجود اس سے باز نہ آئے، تو سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کے ساتھ شامل ہی آپ کی تحریک کو نقصان پہنچانے کے لئے ہوا ہے۔ تحریک کو اس سے بچاتے رہئیے۔

اس مقام پر میں یہ اعلان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ طلوعِ اسلام صرف ان باتوں کا ذمہ دار ہے جو اس نے اپنی تحریروں میں پیش کی ہیں۔ ان کے علاوہ وہ کسی بات کا ذمہ دار نہیں خواہ اُسے کوئی بھی اُس کی طرف منسوب کیوں نہ کرے۔

ہماری عملی زندگی

اب میں عزیزانِ من! اس خطاب کے سب سے اہم گوشے کی طرف آتا ہوں۔ آپ قرآنی تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے کا ولولہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ یہ بڑی مبارک بات ہے۔ لیکن قرآن کریم کا سمجھ لینا مقصود بالذات نہیں۔ اسے سمجھا اس لئے جاتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اگر قرآن کریم کا صحیح مفہوم ہماری سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا، تو یہ ذہنی تفریح سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر اس سے ہمارے قلب کی گہرائیوں میں کوئی ایسا انقلاب پیدا نہیں ہوتا جس کی جھلک ہماری روزمرہ کی زندگی میں نہ پائی جائے، تو ایسی قرآن فہمی محض مشاعروں کی داد ہے جس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

خرد نے کہہ بھی دیا لَآ اِلٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

دل و نگاہ کی اس مسلمانی کا مظاہرہ ہماری رفتار و گفتار و کردار سب میں ہونا چاہیئے۔ اگر ہماری سیرت پاکیزہ، نگاہ بلند، کردار پختہ اور معاملات صاف نہیں، تو ہم میں اور ان لوگوں میں کیا فرق ہے جن کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ وہ قرآن کی تعلیم کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے بجز اس کے کہ ہم اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دے لیں کہ ہم ان سے بہت آگے ہیں کیونکہ ہم قرآنی تعلیم کو ان سے بہتر سمجھتے ہیں۔ قرآن سمجھنے والوں کی زندگیاں ایسی ہونی چاہئیں جن سے وہ ہیٹے پھرتے دوسروں سے ممتاز و ممیز نظر آئیں اور جس

کسی کو ان سے کبھی واسطہ پڑے وہ ان کے حسنِ معاملہ سے متأثر ہو کر بے ساختہ پکار اٹھے کہ — دیدہ ام مردے درایں خطہ الرجال — اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے پیشِ نظر پورے کے پورے معاشرہ میں قرآنی انقلاب پیدا کرنا ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جب تک معاشرہ میں ایسا انقلاب نہ آجائے ہم اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہ کریں۔ غلط معاشرہ کی بعض مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں جن پر انفرادی طور پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے لیکن زندگی کے جن دائروں میں ہم مجبور نہیں، وہاں کونسی چیز مانع ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے اندر حسنِ سیرت پیدا نہ کریں؟ اپنی ہر کمزوری کے لئے معاشرہ کی مجبوری کو سپر بنا لینا، بہت بڑی خود فریبی ہے۔ قرآن کا نام لینے والوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے آپ کو اس قسم کی خود فریبی میں مبتلا رکھیں۔ صداقت، اخوت، محبت، شفقت، حسنِ معاملہ، ایفائے عہد، کشادہ نگہی، وسعتِ ظرف، تحمل، بردباری، پاکیزگیٔ خیالات، عفتِ قلب و نظر، یہ ہمارے امتیازی نشانات ہونے چاہئیں۔ میں نے ان چند خصوصیات کا ذکر محض مثال کے طور پر کیا ہے۔ مجملاً یوں سمجھئے کہ ہماری ساری زندگی سیرتِ محمدیہ کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہونی چاہیئے، کہ قرآن فہمی کا فطری نتیجہ یہی ہے۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارا رہن سہن نہایت پُروقار اور سنجیدہ ہو اور ہم سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جو پایۂ ثقاہت سے گری ہوئی ہو۔ آپ چلتے پھرتے شریف انسان دکھائی دیں، جو خود بھی امن وسلامتی میں رہیں اور دوسروں کے لئے بھی امن وسلامتی کے پیامبر اور آرزومند ہوں۔ آپ کے ہاتھ سے کسی پر ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ اس کے برعکس عدل اور احسان آپ کا شیوۂ زندگی ہو۔

یہ بھی ضروری ہے کہ آپ سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہونے پائے جس سے اس خطۂ زمین کے استحکام

پاکستان کا استحکام

میں ضعف آنے پائے۔ اس لئے کہ ہماری درخشندہ امیدیں اور تابناک آرزوئیں اسی خطۂ زمین سے وابستہ ہیں۔ ہم جس جنتی معاشرہ کا قرآنی تصور عام کر رہے ہیں، اس کی عملی تشکیل اسی خطہ میں ہو سکے گی۔ عام لوگوں کے لئے یہ خطۂ زمین محض ایک مملکت ہے لیکن ہمارے لئے قرآنی زندگی بسر کرنے کا لاینفک ذریعہ اور نوعِ انسان کو موجودہ جہنم سے نکالنے کا دروازہ۔ اس سے ہمارے نزدیک اس کی سالمیت کی اہمیت واضح ہے۔ ہمارے ایک طرف ہندو جیسے تنگ نظر دشمن کے مذموم عزائم ہیں جو اپنی کئی جُگوں کی غلامی اور محکومی کا انتقام ہم سے لینا

چاہتا ہے۔ دوسری طرف روسی کمیونزم کا بلاتے بے درماں ہے کہ

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

پھر خود ملک کے اندر ایسے عناصر موجود ہیں جو تحریک پاکستان کے سخت دشمن تھے اور جواب مقدس نقابوں کی اوٹ میں ملک میں تخریب و انتشار پیدا کر کے اپنی شکست پندار کا بدلہ لینا چاہتے ہیں بطلوع اسلام

اشتعال انگیزی

کے خلاف ہنگامہ آرائی میں دیکھیے کتنا بڑا عنصر ان گروہوں کا ہے جن سے یہ تحریک پاکستان کے زمانے میں نبرد آزما تھا کیونکہ وہ اس تصور کی مخالفت کرتے اور اسے دین کے خلاف بتاتے تھے۔ ان کے سینے میں وہی پرانے زخم ہیں جو اب تک مندمل نہ ہو سکے۔ یہ لوگ آپ کو ہر طرح سے اشتعال دلائیں گے لیکن آپ نے ضبط کے دامن کو ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑنا — یہ امر موجب ہزار مسرت و اطمینان ہے کہ گزشتہ دنوں آپ کی تحریک کے خلاف جو ہنگامہ آرائی کی گئی[1] اور آپ احباب کو بری طرح اشتعال دلایا گیا اس میں کسی ایک جگہ بھی صبر و سکون کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا۔ میں آپ احباب کو اس پر دلی مبارکباد کا مستحق سمجھتا ہوں۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہماری دعوت، فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے خلاف مسلسل جہاد ہے کیونکہ امت میں تفرقہ — خواہ وہ مذہب کے نام سے ہو یا سیاست کے — دین کی یکسر نقیض ہے۔ دین وحدتِ انسانیت کا علمبردار ہے جس کی منزلِ اول وحدتِ امت ہے۔ اس لئے آپ سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہیں ہونی چاہیئے جس میں فرقہ بندی اور گروہ سازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ چونکہ عملی سیاست میں

فرقہ بندی اور پارٹی بازی

حصہ لینا ہمارے پروگرام میں نہیں اس لئے ہمیں سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ ہمارے سامنے تو بس ایک ہی پروگرام ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم کی تعلیم کو صحیح طور پر خود بھی سمجھیں اور اسے دوسروں تک بھی پہنچائیں اور اس کے مطابق اپنے اندر اور دیگر افرادِ امت کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتے جائیں جس سے ہمارا معاشرہ قرآنی خطوط پر متشکل ہو سکے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ

---

[1] فتوائے کفر کے سلسلہ میں۔

نہ از ساقی، نہ از پیمانہ گفتم
حدیثِ عشق بے باکانہ گفتم

جو کچھ میں پیش کرتا ہوں اس میں اگر سہواً کوئی ایسی بات آجاتی ہے جو قرآن کریم کے منشاء کے مطابق نہیں تو زمانہ اسے خود بخود مٹا دے گا۔ جو کچھ قرآن کے مطابق ہے وہ ہزار مخالفتوں کے باوجود زندہ رہے گا

محو و ثبات کا قانون

اور آگے بڑھے گا۔ اس لئے کہ کائنات میں محو و ثبات، خدا کے قانون کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ○ (۱۳/۳۹)۔ اس لئے اگر ہماری کوئی بات قرآن کے مطابق ہے اور ہمارا زمانہ اسے قبول نہیں کرتا تو آنے والا زمانہ اسے قبول کرے گا۔ اگر میری بات حق پر مبنی ہے تو مجھے یقین ہے کہ

روشِ دہر کا ہر نقش پکارے گا مجھے
یہ نہ سمجھو کہ مجھی تک مرا افسانہ ہے

میں نے برادرانِ عزیز! چھبیس، تیس برس اُدھر اپنے سامنے جو قرآنی پروگرام رکھا تھا، میری انتہائی بے بضاعتی کے باوجود، اس کی ایک ایک کڑی یوں پوری ہوتی گئی کہ جب میں اپنی قطع کردہ منزل پر نگہ بازگشت ڈالتا ہوں تو خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ یہ کیسے طے ہوگئی۔ اس کے لئے، جہاں بدرگاہِ

سپاس گزاری

صمدیت مآب قدم قدم پر سجدۂ تشکر و امتنان ادا کرتا ہوں وہاں آپ مخلص احباب کی بے لوث رفاقت اور بے پناہ محبت کے لئے اپنے دل کی گہرائیوں سے سپاس گزار ہوں، کہ آپ کی رفاقت کے بغیر یہ طول طویل اور دشوار گزار منزل کبھی طے نہ ہو سکتی۔ میں نے اب تک جو کچھ پیش کیا، وہ ملک کے اردو دان طبقہ تک محدود تھا۔ اب میں اس سلسلہ کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں اور نہ صرف اپنے ملک کے انگریزی خواں طبقہ تک ہی اس آواز کو پہنچانا چاہتا ہوں بلکہ یورپ

انگریزی لٹریچر

اور امریکہ کے ان مفکرین اور مدبرین کو بھی اس کے دائرے کے اندر لانا چاہتا ہوں جو قرآنی نظام و تصورات کو سمجھنے کے لئے ہمہ تن شوق نظر آتے ہیں۔ اور جن کے تقاضے اب اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ انہیں زیادہ عرصہ تک ٹالا نہیں جا سکتا۔ آپ احباب یہ سنکر خوش ہونگے کہ اس سلسلہ میں بھی کام شروع ہو چکا ہے[1]۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک حمداً کثیراً۔

---

[1] انگریزی کے مقالوں کے علاوہ، پہلی مستقل تصنیف ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

درسگاہ کا قیام اس کے بعد میرے پروگرام کی اہم (اور شاید آخری) کڑی ایک ایسی درسگاہ کا قیام ہے جس میں قوم کی نئی نسل کا قلب و دماغ صحیح قرآنی قالب میں ڈھل سکے اور ان کی صلاحیتیں پورے طور پر نشوونما پاکر انسانیت کی فوز و فلاح کے کاموں میں صرف ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ پروگرام بڑا ہمت طلب اور وسیع ذرائع کا متقاضی ہے۔ لیکن

بے دست و پائیم کہ ہنوز از وفورِ عشق
سوداست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

میری ساری عمر اور اس کے عزائم اس ایک یقینِ محکم کے سہارے زندہ و پائندہ رہے ہیں کہ

مسلم ہستی! سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لا یخلف المیعاد دار

میرے سامنے جب بھی کوئی نیا پروگرام آیا، میرا انداز یہی رہا ہے کہ اس کے لئے جس قدر اسباب و ذرائع میسر آتے انہیں لیکر میں اس ربِ کریم کے آستانِ عالیہ پر جھولی پھیلا کر حاضر ہو گیا، اس درخواست کے ساتھ جو حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کے سامنے پیش کی تھی کہ

جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا (۱۲/۸۸)

ہم یہ حقیر سی پونجی لے کر حاضر ہو گئے ہیں۔ ہمارے پاس یہی کچھ ہے۔ ہم اسکے معاوضہ میں کچھ نہیں مانگتے۔ آپ اسے قبول کر لیجئے اور ہمیں ہماری ضرورت کے مطابق غلہ دیدیجئے۔

اور میں نے دیکھا ہے کہ اس بارگاہِ عاجز نواز نے مجھے کبھی مایوس نہیں لوٹایا۔ لیکن اس سے بھی بڑی حوصلہ بخش تعلیم وہ ہے جو نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے) ہمیں دی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ تمہارا کام اپنے فریضہ کی ادائیگی ہے یہ دیکھنا تمہارا کام نہیں کہ اس کے نتائج کب مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق ہو گا۔

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ٥ (۱۳/۴۰)

اس لئے ہمیں اس کی فکر کیوں ہو کہ ہمارے پیشِ نظر پروگرام کی تکمیل کب ہو گی۔ ہم سے تو کہا یہ گیا ہے کہ

در طلب کوش و مدہ دامنِ امید ز دست
دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

ہمیں نتائج سے بے پرواہ، اپنی دھن میں آگے بڑھتے چلے جانا چاہیئے۔ اگر ہمارا پروگرام قانونِ خداوندی کے مطابق ہے، ہمارے ارادے نیک اور ہمت میں استقامت ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ زود یا بدیر، اسکے خوشگوار نتائج مرتب نہ ہوں۔ لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (۱۲/۵۶) اس خدا کا ارشاد ہے جس کا ہر وعدہ سچا ہوتا ہے۔ باقی رہیں قرآنی تصورِ حیات و نظام کی مخالفتیں، تو اس سے آپ قطعاً متأثر نہ ہوں۔ میری نگاہیں اُفقِ عالم پر ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اپنے غلط نظامہائے زندگی کا ستایا ہوا انسان، کس طرح ایک صحیح نظامِ زندگی کے لئے مضطرب و بیقرار ہے۔ خدا کا نظام زمان اور مقام میں محدود نہیں۔ اس کا خطاب سارے عالمِ انسانیت سے ہے۔ اس لئے کسی ایک مقام میں اس کی مخالفت، اسکے راستوں کو مسدود نہیں کر سکتی۔ زمانے کے تقاضوں کو کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ آپ قرآنی آواز کی مخالفت کرنے والوں سے کہہ دیجئے کہ

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰۤی اَمۡرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (۱۲/۲۱)

———(۷)———

میں نے برادرانِ عزیز! سردست جو کچھ آپ سے کہنا تھا، کہہ چکا۔ میں ایک بار پھر آپ احباب کی خدمت میں اس حسین و سادہ اجتماع میں شرکت کے لئے ہدیہ سپاس گزاری پیش کرتا ہوا دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کے ارادوں میں برکت، دلوں میں اخلاص، بازوؤں میں ہمت اور پاؤں میں استقامت عطا فرمائے اور زندگی کے جس درخشندہ و تابناک مقصدِ جمیل و جلیل کو لے کر آپ اُٹھے ہیں، خدا کی کائناتی قوتوں کی تائید آپ کے شاملِ حال ہو اور آپ تمام موانع پر قابو پاتے ہوئے اس راہ میں آگے بڑھتے چلے جائیں۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

آپ یہاں آئے ہیں تو اس ولولہ کو لے کر کہ

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دیں
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دیں

اور جب یہاں سے جائیں تو اس عزمِ بلند کو ساتھ لے کر کہ

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سُرخیٔ خوں سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ
رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○ (۳/۸)
رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (۲/۲۵۰)
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ (۲/۱۲۷)

والسّلام علیکم

پرویز

دُوسرا اجلاس

کنونشن کا دوسرا اجلاس (جو ایک کھلا اجلاس تھا) چار بجے بعد دوپہر شروع ہوا۔ اس اجلاس میں مفکرِ قرآن کا اہم خطاب — مثالی مملکت — ایوان کے سامنے آرہا تھا۔ اخبارات اور پوسٹروں کے ذریعے اس کی اہمیت منظرِ اشاعت پر آچکی تھی۔ چنانچہ تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد جب پرویز صاحب مائیک کی طرف بڑھے تو ایوانِ کنونشن حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

پرویز صاحب کا خطاب خطاب کا آغاز کرتے ہوئے پرویز صاحب نے سب سے پہلے مفکرینِ مغرب کی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ انسان کی سب سے بڑی ناکامی یہ ہے کہ وہ آج تک اپنے لئے ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جو انسانی ضرورتوں کی کما حقہٗ بجا آوری میں کامیاب ثابت ہوا ہو۔ اس ناکامی کی وجہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے وضاحت کی کہ آج تک جو نظامِ حکومت بھی وضع کیا گیا اس میں اختیار و اقتدار کا سرچشمہ خود انسان تھے۔ حکومت کی شکلیں بدلتی رہیں لیکن یہی روح تھی جو ہر پیکر میں کارفرما رہی۔ پرویز صاحب نے مذہبی پیشوائیت کی خون آشام ڈکٹیٹرشپ سے لے کر کمیونزم کے استبدادی ہتھکنڈوں تک ہر نظام کا تجزیہ کیا اور تفصیلاً بتایا کہ صدیوں کے ان تجربات کے نتائج ہمیشہ جانکاہ مشقتوں اور جگر پاش مصیبتوں کی صورت میں سامنے آتے۔ انسانیت ان تجربوں میں خون کے دریا؛ آگ کی خندقیں پڑی اور صدیوں سے تڑپتی، پھڑکتی، کٹتی، جلتی اور ذبح ہوتی چلی آئی۔ ان نظامہائے زندگی کے زریں نقاب الٹنے اور انہیں تار تار کرنے کے بعد پرویز صاحب اس دینِ خداوندی کی طرف آئے

جو خدا اور صرف خدا کو اقتدار و اختیار کا سرچشمہ (بلاشرکت غیرے) قرار دیتا ہے (اور تو اور) اپنے کسی نبی تک کو بھی یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ انسانوں پر اپنی حکومت چلائے۔

پرویز صاحب نے مخصوص حسین انداز سے "خدا کی حکومت" کا مفہوم واضح کیا اور بہ دلائل و براہین اور علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقتِ عظمیٰ کی نقاب کشائی کی کہ خدا کی حکومت سے مراد ان اصولی قوانین اور مستقل اقدار کی کارفرمائی ہے جو قیامت تک قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے۔ یہ نظام پوری امت کی باہمی مشاورت سے مذکورہ اصولی قوانین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں اپنی جزئیات مرتب کریگا اور اس طرح ہر دور کی ضرورتوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا جائیگا۔ یہ سب کچھ پیش کرتے ہوئے پرویز صاحب نے قرآن کے تصورِ مملکت کی تفاصیل پیش کیں۔[1]

تیسرا اجلاس

طلوعِ اسلام کنونشن کا تیسرا اجلاس ۱۳ اپریل کی شب کو ۸½ بجے شروع ہوا۔ یہ نشست پرویز صاحب کے درسِ قرآن کے لئے مخصوص تھی: اولیاء اللہ کون ہیں؟" — یہ تھا اس سلسلے میں ان کا موضوع خطاب، اور اس کے لئے

ملائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

چنانچہ موضوع کی علمی اہمیت کے پیشِ نظر اہلِ علم طبقہ کنونشن ہاؤس میں کھچا چلا آیا۔ رات کا وقت، رسل و رسائل کی نایابی، دور دراز فاصلہ، کوئی رکاوٹ بھی تو اہلِ شوق کی راہ میں حائل نہ ہوئی۔

پرویز صاحب کا درسِ قرآن

تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد کیف و مستی کے وجد آفریں ماحول میں پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا آغاز ہوا۔ انہوں نے سب سے پہلے اس سوال کی اہمیت واضح کی کہ — "اولیاء اللہ کون ہیں؟" اور پھر بتایا کہ ہمارے ہاں یہ تصور چلا آرہا ہے کہ یہ ایک الگ گروہ ہے۔ ان کی خصوصیات بھی جماعتِ مومنین سے الگ قسم کی ہوتی ہے — زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی۔ اس تصور کی حقیقت کیا ہے؟ اس سلسلے میں اگر تحقیق سے کام لیجئے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ تصور

---

[1] یہ خطاب "بہارِ نو" میں شائع ہو چکا ہے۔

اسلامی ہے نہیں بلکہ باہر سے آیا ہے۔ اس کے اجزاء میں کوئی عنصر یہودیوں کا، کوئی مجوسیوں کا، کوئی یونانیوں کا اور (بالخصوص) کوئی ہندی ویدانت کا نظر آئے گا۔ پرویز صاحب نے پھر یہ ساری تفصیل اس ایک شعر میں سمٹا دی کہ

آنکھ نرگس کی، دہن غنچے کا، حیرت میری
ان کی تصویر ہیں، پوچھے کوئی ان کا کیا ہے

اس کے بعد پرویز صاحب نے "اَوْلِیٰ" کا قرآنی مفہوم پیش کیا اور پھر واضح کیا کہ قرآن کی رُو سے خدا اور بندے کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے۔ خدا نے پہلے کائنات کی تخلیق کی اور پھر اختیار و ارادہ کی صفات عالیہ سے سرفراز کرکے انسان کو پیدا کیا اور یہ انسان کی ندرت کاریاں ہیں جن کے باعث وہ حسن کائنات کی تکمیل میں خدا کا رفیق بن جاتا ہے۔ لاریب کہ اس رابطہ میں انسان کی حیثیت رفیق ادنیٰ کی ہوتی ہے اور خدا کی حیثیت رفیقِ اعلیٰ کی۔ پرویز صاحب نے قرآن کی مختلف آیات پیش کیں اور ان کی روشنی میں بتایا کہ وَلِی کا لفظ خدا نے اپنے لئے بھی استعمال کیا ہے اور مومنین کے لئے بھی۔ خدا۔ ولی۔ بمعنی حاکم اور سرپرست کے ہوتا ہے اور انسان ولی ہوتا ہے رفیق ادنیٰ کے معنوں میں۔ جب خدا اپنے حق حکومت میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتا اور اسے گوارا نہیں کرتا کہ اس کے سوا کسی دوسرے کو بھی وَلی تسلیم کیا جائے تو اس کا مطلب کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے پرویز صاحب نے واضح کیا کہ کوئی انسان جب دوسروں کو ولی تسلیم کرتا ہے۔ تو (بالفاظ دگر) وہ اسے خدا کے حق حکومت میں شریک کرلیتا ہے۔ خدا کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت جائز نہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کی اطاعت میں خدا کی اطاعت سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کا خوف ہر وقت ذہن پر مستولی رہتا ہے۔ وہ اسے ہر لحہ حاضر و ناظر اور عالم الغیب سمجھتا ہے۔ اس کے سامنے لرزنے لگ جاتا ہے اور معافیاں مانگتا ہے — یہ حیثیت وہ خدا کو بھی نہیں دیتا۔

پرویز صاحب نے "خدا کی اطاعت" کا مفہوم واضح کرتے ہوئے بتایا کہ یہ اطاعت اب صرف کتاب اللہ کی رُو سے ہوگی لیکن اس دنیا میں 'خدا کی کتاب' کے خلاف بھی ان حضرات کی اطاعت ضروری ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

یہی نہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر فخریہ طور پر کہا جاتا ہے کہ

ما ز قرآں مغز را برداشتیم
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

پرویز صاحب نے اس حقیقت کی وضاحت کی کہ قرآن خدا سے انسان کا براہِ راست اور بلا واسطہ تعلق پیدا کرنے آیا ہے۔ یہ تعلق خدا کی اسی آخری کتاب کی وساطت سے پیدا ہوتا ہے اور اگر خدا اور انسانوں کے درمیان کوئی اور واسطہ رکھنا مقصود ہوتا تو ختمِ نبوت کے اعلان کی کیا ضرورت تھی۔ یہ سب کچھ ٹھوس اور زندہ جاوید حقائق کی بنا پر ہوتا ہے۔ لیکن تصوف میں حقائق کا گذر ہی نہیں بلکہ لطائف سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کی تمثیلات نری شاعری ہوتی ہیں جن کے پس پردہ کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

یہ تفصیل پیش کرتے ہوئے مفکرِ قرآن نے قرآنی آیات کی روشنی میں بتایا کہ ہر مومن خدا کا ولی ہوتا ہے اور اس میں کسی گروہ کی تخصیص نہیں۔ اولیاء اللہ کے بارے میں مروجہ عقاید اور تصورات ایک قوم کے زوال اور شکست کے دور کی نشانیاں ہیں۔ یہ اس دور کی باتیں ہیں جب قوم پر یاس و حرماں چھا جاتی ہیں۔ جب قوائے عمل مضمحل ہو جاتے ہیں۔ جب نہ نظام باقی رہتا ہے جس کا سہارا پکڑا جا سکے اور نہ قوتِ عمل رہتی ہے جس سے زندگی کی راہوں کو ہموار کیا جائے۔ زندہ قومیں خود اپنی قوتِ عمل سے خدا کی تقدیر بنتی ہیں اور نت نئے معجزے دکھاتی ہیں۔

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

غرضیکہ انہوں نے اس خطاب میں "طریقت اور معرفت" کے متعلق مروجہ غلط تصورات کو قرآن کریم کی روشنی میں نہایت وضاحت سے پیش کیا۔[1]

~~~~~~~~~~(٥)~~~~~~~~~~

چھٹا اجلاس ——— (مجلسِ استفسارات)

(کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر)

---

[1] یہ خطاب "بہار نو" میں شائع ہو چکا ہے۔
~~~~~~~~~~

چودہ اپریل کی شب کو اس یادگار مجلس کا انعقاد ہوا جو ہر سال ضابطہ کی پابندیوں سے آزاد ہو کر ایوان میں ایک نئی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ کنونیشن کا ایوان، نمستانِ حجاز کا عکسِ جمیل قرار پا جاتا ہے اور بادہ نوشان حرم کی قطاریں ذوقِ تمنا کی ہزاروں بے تابیاں لئے پیرِ مغاں کے گرد پھیل جاتی ہیں اور جب گردشِ جام و سبو کا مرحلہ آتا ہے تو ایوان کی وسعتوں میں ایک کیف سا برسنے لگ جاتا ہے۔ شہری ہنگاموں سے دور، گلبرگ کے اس دور دراز ویرانے میں نور و نکہت کا ایک سماں طاری تھا۔ جب ستاروں کی چشمکوں اور برقی قمقموں کی ضوفشانیوں میں پیرِ مغاں سوالات کا پلندہ ہاتھ میں لئے اپنی مسند پر رونق افروز ہوئے اور بادہ مستوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

سوال و جواب کی یہ نشست ہمارا ایک منفرد سا اجلاس ہے۔ میں ایک مدت سے قرآن کا طالب علم چلا آ رہا ہوں اور کبھی اپنی کسی بات کو حرفِ آخر نہیں سمجھا۔ اب بھی میں اپنی علمی بصیرت کے مطابق آپ کے سوالات کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ اگر اس سے آپ کا اطمینان ہو گیا تو مجھے خوشی ہو گی۔ اور اگر اطمینان نہ ہو اور کوئی خلش باقی رہے تو اسے بعد ازاں باہمی گفتگو سے سمجھا جا سکتا ہے اور خط و کتابت سے بھی۔

اس کے بعد مفکرِ قرآن نے ایک ایک سوال کو لیا اور باری باری پوری وضاحت سے اس کا جواب پیش کرنا شروع کر دیا۔ بڑے اہم سوالات سامنے آنے لگے اور پھر ان کے نکھرے نکھرے جوابات! قرآن کے عظیم طالب علم کے علم و بصیرت کی رفعتوں کو جانچنے کا اس سے بہتر شاید کوئی دوسرا مرحلہ نہ ہو۔

کیا قرآنی آیات جنتر منتر کا کام دے سکتی ہیں؟ جنت اور جہنم کی حقیقت کیا ہے؟ حیات بعد الممات کا قرآنی تصور کیا ہے؟ اپنی ارتقائی صفات کی بنا پر فکرِ انسانی غیر محدود شے ہے یا محدود؟ انسانی ذات کی نشو و نما کا اصولی طریق، بروئے قرآن کیا ہے؟ نشو و نما یافتہ ذات کی پہچان کیا ہے اور اس کے مدارج کیا ہیں؟ دینِ خداوندی کے معاملہ میں امت کا فریضہ کیا ہے؟ قطبین سے قریبی ممالک میں ماہِ رمضان کی سحری و افطاری اور پنج وقتہ نماز کے اوقات کا تعین کیسے ہو گا؟ ارکانِ اسلام کے بارے میں آپ کے عقاید کیا ہیں؟ قُلِ الْعَفْوَ کے قرآنی حکم میں انفرادی ضرورت کی حد کیا ہے؟ انسانی اختیار و ارادہ کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن کی رُو سے تاریخ کی حیثیت کیا ہے اور اس کے واقعات کے صحیح یا غلط قرار پانے کی سند اور معیار کیا؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات سامنے آئے اور مفکرِ قرآن نے

ان سب کے اس قدر واضح، متعین اور دو ٹوک جواب دیتے کہ ہر سائل عش عش کر اٹھا اور گیارہ بجے شب کے قریب جب یہ مجلس ختم ہوئی تو ہر شخص مفکر قرآن کی بصیرت قرآنی کا درخشندہ نقش دل میں لئے رخصت ہو رہا تھا۔ اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے ایک دیوانہ دفورِ شوق سے برملا کہہ رہا تھا۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، روح پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

—— (:) ——

ساتواں (اور آخری) اجلاس

۵ار اپریل (اتوار) کی صبح کو کنونشن کا آخری اجلاس تھا۔ پرویز صاحب اس اجلاس میں

اسلام کیا ہے؟

کے اہم موضوع پر خطاب کر رہے تھے۔ یہ اجلاس ایک کھلا اجلاس تھا اور اس میں داخلہ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک گھنٹہ قبل ہی حاضرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ متوقع حاضری کے پیشِ نظر اس اجلاس میں نشستوں کے وسیع تر انتظامات کئے گئے تھے لیکن جلد ہی اراکین استقبالیہ کے چہرے بتا رہے تھے کہ اہل شوق کی اس طوفانی آمد سے عہدہ برآ ہونا شاید ان کے بس کی بات نہ رہے۔ چنانچہ ایک مرحلہ پر نمایندگانِ کنونشن کو اپنی نشستیں خالی کرنی پڑیں اور ایوان کو اپنی تنگ دامانی کا اعتراف کرنا پڑا۔ طلوعِ اسلام کی تمام کنونشنز میں اس قدر حاضری کی مثال موجود نہیں۔

ٹھیک نو بجے اجلاس شروع ہوا۔ صدارتی تقریر کے بعد پرویز صاحب مسندِ خطاب پر رونق افروز

پرویز صاحب کا خطاب

ہوئے اور

اسلام کیا ہے؟

کے موضوع پر ان کا تاریخی خطاب شروع ہوا۔ مفکرِ قرآن نے سب سے پہلے اس جہانگیر نظام کی چند جھلکیاں پیش کیں جو کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں کارفرما ہے اور پھر بتایا کہ کیا انسان جو اس خطۂ ارض پر سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی اور نظمِ کائنات کا حسین مقطع ہے، اس عالمگیر آئین سے مستثنیٰ قرار پا سکتا ہے؟ یہی اسلام اور دین اللہ ہے جو کائنات میں از خود کارفرما ہے لیکن انسان صاحبِ اختیار و ارادہ

ہونے کے باعث اس کی اطاعت پر مجبور نہیں بلکہ دل کی رضامندی سے بطیبِ خاطر اسے اختیار کرتا ہے پھر انہوں نے سلسلۂ نبوت کی وضاحت کی اور بتایا کہ یہ قوانین کس طرح منتخب ہستیوں کی وساطت سے جنہیں نبی اور رسول کہا جاتا ہے انسانوں تک پہنچائے گئے اور واضح کر دیا گیا کہ ان کا اتباع تزیینِ ذات اور زندگی کی خوشگواریوں کا موجب ہوگا۔ اور ان کی خلاف ورزی تباہی و بربادی کا سامان ثابت ہوگی۔

اپنے خطاب میں پرویز صاحب نے مومن اور کافر کے فرق کو واضح کیا اور بتایا کہ مومن کی یہ زندگی بھی خوشگواریوں کی جنت ہوگی اور مستقبل بھی ہر قسم کی شادابیوں سے مالا مال۔ انہوں نے دنیا و آخرت کا مفہوم بھی قرآن کی روشنی میں واضح فرمایا اور بتایا کہ نبی اکرمؐ نے کس طرح اپنے بے مثال عمل سے اسلام کو ایک نظامِ معاشرہ کی صورت میں متشکل فرمایا اور اس کے درخشندہ نتائج اس کی صداقت کا زندہ جاوید ثبوت بنتے چلے گئے۔ یہ سب کچھ بیان کرتے ہوئے پرویز صاحب نے انسانوں کے اس خود ساختہ مذہب کا ذکر کیا جو ملوکیت، سرمایہ داری، خانقاہیت اور پیشوائیت کا مرکب اور آج مسلمانوں کے ہاں رائج ہے۔

اپنا اہم خطاب ختم کرتے ہوئے مفکرِ قرآن نے فرمایا۔

> ایک وہ اسلام تھا جسے محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے پیش کیا تھا اور جس سے اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصے میں آگئی تھی۔ اور ایک اسلام ہمارا آج کا ہے جب سے ہمارا شمار دنیا کی پست ترین قوموں میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ اسلام جس نے اس وقت ہمیں وہ سرفرازیاں عطا کی تھیں، آج بھی ہمارے پاس خدا کی زندہ و پائندہ کتاب میں محفوظ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسے ایک نظام کی شکل میں متشکل کرنے کی سعادت کس کے حصے میں آتی ہے؟

ان الفاظ کے ساتھ پرویز صاحب کا اہم خطاب ختم ہوگیا[1]۔ پورا ایوان کیف و مستی کی بے خودی میں کھویا ہوا نظر آتا تھا۔ اسلام کی حقیقت اور عالم آرائی کے گہرے نقوش دل کی گہرائیوں میں مرتسم تھے اور زبان حال

---

[1] یہ خطاب اب پرویز صاحب کی کتاب "اسلام کیا ہے" کا حصہ بن گیا ہے۔

بے ساختہ پکار رہی تھی کہ اسلام کیا تھا اور کیا ہوگیا۔ پاکستان کی ایک ممتاز شخصیت جسے تحریکِ پاکستان میں نمایاں مقام حاصل رہا، وجد و مسرت سے جھومتی ہوئی آگے بڑھی اور وفورِ کیف میں یہ کہتے ہوئے مفکرِ قرآن سے بغلگیر ہوگئی۔

زندہ باد! زندہ باد! آپ نے دلوں کو نئی روشنی عطا کر دی!
ہم بھٹکتے رہے اک عرصہ بیابانوں میں
للہ الحمد کہ پہنچے ہیں گلستانوں میں

الوداعی خطاب

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

کھلا اجلاس ختم ہوگیا لیکن ہمصفیرانِ چمن کی الوداعی رسم کی ادائیگی ابھی باقی تھی۔ ٹھیک بارہ بجے اس تقریب کا آغاز ہوا جو یارانِ ہم سفر کی دلی حسرتوں کی آئینہ دار تھی۔ سب اپنی اپنی نشستوں پر خاموش بیٹھے تھے اور پُرملال نگاہیں سٹیج پر جمی ہوئی تھیں۔ اسی اسٹیج سے گذشتہ تین دنوں میں بار بار میر کارواں کی زندگی بخش آواز گونجتی اور نئی منزل کا سراغ دیتی رہی لیکن اب کے بار جو وہ مائیک کے سامنے نمودار ہوئے تو ان کی افسردہ نگاہوں میں ایک افسانۂ غم جھلک رہا تھا۔ ضبط کے بند ٹوٹتے نظر آرہے تھے۔ انہوں نے ایک آہ بھری اور بمشکل اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے ایک نازک فریضہ کی ادائیگی کے لئے لبوں کو جنبش دی۔ ان کی آواز میں لرزشیں ابھر رہی تھیں اور فضا تھرتھرا رہی تھی۔ جب انہوں نے آہستہ آہستہ یہ کہنا شروع کیا ـــ

> عزیزانِ من! ۲۰ مارات کی شام کو جب میں یہاں آیا تو حسین تمناؤں کی ایک بساط سی بچھائی جارہی تھی۔ ایک سال بعد دل کی مرجھاتی ہوئی کلیاں کھلکھلا اٹھیں اور نگاہوں میں سرور آگیا۔ لیکن آج جب پہلے ہی کمرے میں قدم رکھا تو یہ بساط اٹھائی جا رہی تھی ـــ دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر آیا۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

"سوچتا ہوں کہ سال بھر کے طویل لمحے آپ کے انتظار میں کیونکر بسر ہوں گے۔

کسے خبر کہ نگارِ سحر کی حسرت میں
تمام رات چراغِ وفا پہ کیا گزری

"ہر سال یہ ہوتا چلا آرہا ہے اور سال بسال یہ منظر کس قدر ناقابلِ برداشت ہوتا جارہا ہے۔ اس کی ترجمانی ممکن نہیں۔ آپ آتے تو کاشانۂ ہستی میں تازہ رونق آگئی۔ اب آپ جارہے ہیں تو جو کچھ یہاں سے لے کیا ہے، اُسے یارانِ ہمسفر تک پہنچا دیجئے۔ یہی تحفہ ہے جو آپ ان کے لئے کنونشن سے لیجاسکینگے۔

"میں اس مٹھی بھر جماعت کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ کی بے سروسامانی میرے سامنے ہے۔ ایسے احباب بھی ہیں جو سال بھر اس سالانہ تقریب کا انتظار کرتے رہے لیکن پھر بھی نہ آسکے کیونکہ ان کے پاس آنے کے لئے کرایہ نہیں تھا۔ ایسی بے سروسامان جماعت! اور عزم یہ لے کر اٹھی ہے کہ خدا کی کتاب اقوامِ عالم کا ضابطۂ حیات قرار پاجائے گی

ذرّۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر!

"ایک بات ہمیشہ یاد رکھیئے اور بھولئے نہیں کہ اگر مخالفتوں کے اس ہجوم میں جو آپ کے گرد چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، آپ کی کوششوں میں کمی واقع ہوگئی تو یہ کرنیں جو فضا میں پھیل رہی ہیں ان پر جہالت اور توہم پرستیوں کے پردے پڑجائیں گے۔ سوچئے کہ کتنی اہم ذمہ داری آپ کے سروں پر آپڑی ہے۔

ہم اگر ہوش میں عدم آئیں
چشمِ ساقی کی بات جاتی ہے

"چشمِ ساقی کی بات" رکھنے کے لئے جو کچھ لٹتا ہے لٹ جانے دیجئے۔ قرآن نے آپ سے بڑی امیدیں وابستہ کی ہیں اس کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ ساز و براق کی کمی پر پریشان نہ ہوجیئے۔ آگے بڑھتے جائیے اور یقین رکھیئے کہ خدا کی امداد اس کی کائناتی قوتوں کے دوش پر سوار ہوکر آئے گی۔ میں آپ سے اور کیا کہوں!

ایک آنسو میں کہہ دیا غمِ دل
کس قدر میں نے اختصار کیا

آپ کی یاد آیندہ کنونشن تک میرے لئے سرمایۂ حیات رہے گی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اب تنہا نہیں ہوں۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

خدا آپ کے عزائم کو وسعتیں عطا کرے اور بازوؤں کو قوتِ عمل سے بہرا اندوز فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

قیامتِ موجود[1]

طلوعِ اسلام کی ساتویں کنونشن

منعقدہ۔ شاہ جمال کالونی لاہور

۱۱ تا ۱۴ اپریل ۱۹۶۳ء

(رودیاد ماخوذ از طلوعِ اسلام مئی۔ جون ۱۹۶۳ء)

---

[1] سخن زنامہ و میزاں دراز تر گفتی ۔۔۔ ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

پس منظر

کنونشن کا یہ اجلاس بھی گلبرگ ہی میں منعقد ہوا تھا لیکن (شاہ جمال کالونی کے قریب) ایک کھلے میدان میں۔ شامیانوں کے نیچے۔ جلسہ گاہ کی گہما گہمی اور شرکاء کا شوق و ذوق پہلے سے بھی زیادہ تھا۔ ۱۲ اپریل کی صبح دس بجے اجلاس شروع ہوا اور ابتدائی کاروائی کے بعد پرویز صاحب اسٹیج پر تشریف لائے۔

پرویز صاحب کا استقبالیہ خطاب

پہلے مندوبین و مبصرین و حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ سامعین منتظر تھے کہ اس کے بعد وہ اپنی تقریر کا موضوع دہرائیں گے اور پھر تقریر شروع کریں گے ـــ مگر انہوں نے اپنے استقبالیہ کو موضوع سے یوں ہم آہنگ کیا کہ تمہید و موضوع کے درمیان "گریز" کا احساس بھی نہ ہونے پایا۔ قرآن کی وابستگی نے راقم السطور کو پرویز سے وابستہ کیا ہے لیکن شاید اس رشتہ کی استواری میں ان کی ادبیت اور "نکتہ رسی اور نکتہ سنجی" کا بھی خاصا دخل ہے۔ یہ ادب کی اداؤں کا اسیر ہے۔ (آپ کہتے ہیں بُری بات ہے.... ہوگی)..... اور اسی لئے اس کا ایک فیصلہ ہے؛ وہ یہ کہ اگر بات میں حُسن ہوگا عظمت ہوگی اور اس بات کی جڑیں دل میں پیوست ہوں گی تو اسلوب خودبخود ادیبانہ ہو جائے گا۔ اسلوبِ تقریر بھی اور اسلوبِ تحریر بھی۔ اس ادبیت کی نمائش عربی و فارسی کے الفاظ کے ذریعہ صاحبانِ محراب و منبر بھی کرتے ہیں۔ مگر یہ سستی مرصع سازی کے سوا کچھ نہیں ہوتی ؎

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل ÷ جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے!

یہ خطاب جسے دین و مذہب کی کشمکش کا طویل نام دینے کی جگہ "قیامتِ موجود" کہیے ، ایک اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ جب ہم اسلام کو محض رسوم و عبادات تک محدود دیکھتے تھے تو اس اسلام سے گریز کرنے کو جی چاہتا تھا۔ پھر علماء نے بھی یہ کہنا شروع کیا کہ دین وسیع تر حقیقت ہے جو حیات کے ہر شعبے پر حاوی ہے اور مذہب محض شعائر ــــ لیکن اس خیال سے جو نیا نکتہ اُبھر کر سامنے آتا ہے وہ یہ کہ اگر پیشوائیت، سیاسیات و عمرانیات سے متعلق اپنے خود ساختہ خیالات سے "مذہب" کے دامن کو وسیع کر لے تو پھر بھی 'مذہب' مذہب ہی رہے گا، دین نہ بن جائے گا۔ دین وہ ہے جو وحیٔ الٰہی عطا فرمائے۔

پرویز صاحب نے "چراغِ مصطفوی" اور "شرارِ بولہبی" کی ستیزہ کاری کی علامتوں کے ذریعہ اس حقیقت کو پیش فرمایا کہ یہ کشمکش سدا سے جاری ہے اور یہی "دین و مذہب کی کشمکش" ہے۔ سرمایہ داری اور ملوکیت جیسے مستبدانہ ادارے ہمیشہ مذہب کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ 'مذہب' جو مفاد پرستیوں کی عقلِ فریب کار کا تراشیدہ بت ہے اور اس کی گرفت کا راز یہ ہے کہ اپنے عمل و منشاء کو خدا سے وابستہ کر دیتا ہے اور عوام کے جذبات کی تہذیب کرنے کی جگہ انہیں مشتعل کرتا رہتا ہے ــــ مذہب ہے کیا ؟

سود خوار و والی و مُلّا و پیر

کے مسلک کا نام ہے۔ یہ مسلک جو عہدِ نوح علیہ السلام سے عہدِ مصطفویؐ تک خدا کے دین سے برسرِ پیکار رہا اور آج بھی یہ ستیزہ کاری جاری ہے۔ اسی مذہب نے انسانوں کے سروں کو بادشاہوں کے سامنے جھکایا ہے اور یہی پیشوائیت یا تو لادینی حکومت سے خوش رہتی ہے یا پھر مذہبی حکومت سے، جہاں قیصر کا حق قیصر کو ملے اور مُلّا کا حق مُلّا کو۔

پرویز صاحب نے جب اپنے خطاب میں مذہب پرستوں کے ہاتھوں "خدا کے استعمال" کا ذکر کیا تو... یاسؔ یگانہ چنگیزی کا یہ نشتر رگ و پے میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔

نکل ہی جاتا ہے مطلب تری قسم کھا کر
تو بندگانِ ضرورت کا آفریدہ سہی

دوسرا نکتہ ذہن میں یہ آیا کہ انسانی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رُکاوٹ "مذہب" ہے۔ اس خاکدانِ تیرہ میں جب انسان نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا تو اپنے سے قوی تر افراد کو "نیم خدا"

قرار دیتے ہوئے ان کے آگے سر جھکایا تھا۔۔۔ مگر عہدِ تہذیب میں مذہب ہی نے بادشاہ کو "ظلِ سبحانی" بنا کر انسانوں سے اس کی پرستش کرائی۔

دین و مذہب کے فرق کو اپنے خطاب کے ایک مرحلے میں پرویز صاحب نے اس حسن و روانی کے ساتھ پیش کیا کہ اپنی زبان سے ..... محبت کچھ اور بڑھ گئی۔ مدتوں جس زبان نے گل و بلبل اور نگارانِ چمن کے فسانے سنا کر محفل کو سلائے رکھا تھا اسی زبان کو سرسید اور ان کے رفقاء نے جرسِ کاروانِ بیداری بنا دیا۔۔۔ اور آج پرویز اسی زبان کے ذریعہ قرآنی معارف کو پیش کر رہا ہے اور "شمع مذہب" کو بجھا کر "خورشید دین" کا نشان ہمیں دے رہا ہے۔

"دین، عقل کے روشن سے زندگی کی راہوں کو جگمگاتا ہے، عوام کو دلائل و براہین کے پیچھے چلاتا ہے۔ خوف کو شرک قرار دیتا ہے۔ زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی دعوت دے کر ابنِ آدم کو تقدیر شکنی سکھاتا ہے۔ دین زندگی کا تبسم ہے۔ مذہب موت کی سسکی ہے۔ مذہب دین کے الفاظ، اصطلاحات، اور رسوم و مناسک کو قائم رکھتا ہے مگر ان سے روح چھین لیتا ہے۔"

یہ خطاب کیا تھا ایک ایسا ہمہ گیر اور کل شناس آئینہ تھا جس میں دین کا ہر دل نواز خط نکھر کر سامنے آگیا۔ اور مذہب کا سارا میک اپ اتر گیا۔ یہ مذہب ہی تو ہے جو "عائلی قوانین" کے خلاف شور و غوغا مچا رہا ہے۔ لیکن عصمت فروشی، زنا کاری اور دو بالغوں کے درمیان رضا کارانہ مگر ناجائز جنسی تعلق کے باب میں مہر بہ لب ہے۔ اسی مذہب ہی نے تو جداگانہ قومیت کو تسلیم کرنے کے باوجود تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ شہنشاہ اکبر نے عبد اللہ ازبک والئی ترکستان کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ یہ "ملوی اور عالم فرمانروائی میں اپنا حصہ چاہتے ہیں (دین کی خدمت ان کا مقصود نہیں) اکبر کے الفاظ کی صداقت آج بھی اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

بارہ بجے یہ خطاب ختم ہوا۔ کتنے ہی لوگ شہر سے آتے تھے۔ وہ دوبارہ شام کو آنے کے لئے رخصت ہوتے۔ مندوبین اور مبصرین نے اس تقریر کے نکات پر بڑی دیر تک گفتگو کی۔۔۔ دوپہر کے کھانے پر بھی یہی سلسلہ جاری رہا۔ کھانے کے بعد، ہم لوگ مختلف ٹولیوں میں جمعہ کی

نمازِ جمعہ اور مندوبین

نماز ادا کرنے قریب کی مسجدوں میں گئے۔ راقم السطور اچھرہ کی مسجد میں پہنچا۔ طلوعِ اسلام کنونشن کا بیج سینہ پر آویزاں تھا۔ جب وضو کر رہا تھا تو چند نگاہوں نے یوں گھورا کہ سینہ

کی خباثتیں آنکھوں میں آگئیں۔

نماز کے لئے صف میں کھڑا ہوا۔ ایک صاحب بولے: "پرویزی ہو؟" اس کے جواب میں عرض کیا۔ "جماعت کھڑی ہو رہی ہے۔ نماز کے بعد عرض کروں گا" ——— نماز کے بعد مسجد سے انہیں کے ساتھ باہر نکلا۔ اور عرض کیا کہ جناب ہم اور آپ اس دین سے وابستہ ہیں جس نے ہمیں "مسلم" کا نام دیا ہے۔ ہم جب اپنے آپ کو محمدی بھی نہیں کہتے تو بھلا کسی دوسرے انسان سے اپنے آپ کو کیسے وابستہ کر سکتے ہیں۔ ورنہ اپنے دین کا نام رکھنے کے لئے اُن سے زیادہ محترم اور مقدس ذات اور کون سی ہو سکتی تھی جس کی ترکش سے خدا کا تیر چلنا تھا؟" ——— انہیں طلوع اسلام کا مسلک تفصیل سے بتایا ——— ذہن تعصبات کا گہوارہ نہ تھا، چنانچہ وہ سنائم کے اجلاس میں نظر آئے۔

کچھ ایسا ہی واقعہ ایک دوسرے "پرویزی" کے ساتھ بھی پیش آیا ——— وہ شاہ جمال کالونی کی مسجد سے نماز پڑھ کر نکلے تو چند لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

——— "لو سامنے آج پرویزیوں نے بھی ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔"

——— "سنا ہے یہ لوگ تین ہی وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔"

——— "اور تو اور ——— عام مسلمانوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے۔"

اس "پرویزی" نے آگے بڑھ کر کہا ——— "آپ کی اصطلاح میں تو میں بھی پرویزی ہوں مگر آپ کے ساتھ ہی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا ہوں۔"

احباب نے اس سے پہلے پرویز صاحب سے کہا تھا کہ ہم جمعہ کی نماز کنونشن کے پنڈال میں کیوں نہ پڑھیں ——— اور انہوں نے مخالفت کی تھی کہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا فرقہ پرستی کو ہوا دینا ہے ——— اس وقت ان کی بات ہماری سمجھ میں نہ آئی تھی ——— مگر ان دونوں واقعات کے بعد بڑے دُکھ کے ساتھ سوچنا پڑا، کہ بہتان و تہمت طرازی کو بھی کیا یہ پیشوایانِ "دینِ متین" اپنے "دین" کا جزو سمجھتے ہیں۔

(اس کے بعد آپ پرویز صاحب کا خطاب ملاحظہ فرمایئے۔)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قیامت موجود

بادہ کشانِ خمکدۂ قرآن کے نام

ساقی! قدحے کہ دورِ گلزار گذشت
مطرب! غزلے کہ وقتِ گفتار گذشت

اے ہم نفس! از بہرِ دلِ زار بگو
افسانۂ آں شبے کہ بایار گذشت

یارانِ میکدہ! سلام و رحمت۔

یہ ساعت کس قدر سعید، اور یہ لحہ زندگی کیسا درخورِ ہزار تبریک ہے کہ آپ احباب ایک سال کی طویل مدت کے بعد اپنے ولولۂ شوق کو دلوں میں لئے، پھر یکجا جمع ہوتے ہیں، کہ کچھ وقت کے لئے کشاکشِ روزگار سے الگ ہٹ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ خدائے لم یزل کی وہ شمعِ جہاں تاب جسے صدیوں سے پیرانِ حرم کی مقدس آستینوں نے چراغِ تہ داماں بنا رکھا ہے، کس طرح پھر سے وجہِ نورانیتِ عالم بنے۔ کس قدر حسین ہیں یہ آرزوئیں، جو آپ کو اتنے دور دراز سفر کے بعد کشاں کشاں یہاں لے آئی ہیں اور کیا عظیم ہے وہ مقصد جس کے لئے آپ نے یہ صعوبات برداشت کی ہیں۔ میں جب آپ احباب کے اس جذب و کیف میں ڈوبے ہوئے اجتماعِ سادہ و رنگیں پر نظر ڈالتا ہوں، تو میری نگہ شوق بے تابانہ پکار اٹھتی ہے کہ

نور ہی نور ہیں در و دیوار
کون سا چاند گھر میں اترا ہے

برادرانِ عزیز! یہ جو ہم نے وقت کے کارواں سے فرصت کے چند لمحات چھین لئے ہیں، تو آؤ ان میں۔

رسمِ مہر و وفا کی بات کریں — پھر کسی دل رُبا کی بات کریں
سخت ابیگانۂ حیات ہے دل — آؤ. اُس آشنا کی بات کریں
گیسوؤں کے فسانے دہرائیں
اپنے بختِ رسا کی بات کریں

کس قدر قابلِ صد رشک ہیں زندگی کے وہ لمحات جو رسمِ مہر و وفا کی باتوں میں گزریں.

عزیزانِ من! علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

ازلی کشمکش

سوال یہ ہے کہ وہ چراغِ مصطفویؐ کیا ہے جس کے ساتھ، ازل سے تا امروز، شرارِ بولہبی ستیزہ کار چلا آرہا ہے. یہ کون سی کشمکش ہے جس کا سلسلہ دراز، نوعِ انسان کی پوری تاریخ کو محیط ہے. اس تماشہ گاہ میں ہزاروں قومیں آئیں اور چلی گئیں. سینکڑوں نظام اُبھرے اور بیٹھ گئے۔ متعدد تہذیبوں کے چراغ جلے اور بجھ گئے لیکن وہ کونسے ایسے حریفانِ ازلی ہیں جن کی باہمی آویزش پر ان تمام تغیرات کا کوئی اثر نہ ہوا، اور ان کی ستیزہ کاری کا سلسلہ ہر دور اور ہر مقام میں بدستور جاری رہا۔ اور اب تک جاری ہے. آپ انسانی تاریخ پر جس قدر بھی غور کریں گے ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ کشمکش پیہم — وہ ستیز مسلسل — وہ آویزشِ متواتر.

دین اور مذہب کی جنگ

ہے جس دن سے شعورِ انسانی نے آنکھ کھولی ہے، اس جنگ کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے. اس میں شبہ نہیں کہ ملوکیت، سرمایہ پرستی وغیرہ بھی انسانیت کے کم دشمن نہیں لیکن اگر آپ ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ اور اس قسم کے دیگر مستبدانہ تصورات اور نظام

لہ یہ خطاب پرویز صاحب کے مجموعہ مضامین — بہارِ نو — میں شائع ہو چکا ہے. لیکن پیشِ نظر کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے اس مقام پہ درج کرنا بھی مناسب سمجھا گیا ہے.

مذہب ہی کے سہارے قائم رہے ہیں اور جب دین نے مذہب کو مٹا یا تو پھر اس کے ساتھ یہ خود بھی مٹ گئے۔ اس لئے اصل کشمکش دین اور مذہب ہی کی ہے۔

مذہب کی چیرہ دستیاں مذہب کا تصور، مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے جن کا مقصد یہ تھا کہ وہ دوسرے انسانوں کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کریں اور یہ کچھ اس انداز سے کریں کہ یہ انہیں لوٹیں اور وہ انہیں دعائیں دیں۔ یہ انہیں دھتکاریں اور وہ ان کے پاؤں پکڑیں۔ یہ انہیں بلا جرم و قصور گالیاں دیں اور وہ گڑگڑا کر معافیاں مانگیں۔ یہ بھری محفل میں انہیں بے عزت کریں لیکن وہ اپنے کمرے کی تنہائیوں میں' اپنے دل کے اندر بھی ان کی شان میں گستاخی کا خیال تک نہ لاسکیں۔ یہ اُن سے ہر قسم کی خدمت اور بیگار لینا اپنا حق سمجھیں اور وہ ان کے ہر حکم کی تعمیل اپنی زندگی کا مقدس فریضہ قرار دیں۔ ان کے ادنیٰ سے اشارے پر اپنے سینے میں خنجر گھونپ لیں۔ اپنے بچوں کے گلوں پر چھری پھیر دیں، آگ میں کود پڑیں۔ پہاڑ کی چوٹی سے سر کے بل نیچے آگریں۔ تختۂ دار پر ہنسی خوشی چڑھ جائیں۔ ان کی رتھوں کے آہنی پہیوں کے نیچے آکر کچلے جائیں۔ یہ اپنے جس حریف کے خلاف چاہیں انہیں کھڑا کر دیں، اور وہ اتنا جانے اور پوچھے بغیر کہ ہمیں ان کے خلاف کیوں لڑایا جا رہا ہے، ان کی جانیں لیتے اور اپنی جانیں دیتے جائیں۔ وہ خود بھوکے رہیں اور ان کے خادموں کو نعمتیں کھلائیں، اپنے بچوں کو فاقے سے رکھیں اور ان کے کتوں کو دودھ پلائیں۔ خود ننگے رہیں اور ان کے پتھروں کو حریر و اطلس کے لبادے پہنائیں۔ آپ خس و خاشاک کی جھونپڑیوں میں زندگی کے دن کاٹیں اور ان کی ہڈیوں کی راکھ پر سنگِ مرمر کی فلک بوس عمارات استوار کریں۔ زندگی میں تو ایک طرف، ان کی موت کے بعد بھی اُن کے دل پر ان کا خوف اس طرح طاری رہے کہ وہ ان کے تصور سے ڈرتے کانپتے، لرزتے، سہمے رہیں۔ غرضیکہ یہ ہر وقت اُن بیچاروں کے اعصاب پر چھلاوے کی طرح سوار اور اُن کے ذہن پر بھوت بن کر چھائے رہیں اور وہ ان کے پنجہ کی آہنی گرفت سے کبھی نکلنے نہ پائیں۔

یہ ہیں اس مذہب کے چند گوشے جسے مفاد پرست انسانوں کی عقلِ فریب کار نے تراشا اور جسے کمزور اور ناتوانوں کا خون چوسنے کے لئے ایک مؤثر ترین حربہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملوکیت اور سرمایہ داری کا استبداد بھی کچھ کم استخواں شکن اور خون آشام واقع نہیں ہوا۔ لیکن انہیں اپنے غلبہ و تسلط کی زنجیریں مستحکم رکھنے کے لئے سینکڑوں قسم کی قوتیں فراہم اور ہزار قسم کے حربے استعمال

کرنے پڑتے ہیں اور پھر بھی انہیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کب شکار ان کے جال سے نکل جائے۔ لیکن مذہبی دسیسہ کاریوں کا تو یہ عالم ہے کہ اس میں — صید خود صیاد را گوید بگیر — اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی ان غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرے تو یہ غلام آگے بڑھ کر اس کا گلا گھونٹ دیں۔ اور اگر کسی وقت کوئی زنجیر اتفاقاً ٹوٹ جائے تو یہ اس کے ٹوٹے ہوئے حلقوں کو اپنی مژگانِ عقیدت سے اٹھا کر چومیں اور بصد عقیدت اپنے گلے میں ڈال لیں۔

مذہب کی گرفت

مذہب نے اپنی تمام مہرہ بازیوں اور سحر انگیزیوں کے لئے صرف ایک بنیادی حربہ استعمال کیا اور وہ یہ کہ اس نے جو کچھ کرنا چاہا، اسے خدا کی طرف منسوب کر دیا۔ اس کی ساری گرفت کا راز اسی میں ہے، اس کے لئے، اس نے پیش بندی یہ کی کہ لوگوں کو سوچنے سمجھنے سے دور رکھا جائے اور عقل و فکر کے قریب نہ آنے دیا جائے کوئی جتنی زیادہ جہالت آمیز باتیں کرے اسے اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب سمجھا جائے۔ جو جس قدر زیادہ بعید از علم و عقل باتوں پر یقین ظاہر کرے، اسے اتنا ہی زیادہ پختہ ایمان والا قرار دیا جائے۔ اربابِ مذہب کی ٹیکنیک ہی یہ ہوتی ہے کہ اپنے معتقدین کو جہالت کے گڑھے سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ توہم پرستیوں پر ایمان کا مدار، اور عجوبہ پسندیوں کو صداقت کا شعار قرار دیا جائے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان لایا جائے تو بلا علم و دلیل، اور ان کے احکام کی تعمیل کی جائے تو یہ پوچھے بغیر کہ اس سے بالآخر مقصد کیا ہے۔ مذہب کی طرف سے جو کچھ کیا جاتا ہے اس کے حق میں اس کے پاس ایک ہی دلیل اور ایک ہی سند ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ایسا کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ہمارے اسلاف کا یہی مسلک تھا۔ اگر کوئی شخص مذہب کے پیش کردہ کسی عقیدہ یا مسلک پر اعتراض کرے تو عوام کو یہ کہہ کر بھڑکا دیا جاتا ہے کہ یہ شخص تمہارے اسلاف کی توہین کرتا ہے — اور عوام کے جذبات کو بھڑکا کر جس قدر فتنہ و فساد برپا کیا جا سکتا ہے، مذہب کی تاریخ خونچکاں کا ایک ایک ورق اس پر شاہد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جس قدر خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں مذہب کے مقدس نام پر ہوئی ہیں، ہلاکو اور چنگیز کے حصہ میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں آیا ہوگا۔ یہی وہ حربہ ہے جس سے اربابِ مذہب، اپنے مخالفین کو اس طرح ڈرا دھمکا کر رکھتے ہیں کہ وہ ان کے خلاف ایک لفظ تک کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مذہب کا سارا مدار عوام

لوگوں کو جاہل رکھا جائے

کے جذبات پر ہے۔ اس کے لئے وہ اس قسم کے مواقع پیدا اور ایسی تقریبات وضع کرتے رہتے ہیں جن سے عوام کے جذبات میں شدت آتی رہے اور ان کی یہ آگ بجھنے نہ پائے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! اس مذہب کا اجمالی سا تعارف، جو پہلے دن سے آج تک انسانیت کی گردن میں پھانسی کا پھندا بن کر پڑا ہے اور جس نے نوع انسان کی نس نس کو اس طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف، ذرا سی حرکت بھی نہیں کر سکتی۔

خدا کا دین

اور یہی ہے عزیزانِ من! اس کی وہ آہنی گرفت جس سے نوعِ انسان کو چھڑانے کے لئے خدا کی طرف سے دین آتا رہا۔ اس دینِ خداوندی کے پیامبر حضرات انبیاء کرام تھے جو مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتے تھے۔ وہ انسانوں کو اس جنگل سے آزاد ہونے کی دعوت دیتے تھے اور اربابِ مذہب اپنی پوری قوتوں کو مجتمع کر کے اُن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اس محاذ میں اربابِ اقتدار ان کی پشت پناہ اور سرمایہ دار طبقہ ان کا حامی ہوتا تھا۔ اس لئے کہ خدا کا دین ان کے حق میں بھی تو موت کا پیغام تھا۔ وہ دین کو مغلوب اور مذہب کو غالب رکھنے کی انتہائی کوشش کرتے تھے، کیونکہ مذہب کے غلبہ میں خود اُن کی ہستی کا راز مضمر تھا۔ دین اور مذہب کی یہی وہ کشمکش ہے جو پہلے دن سے آج تک دنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے میں مسلسل اور پیہم چلی آرہی ہے، اور اسی کو علامہ اقبالؒ، چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے انسانیت کے لئے بدترین لعنت اور خدا کا عذاب قرار دیتے ہیں۔ وہ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں۔

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر

سود خوار و والی و مُلّا و پیر

یعنی مذہب کا شجرۃ الزقوم اور اس کی پروردہ شاخیں۔ ملوکیت اور سرمایہ داری۔

دین اور مذہب کی کشمکش

قرآن کریم، دین اور مذہب کی اس کشمکش کے متنوع گوشوں کو بار بار سامنے لا کر اس کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ وہ اس کشمکش کی ابتدا حضرت نوحؑ کی اُس انقلابی دعوت سے کرتا ہے جس کی رُو سے انہوں نے، مذہب کی غیر خدائی قوتوں کی محکومیت میں جکڑی ہوئی قوم سے کہا کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۵۹)۔ اے میری قوم کے لوگو! تم، مذہب کے ان اجارہ داروں کی اطاعت اور محکومیت کی زنجیروں کو توڑ دو۔

اور صرف ایک خدا کے قوانین کی اطاعت کرو. یاد رکھو! اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اختیار کی جائے. اس آزادی کی آواز کے خلاف، اربابِ مذہب اور ان کے پشت پناہ اہلِ اقتدار — یعنی مترفین طبقہ کے لوگ جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے تھے، یورش کرکے آگے بڑھے. انہوں نے عوام کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا کہ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۳/۲۴) جو کچھ یہ شخص کہتا ہے وہ تمہارے آباؤ اجداد کے مسلک کے خلاف ہے. یہ تمہیں، تمہارے بزرگوں کی روش سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے — اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ (۲۳/۲۵) — یہ پاگل ہے. اس کی کوئی بات نہ سنو۔

اس کے بعد قرآن کریم نے سلسلۂ انبیاء کرامؑ کی ایک ایک کڑی کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی دعوت یہی تھی کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گزار بنائے. اطاعت صرف قوانین خداوندی کی کی جاسکتی ہے. جنہیں وہ (بذریعہ وحی) اپنی کتاب میں دیتا ہے. وہ یہ دعوت دیتے رہے اور ان کے خلاف، ہر زمانے میں، اور ہر مقام پر مذہبی پیشوائیت اور اربابِ ثروت و اقتدار متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہوتے رہے. ان کے پاس عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے ایک ہی سلوگن تھا اور وہ یہ کہ مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ — (۳۴/۴۳) یہ شخص چاہتا ہے کہ تمہیں، تمہارے اسلاف کے مذہب سے برگشتہ کر دے. اس لئے اٹھو. اسے پکڑو۔ حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ (۲۱/۶۸) اسے زندہ جلا دو اور اس طرح اپنے خداؤں کا بول بالا کر دو۔

حضرت عیسیٰؑ کی انقلابی آواز

اناجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں مذہبی پیشوائیت کا اقتدار انتہا تک پہنچ چکا تھا. بنی اسرائیل کے احبار و رہبان نے ایک متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی جس میں انہیں ہر قسم کے اختیارات حاصل تھے. صرف سزائے موت کے لئے انہیں رومی حکام کی منظوری لینی پڑتی تھی. حضرت عیسیٰؑ کی دعوت مظلوم اور مقہور انسانیت کو ان کے اس پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے تھی. یروشلم کا ہیکل، ان مذہبی پیشواؤں کا مرکز تھا. داعیٔ انقلابِ آسمانی، حضرت عیسیٰؑ اسی ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور انہیں للکار کر کہتے تھے کہ

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو. کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ ہی داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو.

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے خشکی اور تری کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو، مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوتے ہو۔

اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے۔

(انجیل متی۔ باب ۲۳)

ظاہر ہے کہ مذہبی اجارہ دار جو اپنی خدائی مسندیں بچھا کر، عوام کو لوٹتے اور ان پر حکومت کرتے تھے، اس انقلابی دعوت کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ وہ اسے اپنی مفاد پرستیوں کے لیے کس طرح موت کا پیغام سمجھتے تھے، اس کا اندازہ ان کی اس چیخ اور پکار سے لگ سکتا ہے جسے انجیل برنباس میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ.

مخالفت کیوں؟

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہوگیا تو ہم کیا کریں گے. اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا. یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔ حالانکہ اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے. جیسے ہم ان کی شریعت کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ ہم جو چاہیں کریں. اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم

سے ہے اور تشر بانی اور روزنے کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے۔ لیکن اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز راضی نہ کیا جا سکے گا۔ جب تک خدا کی عبادت (اطاعت) ویسے ہی ہوتی نہ دیکھے جیسی موسےٰ نے لکھی ہے۔ (انجیل برنباس ۱۴۲)

آپ نے غور فرمایا کہ اس آسمانی دعوت کی اس قدر شدید مخالفت کی وجہ کیا تھی؟ —— بس وہی ایک وجہ! یعنی اگر خدا کا قانون رائج ہو گیا تو ہم اپنی مسندوں سے الگ کر دیئے جائیں گے۔ اور چونکہ ہمیں کوئی کام کاج آتا نہیں جس سے ہم اپنی روٹی کما سکیں، اس لئے ہمیں اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگنی پڑے گی۔ آپ نے دیکھا کہ جسے مذہبی سوال کہہ کر پیش کیا جاتا ہے، وہ درحقیقت یکسر معاشی مسئلہ ہوتا ہے۔

انجیل برنباس کے اس بیان سے آپ نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ مذہبی پیشوائیت ہمیشہ اس اندازِ حکومت کو پسند کرتی ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں سیکولر کہتے ہیں۔ یعنی امورِ مملکت، حکومت کے پاس رہیں اور امورِ شریعت (پرسنل لاز) مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ نہ مذہبی پیشوائیت حکومت کے معاملات میں دخل دے اور نہ ہی حکومت ان کے حیطۂ اقتدار میں دخیل ہو۔

نبی اکرمؐ کی دعوت

اور آخر میں اس عظیم و جلیل داعیِ انقلاب کو دیکھیے جس پر سلسلۂ نبوت کا خاتمہ ہو گیا (صلے اللہ علیہ وسلم)۔ حضورؐ کے ظہورِ قدسی کا مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے کہ — وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) وہ نوعِ انسان کو ان زنجیروں سے آزاد کر دے گا جن میں وہ جکڑے چلی آ رہی ہے اور ان کے سر سے وہ بوجھ اتار دے گا جس کے نیچے وہ بُری طرح دبی اور کچلی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے حضورؐ نے بھی وہی دعوت پیش کی جو حضرت نوحؑ سے حضرت عیسےٰؑ تک مسلسل و متواتر پیش ہوتی چلی آ رہی تھی۔ اور مترفین کے طبقہ کی طرف سے اس کا جواب بھی وہی ملا جو شروع سے ملتا چلا آ رہا تھا۔ یعنی مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ۔ جو بات یہ شخص کہتا ہے اسے ہم نے اسلاف کے مذہب میں کہیں نہیں سُنا۔ لہٰذا إِنْ هَٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸/۷)۔ یہ غلط، جھوٹی اور بنائی ہوئی بات ہے۔ یعنی اس کے غلط ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے اسلاف میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی —— اس کے بعد اس طبقہ کی طرف سے جو کچھ نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے رفقاء کے ساتھ ہوا، اس پر قرآن گواہ اور تاریخ کے اوراق شاہد ہیں۔

نبی کے بعد کیا ہوتا تھا

اس مقام پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب حضرات انبیاء کرامؑ، خدا کا سچا دین انسانوں کو دے جاتے تھے تو اس کے بعد اس دین کے ساتھ کیا بیتتی تھی کہ بعد میں آنے والے نبی کے وقت، سابقہ نبی کے پیش کردہ دین کی آواز کہیں سے بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس نبی کی اولین مخاطب (بالعموم) وہی قوم ہوتی تھی جو اپنے آپ کو سابقہ نبی کی متبع کہتی تھی۔ پھر یہ کیا تھا کہ آنے والا نبی اس قوم کے مسلک کو باطل قرار دیتا تھا اور یہ قوم اس نبی کی دعوت کی اس قدر شدید مخالفت کرتی تھی۔

ہوتا یہ تھا کہ جب ایک نبی دین خداوندی دے کر چلا جاتا تو اس کے بعد اس قوم میں ایسے مفاد پرست لوگ پیدا ہو جاتے جو اس دین کو اپنے خیالات کی آمیزش سے، مذہب میں تبدیل کر دیتے لیکن لوگوں سے یہ کبھی نہ کہتے کہ یہ ہمارے خیالات ہیں۔ وہ اسی مذہب کو خدا کی سچی تعلیم کہہ کر پیش کرتے ——— يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ۔ وہ خود شریعت وضع کرتے اور کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ ایسا کیوں کرتے؟ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا۔(۲/۷۹) تاکہ اس سے کچھ پیسے کما لئے جائیں۔ چنانچہ اس طرح خدا کا دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا۔

یہ عجیب بات ہے کہ جب دین اس طرح مذہب میں تبدیل ہو جاتا، تو یہ نہیں ہوتا کہ اس میں کچھ

مذہب اور دین کا تقابل

جزوی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں یا مذہب، دین کی پست سطح کا نام ہو۔ یہ دونوں بالکل ایک دوسرے کی ضد بن جاتے ہیں اور یکسر ایک دوسرے کے مد مقابل کھڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جن لوگوں نے مذہب اور دین کا تقابلی مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ:

مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین، اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
مذہب میں ہر فرد اپنے اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی نجات ہوتا ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔

مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جاسکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں؟

مذہب، علم کا دشمن اور عقل کا حریف ہے۔

مذہب، عقل کے دیئے گل کرتا ہے کہ اس کا چراغ جلے۔

مذہب، اپنے آپ کو اندھی عقیدت کی بنا پر منواتا ہے۔

مذہب، لوگوں کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف لیجاتا ہے۔ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ۔ (۲/۲۵۷)

مذہب کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ تم بھیڑ بکریوں کی طرح سر جھکائے، آنکھیں بند کئے پامال راستوں پر چلتے جاؤ۔

مذہب، عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور انکی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔

اس لئے مذہب ہر زمانے میں نئے نئے بت تراشتا رہتا ہے تاکہ عوام کو بہلائے رکھے۔

مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

مذہب، انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔

دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔

دین، انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب۔

دین، عقل کے دیئے میں روغن ڈالتا ہے کہ زندگی کے راستے جگمگائیں۔

دین، اپنے ہر دعوے کو دلیل اور برہان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

دین، انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (۲/۲۵۷)

دین کا پیغام یہ ہوتا ہے کہ

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش

براہِ دیگراں رفتن حرام است

دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور انکے سطحی جذبات کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔

دین، تیشۂ براہیمیؑ سے ہر قدیم اور جدید بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

دین کا پیغام یہ ہے کہ

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

دین، خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بیباکی کا مسکن بناتا ہے۔

مذہب انسان کو ہر بڑی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونا سکھاتا ہے۔

مذہب کشمکشِ حیات سے فرار سکھاتا ہے۔

مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ

بدریا در منافع بے شمار است
وگر خواہی سلامت برکنار است

مذہب، مادی کائنات کو قابلِ نفرت قرار دیکر اسے تیاگ دینے کی تلقین کرتا ہے۔

یعنی مذہب اس دنیا کو ترک کر دینے سے آخرت کی جنت دلاتا ہے۔

مذہب، تقدیر کے بہانے انسان کو یکسر بے عمل بنا دیتا ہے۔

مذہب کمزوروں، ناتوانوں، مظلوموں کو یہ تعلیم دے کر مطمئن رکھتا ہے کہ یہاں سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اور راضی برضا رہنا خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہے۔

اس سے مستبد، ظالم اور غاصب قوتیں بے لگام چھوڑ دی جاتی ہیں کہ وہ جو جی میں آئے کریں۔

مذہب، خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

دین اُسے دنیا کے ہر آستانے سے سرفرازانہ مستانہ وار گزر جانے کی تلقین کرتا ہے۔

دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

دین کی پکار یہ ہے کہ

بدریا غلط و با موجش درآویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

دین مادہ کی تسخیر سے انسان کو حدود فراموش بلندیوں تک لے جاتا ہے۔

اور دین اس دنیا کو سنوارنے سے یہاں کی جنت حاصل کرتا ہے اور وہاں بھی۔

دین اُسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے [illegible] وعمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔

دین ظلم واستبداد، سلب و نہب کے خلاف اعلانِ بغاوت کرتا ہے۔ وہ کمزور انسانوں سے کہتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے اتباع سے ایسا نظام قائم کریں جس میں ہر ظالم اور مستبد حق اور انصاف کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائے۔

دین اسے وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔

مذہب ہر خوشی میں غم کا پہلو دیکھتا ہے اور انسان میں ایسی مایوسانہ ذہنیت پیدا کر دیتا ہے جس میں اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ع

آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

دین ہر غم کو خوشی کا پیش خیمہ سمجھتا ہے اور انسان کی نگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ وہ نامساعد حالات کی انتہائی تاریکیوں میں بھی روشنی کی کرن دیکھتا ہے اور بیساختہ پکار اٹھتا ہے کہ ع

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے

مذہب کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور تیوریاں چڑھانا سکھاتا ہے۔

دین اعلان کرتا ہے کہ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (۷:۳۲)۔ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔

مذہب موت کی سسکیاں ہیں۔

دین زندگی کے قہقہے۔

مذہب ایک خواب پریشاں ہے۔

دین زندہ حقیقت۔

مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دیتا ہے۔

دین کہتا ہے کہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں، اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔

مذہب انسانی بستیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔

دین قبرستانوں میں صورِ اسرافیل پھونک کر مُردوں کو حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔

مذہب انسانیت کی موت ہے۔

دین ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

دین[1] دمِ جبرئیل، دین دلِ مصطفےٰ!
دین خدا کا رسول، دین خدا کا کلام

دین فقیہِ حرم، دین امیرِ جنود
دین ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

---

[1] اصل اشعار میں "دین" کے بجائے "عشق" کا لفظ ہے۔

دین کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات دین سے نورِ حیات، دین سے نارِ حیات

یہ ہے وہ دین، جو مذہب میں تبدیل ہو کر انسانیت کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔

چونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اس لئے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو سچ کے نقاب میں پیش کرتا ہے۔ مذہب بھی یہی کرتا ہے۔ وہ دین کے الفاظ، اصطلاحات، رسوم و مناسک اسی شکل میں قائم رکھتا ہے لیکن ان کی روح نکال دیتا ہے۔ یہی دین کے وہ بے روح خد و خال ہیں جن سے مذہب عوام کو دھوکا دیتا ہے۔ مذہب، درحقیقت دین کی ممی شدہ لاش کا نام ہے۔

(۰)

اسلام کے ساتھ بھی کچھ ہوا

دین کے ساتھ برادران! جو کچھ اقوامِ سابقہ کے ہاتھوں ہوا تھا وہی کچھ اسلام کے ساتھ بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو قرآنِ کریم میں مکمل کر دیا۔ اور حضورؐ نے اس قرآن کو امت کو دے دیا۔ لیکن حضورؐ کی تشریف براری کے تھوڑا عرصہ بعد، مفاد پرست قوتوں نے ابھرنا شروع کر دیا۔ اس دفعہ پہلے ملوکیت آئی۔ اس کے ساتھ سرمایہ داری اور ان دونوں نے اپنے تحفظ کے لئے دین کو مذہب میں بدلنا شروع کر دیا۔ چنانچہ یہ دین بھی آہستہ آہستہ اسی طرح مذہب میں تبدیل ہو گیا جس طرح سابقہ انبیائے کرامؑ کا لایا ہوا دین تبدیل ہوا تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس دین کا ضابطہ ــــ قرآنِ کریم ــــ اپنی اصلی شکل میں محفوظ رہا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا تھا۔ لیکن اس کتاب کا محفوظ رہنا، مذہب کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا۔ چنانچہ اس نے اسے قوم کی زندگی سے عملاً خارج کرنے اور اس طرح اسے ایک ضابطۂ حیات کے طور پر غیر مؤثر بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ رسول اللہؐ کے بعد، کسی نبی نے نہیں آنا تھا جو دین کو اس کی اصلی شکل میں پھر سے دنیا کے سامنے پیش کرتا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ دین، قرآنِ کریم کے اندر منضبط تھا اور قرآن حرفاً حرفاً محفوظ۔ اس لئے اب دین کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرنے کی صورت یہی تھی کہ قرآنِ کریم کو عملی

تحریکِ پاکستان

زندگی کا ضابطہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ یہی وہ کوشش تھی جو ہمارے زمانے میں تحریکِ پاکستان کی شکل میں سامنے آئی۔ جیسا کہ معلوم ہے پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی کا رہینِ منت ہے۔ انہوں نے اس مطالبہ کی بنیاد ہی اس حقیقت پر رکھی تھی کہ قرآنِ کریم مسلمانوں کی عملی زندگی کا ضابطہ اسی صورت میں بن سکتا ہے جب انکی

اپنی آزاد مملکت، جس میں قرآنی اصول و احکام نافذ کئے جا سکیں. غیروں کی حکومت میں مذہب تو باقی رہ سکتا ہے، دین نہیں رہ سکتا. آپ احباب کو معلوم ہے کہ تحریکِ پاکستان کی سب سے زیادہ مخالفت ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوئی تھی. یہ درحقیقت دین اور مذہب کی وہی کشمکش تھی جو ازل سے تا امروز، باہمد گر ستیزہ کار چلی رہی ہے. اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے.

تحریکِ پاکستان کی مخالفت

مذہب کی اولین کوشش یہ ہوتی ہے کہ مملکت کو پورا اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں رہے اور حکمران طبقہ انکے فیصلوں کو نافذ کرنے کی مشینری کا کام دے. اس انداز کو تھیاکریسی کہتے ہیں. لیکن اگر ممکن نہ ہو تو مذہبی پیشوائیت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مملکت میں ایسا نظام قائم ہو جس میں امورِ سیاست' حکومت کی تفویض میں رہیں اور امور مذہب' مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں. اسے سیکولر اندازِ حکومت کہا جاتا ہے. ہمارے قرنِ اول کے بعد' جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو مسلمانوں کی حکومتوں کا انداز سیکولر رہا. اسی انداز کو انگریزوں نے ہندوستان میں قائم رکھا. ان کے عہدِ حکومت میں بھی پبلک لاز' حکومت کی تحویل میں تھے اور پرسنل لاز' اربابِ مذہب کے سپرد. تحریکِ پاکستان سے مقصود یہ تھا کہ اس مملکت میں دین کی حکمرانی ہو. ظاہر ہے کہ اس میں (ملوکیت اور سرمایہ داری کی طرح) مذہبی پیشوائیت کی بھی کوئی گنجائش نہیں رہتی تھی. دوسری طرف ہندو نے یقین دلایا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد' مملکت کا نظام بدستور سیکولر رہے گا. چونکہ یہ انداز مذہبی پیشوائیت کو (SUIT) کرتا تھا اس لئے انہوں نے ہندوؤں سے مفاہمت کر لی —— مذہب اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے ہر ایک سے مفاہمت کر سکتا ہے. لیکن دین' لاشریک ہوتا ہے. اس لئے وہ کسی سے مفاہمت نہیں کر سکتا. ؎

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ مُلّا ہے نہ زاہد، نہ حکیم

اسلئے تحریکِ پاکستان جو دین کی بنیادوں پر اٹھی تھی' نہ ہندو سے مفاہمت کر سکتی تھی، نہ مذہبی پیشوائیت سے. چنانچہ جب اس تحریک نے مذہبی پیشوائیت سے مفاہمت نہ کی تو اس نے اس کی

مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ انہیں نیشنلسٹ یا (قوم پرست) علماء کا طبقہ کہا جاتا ہے ان کے علاوہ وہاں ایک مختصر سا گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو مذہب کے نام پر مملکت میں پورا اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ یعنی یہ طبقہ تھیاکریسی قائم کرنے کا متمنی تھا۔ چونکہ دین کی نظروں میں تھیاکریسی بھی ایسی ہی باطل ہے جیسی سیکولرازم۔ اس لئے تحریکِ پاکستان اُس طبقہ سے بھی مفاہمت نہیں کر سکتی تھی۔ لہٰذا یہ طبقہ بھی ـــــ متحدہ قومیت کے نظریہ کا مخالف ہونے کے باوجود ـــــ تحریکِ پاکستان کا مخالف تھا۔ یہ طبقہ جماعتِ اسلامی کے نام سے معروف تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ تحریکِ پاکستان کی کشمکش کس طرح درحقیقت دین اور مذہب کی وہی کشمکش تھی جو ازل سے تا امروز ستیزہ کار چلی آرہی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد مذہبی طبقہ کی اس قدر مخالفت کے باوجود، پاکستان وجود میں آگیا۔ اور اس کے ساتھ ہی مخالفین کا یہ لشکر بھی اِدھر اُمنڈ آیا۔ اب وہی کشمکش پندرہ سولہ برس سے یہاں بھی جاری ہے۔ اس طبقہ کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی نہ ہونے پائے۔ اس کی بجائے یہ چاہتے ہیں کہ اوّلاً یہاں مذہبی تھیاکریسی قائم ہو جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اس انداز کی سیکولر حکومت قائم ہو جائے جس میں پبلک لاز حکومت کے ہاتھ میں رہیں اور پرسنل لاز مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں۔ چونکہ سیکولر اندازِ حکومت، مغربی ذہنیت رکھنے والے طبقہ کے نزدیک بھی زیادہ پسندیدہ ہے اس لئے اسے اس معاملہ میں مذہبی پیشوائیت کے ساتھ مفاہمت کرنے میں تأمل نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر یہاں اس انداز کی حکومت قائم ہو جانے کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔ وہ طبقہ بھی جو یہاں تھیاکریسی قائم کرنے کا متمنی ہے، سردست ان لوگوں کے ساتھ مفاہمت کرنے پر آمادہ ہے۔ اگرچہ ان کی آخری منزل تھیاکریسی ہی ہے۔

دستورِ پاکستان ان حضرات کی یہ کوشش دستور سازی کے سلسلے میں برابر جاری ہے۔ چنانچہ پہلی دستور ساز اسمبلی کے پیشِ نظر یہ تجویز تھی کہ قانون سازی کے آخری اختیارات ایک علماء بورڈ کے سپرد کر دیئے جائیں۔ یہ تھیاکریسی کی شکل تھی۔ اس لئے یہ حضرات اس پر بہت خوش تھے۔ جب وہ اسمبلی ٹوٹ گئی تو ان کی کوشش سیکولر انداز کی طرف منتقل ہو گئی۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء کا دستور جس کے منظور ہونے پر ان حضرات کی طرف سے شادیانے بجائے گئے تھے۔ اس اندازِ حکومت کا مظہر تھا۔ اس میں

پرسنل لاز کو پبلک لاز سے الگ رکھا گیا تھا اور مختلف فرقوں کے وجود کو قانوناً تسلیم کر لیا گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء کا آئین اس لحاظ سے ۱۹۵۶ء کے آئین سے بہتر ہے کہ اس میں نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق کی گئی ہے۔ اور نہ ہی مختلف فرقوں کے وجود کو تسلیم۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کی طرف سے ۶۲ء کے آئین کی اس قدر مخالفت ہو رہی ہے اور مطالبہ یہ ہے کہ اس کی جگہ ۱۹۵۶ء کے دستور کا "اسلامی حصہ" اس دستور میں شامل کیا جائے۔

عائلی قوانین کی مخالفت

آپ نے برادرانِ عزیز! کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ یہ حضرات' ملک کے تمام قوانین کو چھوڑ کر، عائلی قوانین کی تنسیخ کے لئے اس قدر شور کیوں مچا رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ملک میں اس وقت ایسے ایسے قوانین رائج ہیں جو صریحاً اسلام کے خلاف ہیں۔ مثلاً زناکاری قانوناً جائز ہے۔ عصمت فروشی کے بازار ہر شہر میں کھلے ہیں۔ علاوہ بریں' ایک بالغ لڑکے' اور لڑکی کا باہمی رضامندی سے بغیر نکاح' جنسی اختلاط قانوناً جرم نہیں۔ آپ نے کبھی سنا ہے کہ ان حضرات کی دینی غیرت نے کبھی ان قوانین کے خلاف بھی جوش کھایا ہو اور انہیں منسوخ کرنے کے لئے انہوں نے محاذ قائم کئے ہوں؟ یہ کیوں ہے کہ ان قوانین کے خلاف ان کی طرف سے کبھی جدوجہد نہیں کی۔ لیکن عائلی قوانین کے خلاف اس قدر قیامت برپا کی جا رہی ہے؟ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عائلی قوانین پرسنل لاز تھے جو مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں چلے آ رہے تھے۔ قرنِ اول کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ حکومت ان قوانین کو مذہبی پیشوائیت کے حیطۂ اقتدار سے نکال کر حکومت کے دائرۂ اختیار میں لائی ہے۔ مذہبی پیشوائیت اسے اپنی حدود حکومت میں دخل اندازی سمجھتی ہے۔ اس لئے وہ اسے کس طرح برداشت کر سکتی ہے؟ یہ وجہ ہے کہ یہ حضرات ان قوانین کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر کھڑے ہو گئے ہیں' ورنہ ان قوانین میں کوئی بات ایسی نہیں جس سے اسلام خطرے میں پڑ جاتا ہو۔

آپ کی دعوت

اس تمام کشمکش میں برادرانِ عزیز! دین خالص کی طرف دعوت دینے والی آواز آپ کی طرف سے اُٹھ رہی ہے' اس لئے مذہبی پیشوائیت کی ساری مخالفت کا رُخ آپ کی سمت ہے۔ کس قدر خوش بخت ہیں وہ لوگ جو دین اور مذہب کی اس کشمکش میں اُس طرف کھڑے ہیں جدھر حضرات انبیائے کرامؑ اور قدوسیوں کی وہ جماعتیں کھڑی ہوا کرتی تھیں جنہیں خدا نے حزب اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ یہ حضرات اپنی اس خوش بختی پر جس قدر بھی ناز کریں' کم ہے۔

چونکہ مذہب، ہر نظریہ، ہر تصور، ہر نظام اور ہر ادارہ کے ساتھ مفاہمت کرسکتا ہے اور سرمایہ دار طبقہ اس کا پشت پناہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کے پاس زر روپے پیسے کی کمی ہوتی ہے نہ اسباب و ذرائع کی محتاجی۔ روپے کے زور پر یہ لوگ پراپیگنڈہ کی مشینری پر قابو پا لیتے ہیں اور جھوٹ کو سچ کرکے دکھاتے چلے

سامان و ذرائع کی فراوانی

جاتے ہیں۔ دین، ان قوتوں میں سے کسی کے ساتھ مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس لئے جو لوگ اس کی دعوت کو لے کر اٹھتے ہیں ان کے پاس ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہوتی۔

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے

اور مختلف حربے

پھر مذہب اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہر حربے کا استعمال جائز سمجھتا ہے۔ وہ جھوٹ بولنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔ وہ سینٹ پال کے الفاظ میں بڑے فخر سے کہتا ہے کہ

> اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر مجھ پر گنہگار کی طرح کیوں حکم دیا جاتا ہے۔
>
> (رومیوں کے نام۔ ۳/۷)

وہ بڑے طمطراق سے فتوے دیتا ہے کہ

> راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتوے دیا گیا ہے۔
>
> (ابوالاعلیٰ مودودی۔ ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۹ء)

وہ تعلیم یہ دیتا ہے کہ دنیا کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے بڑے مقدس اور زریں اصول پیش کرو۔ لیکن جب اس طرح قوت حاصل ہو جائے تو پھر ان تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر عملاً وہ کچھ کرو جس میں اپنا مفاد سمجھو۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء) اپنے مقصد کے حصول کے لئے اگر رشوت تک بھی دینی پڑے تو اسے کار ثواب سمجھو۔ البتہ اس کا نام "تالیف قلب" رکھو۔[1]

---

[1] حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے اپنے اخبار المنبر بابت ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء میں لکھا تھا کہ مودودی صاحب نے انہیں ملتان جیل میں کہا تھا کہ کراچی جاؤ اور طلوع اسلام کے دفتر کے کسی شخص کی "تالیف قلب" کرکے اس سے طلوع اسلام کے پتے حاصل کرو۔

مذہب ہمیشہ سے یہی کچھ کرتا چلا آیا ہے اور آج بھی یہی کچھ کر رہا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنی فریب کاریوں سے دین کو شکست دے سکتا ہے۔

دین کا غلبہ

دین' خدا کے اٹل قوانین کا نام ہے۔ اور ان قوانین کا آخرالامر غالب آنا خدائی پروگرام ہے۔ خدا کے پروگرام کو دنیا کی کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی۔ لیکن (جیسا کہ آپ احباب کو اچھی طرح معلوم ہے) حق آہستہ آہستہ باطل کے نظام پر غالب آتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس لئے کہ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال' بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔ جن اربابِ نظر کی نگاہیں اُن انقلابات پر ہیں جو اس وقت دنیا کے ہر گوشے میں رونما ہو رہے ہیں' (اور جنہیں علامہ اقبالؒ نے "قیامتِ موجود" سے تعبیر کیا ہے) اُنہیں نظر آ رہا ہے کہ اب مشیت کے پروگرام کے مطابق' باطل کے نظامہائے زندگی کے مٹنے کا وقت بڑی تیزی سے آ رہا ہے۔ دنیا سے ملوکیت کا دور دورہ ختم ہو رہا ہے۔ ہر نئے سورج کے ساتھ کوئی نہ کوئی تاج فضا میں اڑتا دکھائی دیتا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری' جاگیرداری' زمینداری' حرفِ غلط کی طرح مٹ رہا ہے۔ اور ان کے ساتھ ہی مذہب کی سحر کاریاں بھی ابخرات کی طرح ہواؤں میں اُڑتی چلی جا رہی ہیں۔ آپ ذرا غور کریں گے تو یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ انسانی قلوب و اذہان پر مذہب کی جو گرفت آج سے پچاس سال پہلے تھی' وہ بڑی حد تک ڈھیلی پڑ چکی ہے۔

مذہب کا انجام

ہندوستان سے سناتن دھرم بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ بدھ مت کا مامن و مسکن چین تھا' اُسے وہاں سے دیس نکالا مل چکا ہے۔ تبت ان کے خداؤں (لاماؤں) کا پایۂ تخت تھا' وہ وہاں سے بیک بینی و دوگوش نکالے جا چکے ہیں اور اب اپنی جان کی حفاظت کے لئے دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ یہودیت' مذہب کو چھوڑ کر سیاست میں بدل چکی ہے۔ عیسائیت کی قدیم عمارت کا وسطی ستون' پوپ ہے۔ اس نے ابھی پچھلے دنوں جس نئی پالیسی کا اعلان کیا ہے' وہ اسی حقیقت کی غماز ہے کہ اس کا اقتدار بھی خطرے میں ہے۔ غرضیکہ مذہب کی دنیا میں آپ جہاں بھی دیکھیں گے آپ کو نظر آ جائے گا کہ

مے خانہ کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات

جب ساری دنیا میں مذہب کے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہے تو آپ سمجھتے ہیں کہ وہ مذہب (دین نہیں' مذہب) جو ہمارے ہاں رائج ہے' باقی رہ جائے گا؟ اس وقت سوال اس مذہب یا اُس مذہب کا نہیں۔ سوال

نفسِ مذہب کا ہے، خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ یہ کہنا کہ دوسروں کا مذہب باطل ہے اور ہمارا مذہب حق۔ اس لئے یہ فنا نہیں ہو سکتا، خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ دنیا میں ہر مذہب کے علمبردار یہی کہتے ہیں۔ لیکن مذہب حق پر ہوتا ہی نہیں۔ حق پر تو خدا کا دین ہوتا ہے۔ اب مذہب کا دور ختم ہو رہا ہے۔ اس لئے مذہبی مفاد پرستوں کی ہزار کوششوں اور مقدس آرزوؤں کے باوجود یہ باقی نہیں رہ سکتا۔ علامہ اقبالؒ نے، عرصہ ہوا، لیگ آف نیشنز (انجمن اقوام) کے متعلق کہا تھا کہ

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے　　　ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن　　　پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے

ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

جو کچھ انہوں نے لیگ آف نیشنز کے متعلق کہا تھا، وہی کچھ اب انسانوں کے خود ساختہ مذہب کے متعلق نظر آتا ہے۔ اس وقت اربابِ مذہب کے ہاں جذبات کی جو شدت نظر آتی ہے، وہ ان کی حرکتِ مذبوحی ہے۔ اس سے یہ کچھ وقت کے لئے فضا میں انتشار اور معاشرہ میں خلفشار تو پیدا کر سکتے ہیں، اپنی مسندوں کو گرنے سے نہیں بچا سکتے۔ زمانے کے تقاضے انہیں ختم کر کے رہیں گے۔

لا و الا

لیکن برادرانِ عزیز! جب باطل، زمانے کے تقاضوں کے ہاتھوں مٹتا ہے تو اس میں ایک نقص رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ تقاضے صرف باطل کو مٹاتے ہیں۔ اس کی جگہ حق کا نظام ساتھ کے ساتھ قائم نہیں ہوتا۔ ان دونوں کے درمیان ایک خلا رہ جاتا ہے جسے قانونِ خداوندی کی کائناتی رفتار کے مطابق پُر کرنے کے لئے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں زمانے کے تقاضے "اللہ کے نشتر" ہوتے ہیں جو فصد کھول کر کثیف خون باہر نکال دیتے ہیں۔ لیکن اس کی جگہ صالح خون، ساتھ کے ساتھ پیدا نہیں کرتے۔ یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا ہوتا ہے جو دین کا نظام قائم کرنے کا ولولہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ وہ وقت، جب زمانے کے تقاضے باطل کے کسی نظام کو مٹا رہے ہوں، ان لوگوں کے لئے بڑا ساز گار بھی ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی بڑا صعوبت انگیز بھی۔ ساز گار تو اس لئے کہ ان کا آدھا کام — یعنی لاالٰہ کا مرحلہ — زمانے کے تقاضے یا اللہ کے نشتر پورا کر دیتے ہیں۔ انہیں اس ہموار شدہ زمین پر الا اللہ کی عمارت استوار کرنی ہوتی ہے۔ لیکن بڑا صعوبات

اس لئے کہ جس طرح ایک "بھوت" نکلتے وقت بڑی دہشت انگیز نشانی پیچھے چھوڑتا ہے' باطل کی قوتیں نزع کی حالت میں بڑی سخت لکد کوبی کرتی ہیں ـــــ بدر و حنین کے میدان باطل کی قوتوں کے اسی رقص بسمل کی یادگار ہیں. لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس آئینی دور میں، کم از کم پاکستان میں' ان رزمگاہوں کی ضرورت نہیں پڑے گی. اس میں شبہ نہیں کہ تھیاکریسی قائم کرنے والوں کے عزائم کچھ اور ہیں. چنانچہ انہوں نے بہت پہلے اپنے پروگرام کا اعلان کر دیا تھا جب کہا تھا کہ

> اسلام جب اس طرح اپنے آدمیوں کو تیار کر لیتا ہے تب وہ ان سے کہتا ہے کہ ہاں! اب تم روئے زمین پر سب سے زیادہ صالح بندے ہو. لہذا آگے بڑھو اور لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو.
>
> (خطبات مودودی صـــ۲۳۵)

طلوعِ اسلام کا پروگرام

طلوعِ اسلام کا پروگرام اس کے بالکل برعکس ہے. ہم نہایت پُرامن اور آئینی طریق سے قرآنی فکر کو عام کرنا چاہتے ہیں. اس سے زیادہ ہمارے پیش نظر کوئی پروگرام نہیں ـــــ حتیٰ کہ ہم ملک کی عام عملی سیاست میں بھی حصہ نہیں لیتے. اس میں شبہ نہیں کہ اس دور میں، کسی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جس قدر سامان و ذرائع کی ضرورت ہے' ہمارے پاس ان کی بے حد کمی ہے. لیکن وہ جو قرآن نے کہا ہے کہ تم دین کی آواز بلند کرنے کے لئے اٹھو تو خدا کی کائناتی قوتیں تمہارا ساتھ دیں گی. کچھ اس کا اثر ہے کہ سامان و ذرائع کی اس قدر کمی کے باوجود قرآن کی آواز جس تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے وہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی. آپ ذرا دس بیس برس پہلے اُدھر کا نقشہ سامنے لایئے اور پھر آج کی فضا پر غور کیجئے، آپ کو نظر آجائے گا کہ یہ آواز کس طرح' خاموشی ہی خاموشی سے' ہر گوشے کو متاثر کئے جا رہی ہے. اور یہ حقیقت کس طرح ایک واقعہ بن کر سامنے آ رہی ہے.

حسن کے رازِ نہاں شرح و بیاں تک پہنچے
آنکھ سے دل میں گئے. دل سے زباں تک پہنچے
دل نے آنکھوں سے کہی، آنکھ نے دل سے کہدی
بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

یہ بات کے چل نکلنے کا نتیجہ ہی تو ہے کہ قرآن کی عظمت و صداقت کے معترف تو ایک طرف' اس آواز

کے شدید ترین مخالف بھی اپنے مواعظ اور تقاریر میں قرآن کی آیات، دین کی اصطلاحات اور نظامِ خداوندی کے استعارات، استعمال کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

جنابِ شیخ، وضو کے لئے سہی، لیکن
کسی بہانے لبِ جُو نکل ہی آتے ہیں

اس سے بھی بڑھ کر خوشی کا مقام یہ ہے کہ یہ آواز اب پاکستان کی حدود سے آگے نکل کر مغربی ممالک میں بھی پھیلتی جا رہی ہے۔

مغربی ممالک میں آواز

پچھلے سال میں نے آپ احباب سے ذکر کیا تھا کہ کس طرح ایک جرمن مصنف نے اپنی پاکستانی سیاحت کی روداد کے سلسلہ میں یہ لکھا تھا کہ یہاں ایک ہی تحریک قابلِ ذکر ہے اور وہ طلوعِ اسلام کی تحریک ہے۔ اب حال ہی میں ایک کتاب ہالینڈ سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب کا نام ہے (MODERN MUSLIM QURAN INTERPRETATION) اور مصنف کا نام (J. M. S. BALJON)۔ اس ابِ فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام میں قرآن کی جدید تعبیرات کی کوششیں کہاں کہاں ہو رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے پاکستان سے صرف دو مصنفوں کو منتخب کیا ہے۔ ایک علامہ مشرقی اور دوسرے آپ کا یہ رفیق ـــــ اس نے سلسلہ معارف القرآن اور سلیم کے نام خطوط وغیرہ کا براہ راست (اردو سے) مطالعہ کیا ہے اور اپنی کتاب میں اِن کے اقتباس پر اقتباس دیئے چلا جاتا ہے۔ وہ میری زندگی کے مختصر حالات بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ:

> پرویز کی خوبی یہی نہیں کہ اس نے قرآنی حقائق کی ایسی عمدہ تشریح کی ہے یا انہیں اس قدر بلند پایہ ادیبانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ وہ درحقیقت ایک عمدہ معلم ہے جسے فطرت نے نے اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا ہے اور ان نوجوانوں کے لئے جو مذہب سے برگشتہ ہو رہے ہیں اور ان کی زندگی کی کشتی کو لنگر کی ضرورت ہے، ایک مشفق دوست ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ جس موضوع پر بھی گفتگو کرتا ہے اس کے متعلق نہایت محکم اور آزاد رائے رکھتا ہے اور نہایت معقول نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں پر بڑی گہری نگاہ رکھتا ہے۔ اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اس کا اثر بڑھتا چلا جائے گا۔ (صہ ۱۵)

مصر سے آواز مصر کے علامہ سید احمد الحسینی کے مضامین کے تراجم، طلوعِ اسلام کی گزشتہ اشاعتوں میں آپ کی نظروں سے گزرے ہوں گے۔ ان مضامین کی کیفیت یہ ہے کہ اگر ان پر علامہ موصوف کا نام نہ لکھا ہو تو پہچانا نہ جاسکے کہ یہ مضامین خود طلوعِ اسلام کے ہیں یا ان کا لکھنے والا کوئی اور ہے۔ علامہ سیفی کے علاوہ مصر میں اور علماء بھی ہیں جو اسی نہج سے قرآن پر غور و فکر کرتے ہیں۔ ان ممالک، نیز یورپ اور امریکہ سے مطالبات موصول ہو رہے ہیں کہ طلوعِ اسلام کا لٹریچر انہیں بھیجا جائے۔ چنانچہ اب میں مغربی ممالک کی اہمیت کے پیشِ نظر اپنی بیشتر توجہ انگریزی لٹریچر کی طرف دے رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جب قرآن اپنی اصلی شکل میں ان ممالک کے اربابِ فکر و نظر کے سامنے آیا، تو وہ اس کا استقبال آگے بڑھ کے کریں گے۔ وہ اپنے غلط تصورات اور باطل نظامِ زندگی سے سخت تنگ آتے ہوتے ہیں اور کسی جدید نظام کے لئے بے حد مضطرب و بیقرار نظر آتے ہیں۔ مذہب ان کی تسکین نہیں کرسکتا — بلکہ سچ پوچھئے تو وہ مذہب کے ہاتھوں تنگ آکر ہی زندگی کی کسی نئی شاہراہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور یہ شاہراہ قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتی۔ کیا عجب ہے کہ اگر ان کے سامنے خدا کا دین اپنی حقیقی شکل میں آجائے تو جس آدمِ نو کے انتظار میں زمانے کی آنکھ بار بار اٹھ رہی ہے، اس کی نمود وہیں سے ہو جائے۔ میری تو کیفیت یہ ہے کہ

اسی امید پر بیٹھا ہوں سرِ راہ گزر
ہجر کی رات ہوتی ہے تو سحر بھی ہوگی

قرآن کا مطالبہ برادرانِ من! آپ نے قرآن کی آواز کو آگے بڑھانے کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کا میرے دل پر خاصا اثر ہے۔ آپ نے سخت نامساعد حالات میں اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کے باوجود اس دیئے کو اپنے خونِ جگر سے روشن رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ قرآنِ کریم ہم سے جو توقعات وابستہ رکھتا ہے ہم انہیں کماحقہٗ پورا نہیں کر رہے۔ یہ تو اس کی کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف ہے جو وہ ہمیں اپنے دامن سے جھٹک نہیں دیتا۔ ورنہ حق بات یہی ہے کہ ہم اس کے معیار پر پورے نہیں اترے۔ قرآن کو ہم سے بہت سے شکوے ہیں اور بالکل بجا شکوے۔

نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیم
وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گزار نہیں!

اس کے وابستگانِ دامن کو تو جان اور مال دونوں اس کے ہاتھوں بیچ دینے پڑتے ہیں۔ ہم اس سودے کا بیعانہ تک بھی ادا نہیں کر سکے۔ اس لئے میں آپ احباب سے درخواست کروں گا کہ آپ اس باب میں مزید ہمت کیجئے۔

عالمگیر انقلاب

انسانی تاریخ میں یہ وقت بڑا نازک آیا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں' قدیم تصوراتِ حیات' اور نظامہائے زندگی کا دور دورہ ختم ہو رہا ہے۔ ملوکیت، سرمایہ داری، مذہب' سب ایک ایک کر کے اُٹھتے اور مٹتے جا رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں۔

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

زمانے میں انقلابات اس تیزی سے آ رہے ہیں' یا کروٹیں بدل رہے ہیں' لیکن جس اُمت نے ایسے مقام پر کاروانِ انسانیت کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرنی تھی' اس کی اپنی حالت یہ ہے کہ

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ اُمت روایات میں کھو گئی

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے!
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے!

اس وقت لاؔ کی طوفانی قوتیں (کمیونزم وغیرہ) بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اگر الا اللہ کا تصور اس وقت سامنے نہ لایا گیا تو انہیں' اس کے بعد' ان کے مقام سے مٹانے' یا الا اللہ تک لانے میں نہ معلوم کتنا وقت لگ جاتے۔ اور انسانیت کو کتنا عرصہ اس جہنم میں گزارنا پڑے' جس میں وہ صدیوں سے پڑی جھلس رہی ہے۔ اس لئے'

الیکہ آسودہ نشینی لبِ ساحل برخیز
کہ ترا کار بگرداب و نہنگ است ہنوز

قرآن کی تو یہ کیفیت ہے کہ جب اس کی عظمت انسان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے تو یہ اس میں عجیب و غریب انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ حالات کی ناسازگاری اور زمانے کی مخالفت اس کے جذبۂ سرشاری کو تیز تر کر دیتی ہے۔

حدی را تیز تر می خواں

اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَہُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَکُمۡ فَاخۡشَوۡہُمۡ فَزَادَہُمۡ اِیۡمَانًا ٭ۖ وَّ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰہُ وَ نِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ ۔ (۳:۱۷۳)۔ یہ وہ صاحبانِ عزم و یقین ہیں کہ جب ان سے لوگ کہتے ہیں کہ دشمن نے تمہارے خلاف لشکرِ جرار جمع کر رکھا ہے اس لئے تمہیں اس سے ڈرنا چاہیئے، تو اس سے ان کے ایمان میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور دل کے پورے اطمینان سے کہتے ہیں کہ دشمن کا لشکر بڑا ہے تو ہوا کرے، ہمارے ساتھ اللہ کی تائید و نصرت ہے اور یہ وہ قوت ہے جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن سے شیفتگی انسان کو کسی مقام پر بھی دل گرفتہ نہیں ہونے دیتی۔ وہاں تو حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

مجھ کو اداس کر گیا جب کہ سلوکِ انجمن
اُٹھ کے نگاہِ دلبری، ہاتھ میرا دبا گئی

اس لئے برادرانِ گرامی قدر! وقت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنی کوششوں کو تیز تر کر دیجئے اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے پہلے سے بھی زیادہ جوش و انہماک کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جائیے۔

میں آپ سے جو کچھ کہہ رہا ہوں اے عزیزانِ من! ایک اور جذبہ بھی کارفرما ہے اور اگرچہ وہ کچھ ذاتی سا ہے لیکن میں اسے اپنے آپ سے خیانت سمجھتا ہوں کہ وہ دل میں بار بار ابھرے لیکن اُسے زبان تک نہ لاؤں۔ یوں تو میری صحت کبھی بھی اطمینان بخش نہیں رہی

میری بیماری

لیکن گزشتہ جنوری، ایک رات، ایک غیر متوقع بیماری کا ایسا شدید اور ناگہانی حملہ ہوا کہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر تکلیف کی شدت اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو میں شاید صبح تک زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ یہ زندگی کا ایک نیا تجربہ تھا جس میں موت محسوس طور پر سامنے نظر آ رہی تھی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ قرآنی پیغام کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں میرے پیشِ نظر پروگرام کا جو حصہ ابھی ناتمام ہے، میری للچائی ہوئی، بے بس نظریں اسے بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ طوفانی حملہ بخیریت گذر گیا لیکن اس کے بعد یہ احساس بڑی شدت اختیار کر گیا ہے کہ جو کام میرے سامنے ہے وہ کسی نہ کسی طرح میری

زندگی میں تکمیل تک پہنچ جاتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ آرزو بڑی حسین اور یہ تمنا بڑی معصوم ہے لیکن فطرت کے اٹل قوانین کسی حسین آرزو اور مقدس تمنا کی رعایت نہیں کیا کرتے۔ ہم تو کس حساب شمار میں ہیں اس باب میں تو اس ذاتِ اقدس و اعظم (صلے اللہ علیہ وسلم) تک سے بھی جس کی نظیر دنیا نے پھر نہیں دیکھی، یہ کہہ دیا گیا کہ وَ اِنۡ مَّا نُرِیَنَّکَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُہُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ (۱۳/۴۰) جن انقلابی تبدیلیوں کے متعلق ان لوگوں سے کہا جاتا ہے، ہو سکتا ہے کہ ان میں بعض تیری زندگی میں سامنے آجائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تیری وفات اس سے پہلے ہی ہو جائے۔ تمہیں اس کی فکر نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ کب رونما ہوتی ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اس پیغام کو ان لوگوں تک پہنچاتے جاؤ۔ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم دیکھیں کہ اس کے نتائج محسوس شکل میں کب سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا یہ تو نہ میں کہہ سکتا ہوں نہ کوئی اور، کہ جو پروگرام میرے پیشِ نظر ہے اس کی تکمیل میری زندگی میں ہو جاتی ہے یا نہیں۔ لیکن جی ضرور یہ چاہتا ہے کہ کسی حد تک ہی سہی، اس کی تکمیل میرے سامنے ہو جائے۔ آپ احباب نے اس وقت تک میرے پروگرام کی تکمیل کے لئے جس مخلصانہ رفاقت کا ثبوت دیا ہے اس کا گہرا نقش میرے دل پہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ جیسے رفقائے سفر ہر رہروِ حیات کے نصیب کرے۔

میری آرزو

میرا پروگرام یہ ہے کہ اس پیغام کو مغربی ممالک تک پہنچانے کے بعد ایک ایسی درسگاہ قائم کی جائے جس میں نونہالانِ ملت کی تعلیم و تربیت خالص قرآنی خطوط پر ہو اور وہ اس قابل ہو سکیں کہ اس چراغ کو بدستور روشن رکھیں۔ اور میں مرتے وقت ان سے کہہ سکوں کہ۔

بگیراں ہمہ سرمایۂ بہار از من!
کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

کس قدر پُرسکون ہوگی ایسی موت، جس پر دیکھنے والا بے ساختہ پکار اٹھے کہ

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیرِ عشق یافت
مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

(۰)

آخر میں، عزیزانِ گرامی قدر! میں ایک ایسے نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں جسے اچھی طرح

نہ سمجھنے سے کئی ذہنوں میں پریشانی، اور بعض دلوں میں افسردگی تک پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ ہم اتنے عرصے سے اس آواز کو بلند کر رہے ہیں لیکن لوگ اس طرف بہت کم متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں دوسری جماعتوں کو دیکھئے تو ان کے پیچھے لاکھوں افراد نظر آتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے۔ ہماری برسوں کی تگ و تاز سے، گنتی کے افراد ہمارے شریکِ سفر ہوئے ہیں۔ اور مذہب پرست طبقہ کی ایک آواز پر لاکھوں افراد ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس کی بین وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرتے ہیں اور آپ اس کے چڑھاؤ کی طرف جاتے ہیں۔ وہ لوگ عوام کو انہی باتوں کی دعوت دیتے ہیں جنہیں وہ پہلے سے مان رہے ہیں، اور آپ انہیں ان راستوں پر چلنے سے روکتے ہیں جن پر وہ صدیوں سے آنکھیں بند کر کے چلے آ رہے ہیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ آپ ذرا غور کیجئے کہ بنی اسرائیل کی طرف خدا کے دو جلیل القدر نبی ——— حضرت موسےٰ اور حضرت ہارونؑ ——— مبعوث ہوتے ہیں۔ وہ برسوں تک ان کی تعلیم و تربیت میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ

گوسالہ سامری

صرف اس قدر نکلتا ہے کہ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰىٓ اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ (۱۰/۸۳) ان پر قوم کے چند نوجوانوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ اس کے برعکس سامری انہیں ایک بت تراش کر دیتا ہے اور ساری قوم اس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ اس میں سامری کی کاریگری اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ اس نے قوم کی نفسیات کا مطالعہ کیا اور گوسالہ پرستی کے جو جذبات ان کے دل کی گہرائیوں میں پہلے سے موجود تھے، ان کی تسکین کا سامان فراہم کر دیا۔ یہی ہر زمانے کا سامری کرتا ہے۔ وہ قوم کی خوئے بت پرستی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ان کے ذوقِ عبودیت کی تسکین کے لئے ایک نیا بت تراش کر دے دیتا ہے اور خود اس بتکدہ کا پجاری (مہنت) بن جاتا ہے۔ وہ اس بت تراشی میں بھی ایک پائی اپنی جیب سے خرچ نہیں کرتا۔ وہ قوم ہی کے زیوروں کو ڈھال کر انہیں ایک بت بنا کر دے دیتا ہے۔ جب تک قوم میں خوئے بت پرستی موجود ہے، کسی بت ساز کو بھی پجاریوں کی کمی کی شکایت نہیں ہو سکتی۔ ہر بتکدہ آباد ہو گا۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ جس بت خانے کا مہنت زیادہ شاطر اور چالاک ہو گا، اس میں چڑھاوا زیادہ چڑھے گا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے ہاں پہلے سے اس قدر خانقاہوں، درگاہوں اور مقبروں کی موجودگی کے باوجود ہر نئی قبر پر کس دھوم دھام سے میلہ لگتا ہے۔ اس میلے کی رونق کا راز، اس قبر کی جاذبیت میں نہیں، بلکہ قوم کی خوئے بت پرستی میں مضمر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص قوم

کے دل سے بت پرستی کے جذبات نکالنا چاہتا ہے اس کی منزل بڑی کٹھن اور اس کے راستے بڑے پُرخار ہوتے ہیں۔ دین اور مذہب کی یہی وہ کشمکش ہے جس میں صاحب ضرب کلیمؑ کا ساتھ تو قوم کے چند افراد دیتے ہیں اور سامری کے پیچھے ساری قوم لگ جاتی ہے۔ یہی چار ہزار سال پیشتر ہوتا تھا اور یہی آج ہو رہا ہے۔ اس لئے برادرانِ من! آپ نہ تو اپنی دعوت کے نتائج کی سُست رَوی سے گھبرایئے اور نہ ہی سامریانِ عصرِ حاضر کی کامیابی کو ان کے مسلک کی صداقت کی علامت سمجھئے۔ آپ صرف یہ دیکھئے کہ آپ کی دعوت اُس پیغام کی نقیب ہے یا نہیں جسے خدا کی کتاب پیش کرتی ہے۔ اسے قدم قدم پر جانچتے رہیئے اور اس کی خاص احتیاط برتئے کہ اس دعوت کی کامیابی کے لئے کوئی طریق ایسا اختیار نہ کیا جائے جو ضابطۂ خداوندی کے نزدیک پسندیدہ نہ ہو۔ یاد رکھئے! اس تحریک کی کامیابی کے لئے اگر آپ کا ایک قدم بھی غلط اٹھ گیا تو وہی آپ کی شکست اور ناکامی کا مقام ہوگا۔ اور اسے بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس راستے میں سب سے زیادہ گراں بہا متاعِ سفر اور محکم ترین سامانِ حفاظت، آپ کی سیرت کی بلندی اور کیریکٹر کی پختگی ہے۔ آپ کی کامیابی کا سب سے بڑا راز، آپ کی اپنی ذات کے ساتھ دیانت اور دوسروں کے ساتھ حسنِ معاملہ میں پوشیدہ ہے۔ اگر آپ نے اپنے اندر یہ جوہر پیدا کر لئے تو پھر آپ کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ کہ

جہادِ زندگی میں ہیں یہی مردوں کی شمشیریں!

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔

پرویز

دوسرا اجلاس

پرویز صاحب کا خطاب

شام کو چار بجے کنونشن کا دوسرا عام اجلاس شروع ہوا۔ اس میں پرویز صاحب کے خطاب کا عنوان تھا ــــ انسان اور جنگ۔

وہ اسٹیج پر آئے۔ حاضرین کی خدمت میں سلام و رحمت کا ہدیہ پیش کیا۔ اور پھر گل افشانی گفتاریوں شروع ہوئی۔

"انسان بھی اک طرفہ تماشہ ہے۔ اسے عبادت گاہوں میں محوِ عبادت دیکھ کر آسمان کے فرشتے اس کے ذوقِ عبودیت پر نثار اور حوریں اس کی جھکی ہوئی پیشانی پر تصدق ہوتی ہیں۔ اور اسے حیرت خانۂ علوم و فنون میں سرگرمِ تحقیق دیکھو تو مہر و ماہ و انجم پر کمندیں ڈالتا، زہر سے تریاق بناتا اور پتھر کو آئینہ میں ڈھالتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن یہی انسان جب نشۂ نخوت میں چور اپنے جیسے انسانوں پر بپھرتا ہے تو آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور ایوانِ تمدن خاک بسر نظر آتا ہے۔"

ادب کے طالب علم کے نقطۂ نظر سے اس تمہید کو دیکھیئے تو ہر لفظ بقول غالب گنجینۂ معنی کا طلسم نظر آتا ہے۔ اور قرآن کے آئینے میں دیکھیئے تو "احسن تقویم اور اسفل السافلین" کی گرہ کھل جاتی ہے۔ آدمی تو ایسا محشرِ خیال و عمل ہے کہ ہر تضاد اس کی ذات میں جمع ہو جاتا ہے۔

اس حسین و نظر نواز و دل کشا تمہید کے بعد پرویز صاحب نے بتایا کہ علم و فن کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کی تخریب کاری کس طرح بڑھ رہی ہے اور جنگ کے خوف سے سہمی ہوئی اس دنیا کے لئے قرآن کے دامن میں ان کی کیسی نوید جانفزا ہے۔ یہ دین جس کا نام ہی اسلام ہے، جنگ کے خلاف سب سے بڑی ضمانت ہے۔ قرآن فساد کو بدترین لعنت قرار دیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرہ کی سلامتی سے کسی کو کھیلنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ حسن کارانہ انداز میں برائی کو بھلائی میں بدلنے کی کوشش کی جائے، لیکن اگر ضروری ہو تو سزا دی جائے۔ مگر سزا جرم سے بڑھنے نہ پائے، کیونکہ عدل ایک مستقل قدر ہے۔ ظلم کا بدلہ لینا ظلم نہیں ہے، بلکہ تقاضائے عدل کو پورا کرنا ہے اور اس تقاضے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حصولِ قوت لازم ہے۔ مسلمان تو ہر مظلوم کی حمایت کو اپنا مقصدِ حیات سمجھتا ہے۔

ان تصریحات کے بعد پرویز صاحب نے فلسفۂ جہاد اور شرائطِ جہاد کو قرآن کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ اور قرآن کی روشنی ہی میں بحث کی تکمیل یوں کی کہ جہاد کا مقصدِ اول و آخر یہی ہے کہ "ایسا معاشرہ وجود میں آئے جہاں جنگ کا امکان ہی نہ ہو۔ اور جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے" ــــ یہ بات نظریاتی

وحدت کی بنیادوں ہی پر ممکن ہے۔

میں نے اسلام کے بڑے بڑے نکتہ دانوں کے ہاتھوں پر ذکرِ جہاد کے ساتھ پسینہ دیکھا ہے اور گفتگو میں معذرتی انداز ـــــ لیکن پرویز کی تقریر "اپالوجی" نہ تھی، فلسفۂ جہاد کی تفسیر تھی ـــــ دین پر یہ استحکام اور ایمان قرآن کے چشمۂ آبِ حیات کے سوا کسی اور در سے نہیں مل سکتا۔ وہ چشمۂ آبِ حیات جس کی ہر بوند اسوۂ حسنہ نبویؐ کے سانچے میں ڈھل گئی ـــــ وہ دینؐ جسے ہر دین پر غالب آنا ہے، جسے انسانی تفرقوں کو مٹانا ہے، جسے ہر انسان کو معبودانِ باطل کے اقتدار سے نجات دینا ہے ـــ وہ جنگاہ میں بھی نظر آئے گا۔[1]

مجلسِ استفسارات

۱۲ اپریل، رات کو ساڑھے ۹ بجے "مجلسِ استفسارات" شروع ہوئی۔ غالباً یہ مجلس سالانہ کنونشن کے ایک مستقل شعبہ (سیکشن) کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی افادیت سے بھلا کون انکار کرے گا۔ پرویز صاحب کے خطابات تو ہر سال دو تین مخصوص موضوعات پر ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ کتنے ہی سوالات رفیقوں کے ذہنوں میں نشتر کی طرح چبھتے رہتے ہیں اور وہ اس ساعت کا بے چینی سے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ان سوال کرنے والوں میں وہ حضرات بھی ہوتے ہیں جو بقولِ خود پرویز صاحب کو "آکورڈ سیچوایشن" میں ڈالنا چاہتے ہیں ـــ ایسے سوالات ہمیشہ اسی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ "موسیقی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے" "آپ فلم کیوں دیکھتے ہیں؟ کیا آپ تین نمازیں پڑھتے ہیں؟" وغیرہ وغیرہ۔

آج کی مجلس کے لئے بیشمار سوالات موصول ہوئے تھے۔ پرویز صاحب نے ڈھائی گھنٹوں میں ستائیں سوالوں کے جوابات دیئے۔ ہر جواب مختصر لیکن مکمل ـــ اگر ضد نہ ہو اور خوئے بد نہ ہو تو یہ جواب کسی مزید وضاحت سے بالاتر ہیں۔ وقت کی تنگی اور سوالات کی تعداد کے پیشِ نظر جواب دینے سے پہلے پرویز صاحب نے اس بات کو واضح کر دیا کہ انہیں سوالوں کے جوابات دیئے جائیں گے جو اہم ہوں جن کا عملی زندگی سے

---

[1] یہ خطاب پرویز صاحب کے مجموعہ مضامین "بہارِ نو" میں شائع ہو چکا ہے۔

تعلق ہو اور جن میں فرقہ داریت نہ ہو۔ پیر دبیز صاحب نے واضح الفاظ میں یہ بات ایک بار پھر کہہ دی کہ میں قرآن حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ میں نے کبھی یہ دعوٰے نہیں کیا کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ سہو سے بالاتر ہے اور حرف آخر ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ بھی براہ راست کتاب حکیم کا مطالعہ کریں۔ اور قرآن کی بارگاہ میں خود پہنچ جائیں۔

ان سوالات اور ان کے جواب کا اس مقام پر پیش کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ فی البدیہہ ہوتا ہے۔ صرف دو ایک سوالات پیش خدمت ہیں [1]:

سوال :- امریکہ اور روس کے نظام میں سے کون سا نظام بہتر ہے؟

جواب :- اونٹ سے کسی نے پوچھا۔ چڑھائی بہتر ہے یا اتار؟ اس نے کہا، بر ہر دو لعنت۔ قرآن کا نظام دونوں سے مختلف ہے۔ وہ ان میں سے کسی سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

سرمایہ دارانہ نظام نے خدا کو ٹھیکہ (EXTRA) بنا رکھا ہے جس کے نام کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ورنہ اگر کسی کا خدا پر ایمان ہو تو اس کا نظام غیر خدائی خطوط پر کیسے قائم ہو سکتا ہے؟

سوال :- مسلمانوں میں غیر اسلامی رسوم بڑے بڑے علماء کی موجودگی میں کیسے رائج ہو گئیں؟ [2]

جواب :- عہد کہن کو چھوڑیئے۔ یہ پچھلے مہینے ہی جو رسم پیدا ہوتی ہے، یہ کیسے پیدا ہو گئی۔ تواتر کے بعد یہی رسم "دین" میں شامل ہو جائے گی۔ دین ہمیں عقل و براہین کے پیچھے چلاتا ہے اور مذہب عوامی جذبات کے پیچھے چلتا ہے ؎

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

---

[1] مجلس استفسارات ہر کنونشن میں منعقد ہوتی ہے لیکن چونکہ سوال و جواب کا سلسلہ برجستہ اور فی البدیہہ ہوتا ہے، اس لئے انہیں کبھی طلوع اسلام میں درج نہیں کیا جا سکا۔ اس کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔

[2] غلاف کعبہ کے جلوس۔

سوال :۔ فلاں صاحب نے کہا ہے کہ بنیک کا سود "ربو" نہیں ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟
جواب :۔ میرا خیال نہ پوچھیے، قرآن کا نقطۂ نظر پوچھیے۔ سود کا مسئلہ عرصہ سے الجھا ہوا ہے۔ "بنیک کا سود جائز ہے"۔ "ناجائز ہے"۔ کمرشل سود جائز ہے"۔ "ناجائز ہے"۔ یہ مختلف آوازیں سنائی دیتی ہیں اور پھر یہ سوال کہ بین الاقوامی تجارت اور بینکنگ کا کیا ہوگا!
آپ اسلامی نظامِ معیشت کا غیر اسلامی نظام کے ساتھ پیوند نہ لگائیے۔ "ربوٰ" کا ترجمہ "سود" اور " INTEREST " کرنا ہی بنیادی غلطی ہے ۔۔۔ ہم عجب تضاد کے دور سے گزر رہے ہیں۔ کسی کسان کو ہزار روپے قرض دے دیجیے اور دس روپے زائد لے لیجئے یہ حرام ہے۔ لیکن زمین خود خرید لی اور کسان کو بٹائی پر دے کر اس کی محنت کے ثمرہ سے خود لطف اندوز ہوتے، یہ حلال ہے۔ اور پھر سلیپنگ پارٹنر شپ"۔ جی ہاں! انگریزی میں کہہ دیا تو حلال ہوگیا۔ "ربو" کے معنی ہیں بڑھوتی ۔۔۔ اور قرآن کا فیصلہ ہے۔

لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ

ڈھائی گھنٹے میں پرویز صاحب نے ، ۲۰ سوالوں کے جواب دیئے۔ قرآنی نقطۂ نظر، علمی بصیرت اور برمحل و باموقع مزاح نے مختلف سوالوں کو جیسے کسی ایک لڑی میں پرو دیا۔ ویسے بھی زندگی ایک وحدت ہے ۔۔۔ ایک اکائی ۔۔۔ ہمہ رنگی میں یک رنگی ، کثرت میں وحدت ۔۔۔ یہ ہے زندگی ۔۔۔ زندگی کے مسائل بھی حقیقت شناس ذہنوں سے تابندگی و درخشندگی نہیں چھین سکتے۔ ذہن کی یہ تابندگی مزاح کہلاتی ہے ایمان سے کہیے گا۔ کبھی کسی مولوی کو بھی آپ نے مسکراتے دیکھا ہے ؟ ۔۔۔ ذہن کے خیمہ کے لئے مزاح زربفت و کمخواب کی قنات کا درجہ رکھتا ہے۔ اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مذہبِ مُلّا و فقیہہ میں زربفت و کمخواب حرام ہیں۔ وہ انسان جو آگہی کا باب اور مقصودِ عرش ہے، وہ بے چارا حسن کارانہ زندگی بسر کرنے کا حق بھی نہیں رکھ سکتا۔

اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ پرویز صاحب کو قرآن پر کس قدر عبور حاصل ہے، فطرت نے انکی نگاہ میں کس قدر وسعت، ذہن میں کس قدر جودت اور الفاظ پر کس قدر قدرت عطا کی ہے تو میں ان سے کہونگا کہ وہ ان کی ایک مجلسِ استفسارات میں شریک ہوجائیں، اس کے بعد انہیں کسی دلیل اور شہادت کی ضرورت نہیں رہے گی۔

---(۰)---

آخری اجلاس

۱۴ اپریل کی شب کے کھلے اجلاس میں پرویز صاحب کے خطاب کا موضوع تھا — "انسان کے بنیادی حقوق" — اس خطاب میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ انسان نے مختلف ادوار میں اپنے لیے کیا حقوق مانگے۔ انسانوں نے انسانوں کو کیا حقوق دیئے۔ اور قرآن کیسے اہم، عظیم اور انسانیت ساز حقوق عطا کرتا ہے۔ قرآنی ریاست کا معاہدہ عمرانی یہ ہے کہ انسان اپنی جان و مال خدا کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اور خدا اسلامی معاشرہ کے ذریعہ انسانوں کو "الجنۃ" سے نوازتا ہے۔ اس اصطلاح میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کی انسان آرزو کرتا ہے۔

اسلامی ریاست میں انسانوں کے اہم بنیادی حقوق کی ایک ایک کر کے پرویز صاحب نے تشریح کی۔ "یہ حقوق کیا ہیں؟" "احترامِ آدمیت"، "جنسی مساوات"، "اعمال و کردار کی بنیاد پر مراتب کا تعین"، "حقِ آزادی"، "محنت کا حق"، "عدل"، "احسان"، "رزق کا حق"، "جان اور عصمت کا تحفظ"، "حقِ نکاح"، "ذوقِ جمال کی تسکین"، "مذہبی آزادی"، "سچی بات کہنے کا حق"، "مظالم کی فریاد کرنے کا حق"، "رازوں کی حفاظت کا حق"، "حیثیت عرفی کا حق"، اور "خوف و حزن سے آزادی" — ایک ایک شق پر نظر ڈالیئے تو اندازہ ہوگا کہ وحیِ الٰہی انسانوں کے راستوں کو کس طرح منور کرتی ہے۔ انسان تجربات سے گزرتا ہوا اس منزل تک آیا ہے کہ چند بنیادی حقوق کا اسے احساس ہوا ہے۔ مگر "ذوقِ جمال کی تسکین"، "عدل"، "احسان" اور ایسے ہی کتنے حقوق ابھی تک اس کی ذہنی دسترس سے باہر ہیں — (ان کی تفصیل پرویز صاحب کے خطاب میں ملاحظہ ہو جو ان کے مجموعہ مضامین — "بہارِ نو" — میں چھپ چکا ہے۔)

پرویز صاحب کے اس خطاب کو سنتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے کان آنکھیں بن گئے ہیں جو قرآنی معاشرہ میں ان حقوق کو محسوس طور پر دیکھ رہے ہیں۔ اور جیسے "ایلائے حق" محلِ تقریر نہیں ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ پرویز کا کمال نہیں۔ قرآنِ حکیم کا اعجاز ہے جو اپنے وابستگانِ دامن کو اپنے کرم بے حساب سے نوازتا ہے۔ قرآن کی بارگاہ میں اپنے دل کو لوحِ سادہ کی طرح پیش کرنے والوں کو خدائے ذوالجلال اس مقام تک پہنچا دیتا ہے جہاں ان کی فکر سے ہر گوشۂ حیات، دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کی طرح چمک اٹھتا ہے۔ اور زندگی کے موسم میں ان کی تحریر و تقریر سے

اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ قرآنی افکار کی ادنےٰ سی چھوٹ آدمی کو علم و فکر کا شہریار بنا دیتی ہے۔ اور ہر لفظ میں مکتبِ خیال کی وسعتیں سمٹ آتی ہیں۔ ذرّہ میں صحرا اور قطرہ میں دجلہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ کانٹے، جلوۂ گل کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ سب سے بڑی چیز یہ اندازِ نظر ہی تو ہے جو افکار کو جنم دیتا ہے۔ ؎

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

قرآن اپنے طالب علموں اور عاشقوں کو اس سطح بلند پر پہنچا دیتا ہے جہاں ان کے بارے میں بیساختہ زبان کہہ اٹھتی ہے کہ ؎

آواز جاں نواز، ترنّم جہاں فروز
تیور تمام ساز، تکلّم تمام سوز
دانش مہ دو ہفتہ، نظر مہر نیمروز
تقریر فہم باف، خموشی خیال سوز

یہی وہ کتابِ عظیم ہے جس نے حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک کو وحی الٰہی کا لباسِ کامل بنا دیا تھا۔ اور سقراط و ارسطو عرب کے اس "اُمّیؐ" کے مکتب کے "طفلِ ناداں" معلوم ہوتے تھے۔ یہی وہ کتابِ مقدس ہے جس نے عربوں کو علوم و فنون کی نشاۃ الثانیہ کا وسیلہ بنا دیا۔

(٠)

الوداعی اجلاس

پیرِ مغاں کا الوداعی پیغام

الوداعی اجلاس میں پرویز صاحب اپنے رفیقوں کو الوداع کہنے کے لئے کھڑے ہوئے تو انہوں نے فرمایا: میری صحت ویسے تو کبھی تسلی بخش نہ تھی، لیکن اس جنوری کی ایک رات کو جب موت محسوس شکل میں اپنے سرہانے کھڑی نظر آئی تو میری آرزوئیں بے بس نظر سے اسے دیکھ رہی تھیں ــــ آرزوئیں جو ذاتی نہ تھیں۔ پہلی آرزو مفہوم القرآن کی تکمیل، دوسری آرزو آپ سے ایک بار پھر ملنے کی تمنا اور تیسری آرزو ایک درسگاہ کا قیام

جسے میں مدت سے اپنے دل میں پال رہا ہوں۔ ایک ایسی چھت کی خواہش جس کے تلے میں اپنی قوم کے بچوں کو لے کر بیٹھ سکوں اور قرآنی خطوط پر انہیں تعلیم دی جا سکے۔ ان بچوں کے ساتھ میری یہ محبت جذباتی نہیں ہے۔ آپ ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کل کر چکے ہیں۔ اگر ہم ان کی تربیتِ ذہنی کا انتظام کر سکیں تو یہ کائنات کس طرح جگمگا اُٹھے۔

• میں اس تمنا کو ہونٹوں تک نہ لاتا تھا کہ شاید یہ ہماری بساط سے بڑھ کر ہے۔ مگر آج آپ نے اس تمنا کو حقیقت میں بدلنے کا آغاز کر دیا ہے۔ میں اپنی اس سعادت پر جس قدر ناز کروں کم ہے کہ آپ جیسے رفیق مجھے نصیب ہوتے ہیں۔ آپ کے ہاتھوں ایسی درسگاہ کا قیام عمل میں آئے گا جو اس دور میں قرآنی فکر کا مینارۂ نور ہوگی۔ آپ جب اگلے سال تشریف لائیں گے تو دیکھیں گے کہ آپ کا عزم، عمل کے مرحلوں سے کس تیزی کے ساتھ گزر رہا ہے۔

اچھا رفیقو! — الوداع — آپ جا رہے ہیں۔ خدا حافظ! میں سال بھر آپ کے نقوشِ پا سے باتیں کرتا رہوں گا۔

• کنونشن سے چند دن پہلے جب میں ۲۹ ویں پارے کا مفہوم لکھ رہا تھا تو وہ آیتِ قرآنی سامنے آئی جس میں حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ جب تم قرآن اُن کے سامنے پیش کرو گے تو یہ آنکھیں نکال کر اور یوں گھور کر دیکھیں گے کہ تم اپنے مقام سے پھسل پڑو۔ یہ ہے ان کی تمنا — لیکن جب تم استقامت کے ساتھ اپنے مقام پر کھڑے رہتے ہو تو یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ تو دیوانے ہیں۔

• رفیقو! ایسی دیوانگی پر ہزار فرزانگی نثار۔ ہم اس دیوانگی کو اپنی نجات کے لئے سند سمجھتے ہیں۔ اس تمغہ سے اللہ کے عظیم ترین رسولؐ کو نوازا گیا تھا۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہمیں بھی اس سنتِ نبویؐ کے اتباع کی سعادت نصیب ہوئی۔

برادرانِ من! آپ کے لئے میرا الوداعی پیغام یہی ہے کہ قرآن حکیم سے ایسی شیفتگی پیدا کیجئے کہ لوگ آپ کو دیکھ کر کہہ اٹھیں — "یہ ہیں قرآن کے دیوانے" — شعائرِ اسلام اور ارکانِ اسلام کو اختیار کیجئے۔ یہ ارکان "قیامِ نظامِ صلوٰۃ" کا اشارہ ہیں۔ یہ ہمیں اپنے مقصدِ جلیلہ کی ہر دن یاد دہانی کراتی ہیں۔

اللہ آپ کو سیرت اور کردار کی وہ بلندی عطا فرمائے کہ آپ کے کردار سے معاشرہ اسلامی رنگ

میں ڈوب جاتے۔ رب ذوالجلال والاکرام آپ کی آرزوؤں کو کامگار فرماتے"۔

یوں طلوعِ اسلام کی ساتویں کنونشن ختم ہوئی ــــ یہ کنونشن جو آٹھویں کنونشن کا پیش خیمہ ہے۔ جس نے قرآنی درسگاہ کو خیال سے عمل کی دنیا میں پہنچا دیا۔ جس کی تقریریں اور خطابات چراغِ راہ کی طرح روشنی دکھاتے رہیں گے ــــ اس کنونشن پر اس تبصرہ کے ساتھ میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں کہ ؎

ان میں لہو ہمارا جلا ہو کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

حرفِ دل نواز[1]

طلوعِ اسلام کی آٹھویں کنونشن

منعقدہ ۲۵/بی گلبرگ لاہور

۱۲ تا ۱۵ نومبر —— ۱۹۶۴ء

(رُوئیداد۔ ماخوذ از طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۶۴ء، جنوری ۱۹۶۵ء)

---

[1] غزل سرائے، نوا ہائے رفتہ باز آور
بایں فسردہ دلاں حرفِ دل نواز آور

اِبتدائیہ

نکہت فشاں ہوئی ہے گلستاں کی کائنات
پھولوں کو چوم چوم گئی بادِ التفات!

زندگی کی گذرگاہوں پر بڑھتے ہوئے قوموں اور امتوں کے رواں دواں قافلوں کو دیکھیے، تو ان میں ایک مختصر سا کاروانِ شوقِ قرآنی فکر کے ان طائرانِ پیش رس کا بھی نظر آئے گا، جو قرآن کی دعوتِ انقلاب کا پرچم فضاؤں میں بلند کئے آہستہ آہستہ اپنی منزلِ مقصود کا رُخ کئے ہوئے ہیں۔ اس کاروانِ شوق کی راہ کس قدر کٹھن ہے، اس کے قدموں میں کس قدر کانٹے بچھا دیئے گئے ہیں۔ مخالفت کی کیسی کیسی تند آندھیاں ان کے عزم اور ولولوں کو ناکام بنانے کے درپئے ہیں، بہتان طرازیوں اور افترا پردازیوں کے کیسے کیسے طوفان ان کی حسین اُمنگوں اور آرزوؤں کے خلاف حرکت میں لائے جا رہے ہیں۔ یہ ساری داستانِ ابتلاء و آزمائش ایک طرف اور افرادِ کارواں کی ہمت و جرأت اور جذبۂ استقامت دوسری طرف۔ تاریخ کے مؤرخ سے پوچھئے کہ یہ سب کچھ کیا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ کیا یہ اسی کشمکشِ حق و باطل کے سلسلۂ دراز کی ایک نئی کڑی نہیں جس کی داستانیں تاریخ کے اوراق اور قرآن کی دفتین میں محفوظ چلی آ رہی ہیں؟

اور مؤرخ کا قلم بتلائے گا کہ یہ اپنی نوعیت کی کوئی نئی داستان نہیں۔ اس کشمکش کا آغاز تو

اسی دن ہوگیا تھا جب وحیِ آسمانی کے پہلے علمبردار نے بھٹکتی ہوئی نوعِ انسانی کو سب سے پہلے اس کی حقیقی منزل کا سراغ دیا تھا۔ اللہ کے خلیل ابراہیمؑ نے کون سی مضرت رساں بات کہی تھی جو اپنے اور بیگانے ان پر خدا کی زمین تنگ کرنے کے درپے تھے۔ صاحبِ ضربِ کلیمؑ نے کون سا قابلِ اعتراض قدم اٹھایا تھا کہ بیگانے اور یگانے سب ان کے پاؤں کے کانٹے بن گئے تھے۔ مسیح علیہ السلام نے کس کو دکھ پہنچایا تھا کہ ملوکیت اور پیشوائیت دونوں نے انہیں تختۂ دار پر لاکھڑا کرنے کی ٹھان لی تھی۔ حضور رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم نے کون سی ایسی روش اختیار کی تھی جس کی بنا پر غیر تو غیر اپنے خاندان کے اعزا واقربا تک ان کے خون کے پیاسے بن گئے تھے۔

طلوعِ اسلام کا قافلہ بھی پہلے دن سے اسی قسم کی نازک صورتِ حال کا شکار چلا آرہا ہے۔ لیکن باطل کی یورشیں جس طرح تاریخ کے ہر دور میں ذلت، شکست اور نامرادی سے دوچار رہیں، اسی طرح اب بھی ان کا وہی حشر ہو رہا ہے۔ قرآنی فکر کا چراغ مخالفت کی جن آندھیوں کے حصار میں ہے، وہ اب بھی حسرت وناکامی میں سر پھوڑ رہی ہیں۔ اور یہ چراغ تاریکیوں کے ہجوم میں اپنی روشنی برابر پھیلاتے چلا جا رہا ہے۔ قرآنی فکر کی یہ کشتِ نو بہار برابر پھولے پھلے جا رہی ہے۔ اور اس کی دل کشائیاں ہر قلبِ سلیم کو اپنے دامنِ اخوت میں سمٹاتے چلی جا رہی ہیں۔

طلوعِ اسلام کنونشن کا حالیہ سالانہ اجتماع تاریخِ انسانی کی اسی درخشندہ حقیقت کا ایک عکسِ جمیل بن کر منظرِ نگاہوں کے سامنے آیا اور جذب ومستی کی وادیوں میں ایسے گہرے نقوش چھوڑ گیا جو کاروانِ شوق کے ذوقِ سفر کو ہمیشہ نئی امنگوں اور تازہ ولولوں سے مالا مال کرتے رہیں گے۔

میرِ کارواں کے "حرفِ دلنواز" کی اثر انگیزیوں کی تو بات ہی کیا، ان کے رفقائے سفر، ان کے سلیم بیٹوں اور ان کی طاہرہ بہنوں اور بیٹیوں نے اس کنونشن میں فکر وبصیرت کے سوز وساز سے جو دیپ جلائے ان کی لو سے کتنے ہی دل پگھل پگھل کر اشکبار پلکوں پر آ گئے۔ شدتِ تاثیر سے بار بار آنسوؤں کی جھڑیاں لگتی رہیں اور ایک دنیا نے یہ محسوس کیا کہ داخلی اور خارجی مخالفتوں سے کچھ بھی تو نہیں بگڑا بلکہ ہوا یہ کہ

ٹھہرے نہیں موسمِ گل کے قدم، قائم ہے جمالِ شمس و قمر
آباد ہے وادی کا کل دل، شاداب و حسیں گلگشتِ نظر

یہی وہ طلوعِ اسلام کنونشن جس کے حیات آفریں اجلاس مسلسل چار روز ۲۵/بی گلبرگ اور اس سے متصل بنگلوں کی وسعت میں اپنی مخصوص دلکشائی اور قرآنی فکر کے حسنِ زیبائی سے موجبِ شادابیٔ قلب نگاہ بنے رہے۔

سالانہ کنونشن کے انعقاد کا مسئلہ بعض اوقات ایک دردِ سر بن جاتا ہے اور مجلسِ استقبالیہ اس بار بھی کسی موزوں جگہ کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ لیکن میر کارواں کا حسنِ انتخاب کام آگیا اور یہ طے پاگیا کہ اس دفعہ ایک نئی صورت اختیار کی جائے۔ گلبرگ کالونی کو پاکستان کی نوآباد بستیوں میں جنت نگاہ کی سی قابلِ رشک حیثیت حاصل ہے۔ اسی کالونی کے سب سے پُر رونق بی بلاک میں مفکرِ قرآن کی وہ قیام گاہ واقع ہے[1] جو دعوتِ قرآنی کے ہزاروں شیدائیوں کے لئے جو پاکستان اور بیرونِ پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں، قلب و نگاہ کی دلکشی کا سامان لئے ہوئے ہے۔ اس قیام گاہ کے ساتھ ہی ایک قطار میں ملحقہ دو اور بنگلے ہیں انہیں ساتھ ملا لیا گیا۔ اور یوں ایوانِ کنونشن، مہمان کیمپ، طعام گاہ، ٹی سٹال اور بک سٹالوں کے لئے حسبِ ضرورت جگہ میسر آگئی۔

۱۰ نومبر کی صبح کو ہی کنونشن کے پنڈال اور مہمان کیمپ وغیرہ کے انتظامات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پنڈال کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے . . . . ملحقہ بنگلے کی درمیانی دیوار ہٹا دی گئی اور ۱۱ نومبر کی صبح کو ایوانِ کنونشن، مہمان کیمپ اور دیگر ضروری انتظامات حسن و خوبی سے تکمیل پا رہے تھے حسبِ ضرورت چھوٹا سا خوبصورت پلیٹ فارم بھی شام تک مکمل ہو گیا۔ اور ۱۲ نومبر کی صبح کو جب نمائندگان کی آمد آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر شے اپنے اپنے مقام پر بڑے قرینے سے سجی سجائی اور تیار نظر آرہی تھی۔

دن ڈھلنے تک ملک کے گوشے گوشے سے نمائندوں کی آمد کا سلسلہ برابر جاری تھا اور دوپہر کے کھانے پر ان کی اکثریت طعام گاہ میں ایک دوسرے سے گلے مل کر سابقہ کنونشنز کی سہانی یادوں

---

[1] خود ادارہ طلوعِ اسلام کا دفتر بھی اسی میں ہے۔

کو تنرو تازگی عطا کر رہی تھی۔
اسی شب کو حسبِ معمول تعارفی اجلاس ہوا۔

پہلا اجلاس

۱۴ نومبر کو نو بجے صبح اس روز کی پہلی نشست ایوانِ کنونشن میں ہوئی۔ یہ نمائندگان کا خصوصی اجلاس تھا۔ محترم پرویز صاحب اپنے استقبالیہ خطاب کے لئے مائیک پر رونق افروز ہوئے۔ ان کے اس خطاب کا عنوان تھا۔

حرفِ دلنواز

"حرفِ دل نواز"

غزل سرائے، نواہائے رفتہ باز آور
بایں فسردہ دلاں حرفِ دل نواز آور

مفکرِ قرآن کے اس "حرفِ دل نواز" میں حیاتِ اجتماعی کے بڑے اہم اور بنیادی حقائق مضمر تھے۔ یہ شاید ان کا پہلا خطاب تھا جس میں دعوتِ قرآنی کے علمبرداروں کو ان نازک ترین گوشوں سے باخبر کیا گیا تھا جو ہر ابھرتی ہوئی تحریک کے لئے ابتلاء و آزمائش کا سامان بنتے ہیں۔ یوں تو پرویز صاحب زندگی کی ہر اہم حقیقت کا سراغ قرآن کی زبان سے پیش کرتے ہیں لیکن اس خطاب کا خصوصی امتیاز یہی تھا کہ انہوں نے قرآن کی زبان سے اس ذہنیت کی پوری تفصیل رفقائے سفر کے سامنے رکھ دی جو ہمدردی، دوستی، رفاقت اور تعاون کے نام پر ہر تحریک کے مستقبل کو زیر و زبر کرنے کے درپے رہتی ہے جو ذاتی مقاصد کی بجا آوری کے لئے ہر تحریک میں ہراول دستہ بن کر شریک ہوتی ہے، اور انہی مقاصد کے پیشِ نظر تحریک کو خطرے میں ڈال کر رخصت ہو جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ قرآنی نظام کی انقلابی تحریک کے داعیوں کو اس قسم کے خطرات سے محتاط رہنے کی ازبس ضرورت ہے۔

محترم پرویز صاحب نے خطاب کے آخر میں احباب سے اپیل کی کہ وہ وقت کے تقاضوں کو لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھیں۔ دنیا اپنے مختلف تجارب میں ناکامی کے بعد سرِ راہ مایوس کھڑی ہے۔ قرآن کے بابِ عالی کے سوا اس کی نجات و سعادت کی کوئی اور راہ نہیں اس لئے اٹھئے اپنی رفتار کو تیز تر کر

دیکھئے۔ اور نوعِ انسانی کو بتائیے کہ اس کی مشکلات کا حل قرآن کی بارگاہ کے سوا اور کہیں سے نہیں مِل سکتا۔

(آئندہ صفحات میں ، خطاب آپ کے سامنے آرہا ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ دل نواز

زمیلانِ قافلۂ قرآنی

آپ پر ہزار ہزار سلام و رحمت ہو — !

میرا سرِ نیاز، بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہے کہ اس نے ایک بار پھر موقعہ بہم پہنچا یا کہ خمخانہ قرآنی کے بادہ نوش، اپنے سروں میں کیفِ صہباتے حجازی کی خردنشروزیاں، اور اپنے دلوں میں فطرتِ روح الامینی کی سکون آمیزیاں لئے، وجہ شادابیٔ محفل ہوتے ہیں۔ اس دور میں جبکہ کشاکشِ حیات ایسی شدید، اور غمِ دوراں اس قدر گراں نشین ہو رہا ہے، اس قسم کے فرصت کے چند لمحات کا میسر آجانا، جن میں کسی کی نشیدِ جاں فزا پکار پکار کر کہہ رہی ہو کہ ؎

اُس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو

زندگی کتنی خوبصورت ہے

ازبس مغتنمات میں سے ہے۔ آیئے! ہم اِن چند لالہ رنگ و نشاط آہنگ ساعتوں میں، جنہیں ہم نے سورج کی کرنوں سے نچوڑ کر اپنی مٹھی میں دبا رکھا ہے، خدائے عظیم کی اُس کتاب جلیل کا تذکرہ حسین و جمیل کریں جس کے متعلق صبح بہار کائنات کی ہر رنگینی کا تبسم پنہاں، اس رازِ فطرت کی غمازی کر رہا ہے کہ ؎

یہ غنچوں کی رنگت، یہ پھولوں کی نکہت
اُسی کا تبسم، اُسی کے اشارے

اور نذرِ برادرانِ ساقیٔ کوثر و تسنیم، انتہائی جذب و کیف کے عالم میں، ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں کہ ؎

دوستو! اُس چشم دلب کی کچھ کہو، جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام

(۱)

میرے عزیز رفیقو! ہم آج قریب ڈیڑھ سال کی طویل مدت کے بعد مل رہے ہیں۔ اس دوران میں کچھ میری مسلسل علالت، اور کچھ دیگر ناسامد حالات کی وجہ سے، جن کے تذکرہ جگر سوز سے میں آپ کی اس محفلِ کیف و نشاط کو افسردہ و پژمردہ نہیں کرنا چاہتا، ہماری تحریک قدرے نرم رو ہو گئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم اب اس وادیٔ پُرخار سے آگے نکل آئے ہیں۔ اس لئے اب ہم اپنے نئے عزائم اور تازہ ولولوں سے بتوفیق ایزدی، اس کمی کو جلد پورا کر لیں گے۔ لیکن برادرانِ گرامی قدر! قبل اس کے کہ ہم اپنا سامانِ سفر تازہ کر کے پھر جادہ پیمائے منزل ہوں ضروری ہے کہ ہم، قرآن کی شمعِ نورانی کی روشنی میں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں اور دوسری طرف خود اپنا احتساب کریں ـــــ اس لئے کہ جو راہ رَو، سفرِ زندگی میں احتساب خویش نہیں کرتا اور گرد و پیش پر نگاہ نہیں رکھتے، وہ اپنے آپ کو رہزنوں کی تاراج سے محفوظ، اور کمینہ تراشوں کی بیباک دستبُرد سے مامون تصور نہیں کر سکتے۔ رہروانِ سفرِ حیات کی نگاہیں بالعموم اُن مخالفین کی طرف اٹھتی ہیں جو للکار کر سامنے آتے اور پکار کر حملہ کرتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم اِن کھلے دشمنوں سے کہیں زیادہ نقصان رساں اور تباہ کُن اُن فتنہ پرور عناصر کو قرار دیتا

ایک خطرناک گروہ

ہے جو رفاقت کے نقاب میں اس قافلہ میں شامل ہوں' خدمت وایثار کے بہروپ میں اپنے ساتھیوں کا اعتماد حاصل کریں اور انتہائی نازک مرحلہ پر اُن کی متاعِ حیات پر شبخون ماریں۔ آپ دنیا کی تاریخ ـــــ اور انتہائی ندامت سے' سر جھکا کر کہنا پڑتا ہے کہ خود مسلمانوں کی تاریخ ـــــ پر نگاہ ڈالیں۔ آپ دیکھیں گے' کہ کسی تحریک کو غیروں کے ہاتھوں اس قدر نقصان نہیں اٹھانا پڑا جس قدر تباہی کا موجب خود "اپنوں" کی فتنہ سامانیاں بنی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم' اپنے اولین اوراق میں' ان دو جماعتوں کے اجمالی تذکرہ کے بعد جو کھلے بندوں اس کی دعوت پر ایمان لائیں یا دھڑلے سے اس کی مخالفت کرتی ہیں' اس گروہ کا ذکر تفصیل سے کرتا ہے جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ
مَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ (۲/۸)

وہ دعوے تو یہ کرتے ہیں کہ وہ مومن ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ مومن ہوتے نہیں۔ یہ اُن کا صرف زبانی دعوےٰ ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہوتے ہیں جو اس جماعت کے اندر داخل ہوتے ہی تخریب کے لئے ہیں' اور کچھ ایسے جو اپنے خاص مقاصد لے کر ان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ یہ اپنی دانست میں' خدا اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دیتے ہیں۔ لیکن درحقیقت

وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ۔ (۲/۹)

وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں لیکن اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔ اس لئے کہ وہ جذبات کی رَو میں بہے چلے جاتے ہیں۔ اور جب انسان پر جذبات غالب آجاتے ہیں تو اس کی عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ ۔ ان کے دلوں میں روگ ہوتا ہے۔ یہ نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ نفاق درحقیقت نفسیاتی مرض ہے جس سے انسان اپنے آپ کو

نفسیاتی مرض

دھوکے میں رکھتا ہے اور بظاہر سمجھتا ہے یہ کہ وہ بالکل صحیح راستے پر چل رہا ہے۔ (اس مرض کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ۔ تم تخریبی کارروائیاں مت

کرد. خواہ مخواہ فساد پیدا نہ کرو۔ تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ ـــ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۔ یہ کیا کہا آپ نے! ہم فساد پیدا کرتے ہیں؟ ہمارے جیسا اصلاح کرنے والا اور کون ہے۔ ہماری ہر تدبیر معاملات کو سنوارنے اور اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ہے۔ فساد تو وہ پیدا کر رہے ہیں جو ہماری مخالفت کرتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ۔ اگر تم اصلاح کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو پھر ان لوگوں جیسی روش اختیار کرو جو اس تحریک کے ساتھ ہیں، تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ یہ تو شخصیت پرستوں کا گروہ ہے جو اندھی عقیدت میں بہے چلے جا رہے ہیں، ہم ان جیسے احمق تھوڑے ہیں۔ اور قرآن کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ـــ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۔ (۲/۱۴)۔ یاد رکھو! سب سے بڑے احمق یہ خود ہیں۔ لیکن اس بات کو سمجھتے نہیں، اس لئے کہ یہ جذبات سے کام لیتے ہیں، علم و عقل سے نہیں لیتے۔

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیوں ایسا کرتے ہیں؟ قرآن نے دو آیتیں آگے جا کر اس سوال کا نہایت واضح جواب دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ ـــ یہ وہ لوگ ہیں جو اس تحریک میں کاروباری ذہنیت لے کر داخل ہوتے تھے۔ بس اس ایک نکتہ میں ساری تفصیل سمٹ کر آجاتی ہے۔

کاروباری ذہنیت

قرآنی تحریک کی پوری عمارت للّٰہیت کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ للّٰہیت کے معنی یہ ہیں کہ اس میں داخل ہونے والے کے سامنے صرف ایک مقصد ہو۔ یعنی اس دعوت اور تحریک کا فروغ اور کامیابی، اور اس کے ذریعے سے اپنی اصلاحِ نفس۔ اس میں شامل ہونے والے کی ذہنیت یہ ہونی چاہیئے کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْيَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۔ (۶/۱۶۳) میرے فرائضِ منصبی اور ان کی بہ حسن و خوبی ادائیگی، یہ میرا تمام کاروبارِ حیات، میری زندگی اور میری موت، سب اس پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے جو اس دعوت الی الحق کے سلسلہ میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور مقصد میرے پیشِ نظر نہیں۔ اگر اس مقصد کے علاوہ کوئی اور جذبہ دل میں پیدا ہو گیا تو وہ

للّٰہیت نہ رہی۔ سودا بازی ہو گئی۔ یہی وہ سودا بازی ہے جس کے لئے مفاد پرست لوگ مخلصانہ تحریکوں میں شامل ہوتے ہیں۔ جب تک وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ رہنے میں ان کا فائدہ ہے' وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جب اس فائدے پر زد پڑتی ہے تو ان سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس علیحدگی کے وقت ان کے دل کا روگ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں یہ لوگ ان تحریکوں کے لئے مہیب خطرہ اور تخریب کا موجب بن جاتے ہیں۔ علیحدگی کے وقت وہ اس کا اعتراف تو کسی حالت میں نہیں کرتے کہ ہم ہی میں کچھ نقائص اور کمزوریاں تھیں جن کی وجہ سے ہم اس تحریک کے ساتھ نہیں چل سکے ____ اس قسم کے اعتراف کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنی کسی کمزوری کا اعتراف نہیں کرتے۔ اب دوسری صورت یہی باقی رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کریں۔ وہ ایسا اسی شکل میں کر سکتے ہیں کہ وہ اس تحریک میں کیڑے ڈالیں۔ اس کے ساتھ وابستہ رہنے والوں کو بدنام کریں۔ اس کے داعیان کے خلاف الزام تراشی کی مہم شروع کر دیں۔ ان پر ذاتی حملے کریں۔ دنیا میں کہتے پھریں کہ ہم تو نہایت نیک نیتی سے اس تحریک میں شامل ہوئے تھے' لیکن اندر جا کر معلوم ہوا کہ یہ سب دھوکا اور فریب ہے۔ اب جب ہم پر حقیقتِ حال منکشف ہو گئی ہے' تو دیانتداری کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ان کا ساتھ چھوڑ دیں اور صحیح واقعات کی تشہیر کریں۔ تاکہ دوسرے لوگ ان کے فریب میں نہ آسکیں۔ وہ یہ مہم شروع کر دیتے ہیں' اور چونکہ سننے والے اتنی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ جو کچھ سُنا ہے اُس کی تصدیق تو کرالی جائے' ان کا پروپیگنڈا کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر ایک نہایت اہم اور نازک سوال سامنے آتا ہے اور جب تک اسے سمجھ نہ لیا جائے' کاسہ بازی ذہنیت کا صحیح اندازہ لگایا نہیں جا سکتا۔

اس کا مفاد کیا ہوتا ہے؟

ایک شخص ایک تحریک میں شامل ہوتا ہے۔ اپنی گرہ سے روپیہ خرچ کرتا ہے۔ دن رات اس کے کاموں میں لگا رہتا ہے۔ وقت اور توانائی صرف کرتا ہے۔ احباب کے طعنے بھی سنتا ہے' اور اس کے معاوضے میں اُسے کچھ نہیں ملتا۔ نہ ہی کچھ ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ جب وہ تحریک سے الگ ہوتا ہے تو اس چیز کو اپنی وفا شعاری اور خلوص و صداقت کے لئے بطور ثبوت پیش

الیغو کی تسکین

کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بتایئے کہ اگر مجھ میں خلوص نہیں تھا تو میں نے اتنا عرصہ اس قدر کام اور ایثار کیوں کیا؟ یہ بات بظاہر اس قدر وزنی نظر آتی ہے کہ لوگ اس کے قائل ہو جاتے ہیں اور وہ یوں اپنے تخریبی مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ للّٰہیت کے مقابلہ میں انسان کے پیشِ نظر مالی مفاد ہی نہیں ہوتے، اکثر و بیشتر ایک ایسا مقصد ہوتا ہے جس کے سامنے مال و دولت اور جاہ و منصب سب ہیچ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ مقصد کسی کو نظر نہیں آتا۔ اسی کو وہ دل کا روگ یا نفسیاتی مرض قرار دیتا ہے۔ اسے وہ "عزت الاثم" سے تعبیر کرتا ہے۔ دورِ حاضر کے علم النفس (سائیکالوجی) کی اصطلاح میں اسے (E G O I S M) کہا جاتا ہے۔ جو حضرات انسانی نفسیات سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ بیماری کس قدر شدید، گہری اور خوفناک ہوتی ہے اور اس کے نتائج کس قدر تباہ کن۔ ایغو انسان کے پندارِ نفس کو کہتے ہیں۔ یعنی بڑا بننے کی ہوس۔ ایک شخص کو آپ دیکھیں گے کہ وہ جیب سے روپیہ بھی صرف کرتا ہے اور پھر اجتماعات میں بیٹھا کبھی جھوٹے برتن صاف کر رہا ہے، کبھی جھاڑو دے رہا ہے۔ دریاں بچھا رہا ہے، کرسیاں اٹھا رہا ہے۔ لیکن مقصد اس سے صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں اور اس طرح وہ ان کی نگاہوں میں بڑا بن جائے۔ اس سے اس کا نفس موٹا ہوتا ہے، اس کے پندار کی تسکین ہوتی ہے، جب تک ایسا ہوتا رہے، وہ اپنے آپ کو اس تحریک کا فدائی اور ادنیٰ درجے کا خادم کہہ کر پکارتا ہے۔ لیکن جہاں ایسا ہوا کہ اس کے پندار کو ٹھیس لگی، اس کا ایغو انتقام پر اتر آیا۔ اور چونکہ اس سے عزت کا مقام چھن گیا ہوتا ہے، اسے انتقام کی لذت اسی صورت میں ملتی ہے کہ وہ دوسروں کو ذلیل کرے۔ اس کے لئے وہ ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس سے اس کے دل کی آگ بجھتی نہیں۔ اور بھڑکتی ہے ۔ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۔ (۲/۱۰)

وہ اپنے مرض کا علاج یہ سوچتے ہیں کہ دوسروں کو جھٹلایا جائے۔ لیکن اس سے اس مرض کو افاقہ ہونے کے بجائے وہ اور بڑھتا ہے۔ اس کا صحیح علاج کیا ہے، اس کا ذکر ذرا آگے چل کر آتا ہے۔

مدینہ کے منافقین

آپ ان احوال و کوائف پر نگاہ ڈالئے جو منافقین کے بارے میں قرآن میں مذکور ہیں۔ قدم قدم پر تصریحات بالا کی شہادت ملے گی۔ حضورؐ کی مکّی زندگی میں منافقین کا ذکر نہیں ملتا۔ وہ لوگ بالعموم کمینہ فطرت نہیں تھے۔ اس لئے جس کا ساتھ دیتے تھے تو وہ بھی دل کی پوری کشادگی سے اور جس کی مخالفت کرتے تھے تو وہ بھی کھلم کھلا۔ لیکن مدنی زندگی میں ایسا نظر آتا ہے جیسے یہ لوگ گروہ در گروہ جماعتِ مومنین میں شامل ہو گئے۔ یاد رکھیے! یہ کوئی الگ گروہ نہیں تھا۔ یہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل تھے۔ خدا اور رسولؐ پر ایمان لانے کے مدعی تھے۔ اُنہی کے معاشرے کے افراد شمار کئے جاتے تھے۔ اُن کے اجتماعات میں شریک ہوتے تھے۔ اُن کے تمام مشوروں میں اُن کے ہمراز بنتے تھے۔ غرضیکہ ایک مخلص مسلمان اور منافق میں (دل کی حالت کے سوا) کوئی اور تمیز نہ تھی۔ قرآن اس پر شاہد ہے۔ چنانچہ جب اُن کی منافقت کا پردہ چاک ہوا تو قرآن نے اُسے "کفر بعد اسلام" ($\frac{9}{74}$)۔ یا ایمان کے بعد کفر ($\frac{9}{66}$) سے تعبیر کیا۔ انہوں نے جماعت میں اس قدر اعتماد پیدا کر لیا تھا کہ نبی اکرمؐ انہیں میدانِ جنگ تک میں ساتھ لے جاتے تھے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ میدانِ جنگ بڑا ہی نازک مقام ہوتا ہے۔ اس میں منافقین کی شرکت، جماعت کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیتی ہے۔ جنگِ بدر میں تو ان کا ذکر نہیں، کیونکہ وہ مشتمل تھی السابقون الاوّلون پر۔ اس کے بعد جنگِ اُحد میں اُن کا ذکر ہے۔ جنگِ احزاب میں ان کی ریشہ دوانیوں کو طشت از بام کیا گیا ـــ اور جنگِ تبوک میں تو ان کی فتنہ سامانیاں انتہا تک پہنچ گئی تھیں۔ چنانچہ سورۂ توبہ بیشتر انہی کے واقعات پر مشتمل ہے۔

دو خیال کے مسلمان

ان کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ جب ان کی منافقت کا پردہ چاک ہوا، اور ان کے خلاف کارروائی کرنے کی تجاویز سامنے آئیں، تو خود مسلمانوں میں دو پارٹیاں ہو گئیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ ان کے خلاف سخت اقدام کرنا چاہیئے۔ دوسروں کی رائے تھی کہ نہیں! اتنی بڑی جماعت کو اس طرح کاٹ کر پھینک دینا ٹھیک نہیں۔ ہمیں ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیئے ـــ سورۂ نساء میں انہی دو مختلف الخیال پارٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ۔ ($\frac{4}{88}$)، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان منافقین کے بارے

میں دو پارٹیاں بن گئے ہو۔ جو لوگ انہیں ساتھ رکھنے کا مشورہ دیتے تھے' ان سے کہا گیا کہ۔ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَھْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰہُ (کیا تم ان لوگوں کو راہ راست پر لانے کے ارادے رکھتے ہو جو قوانین خداوندی کو چھوڑ کر غلط راستے پر چل نکلے ہیں؟ تم انہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو' اور۔ وَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ کَمَا کَفَرُوْا فَتَکُوْنُوْنَ سَوَآءً اور ان کی انتہائی خواہش یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے اس تحریک کا ساتھ چھوڑا ہے' تم بھی اسی طرح اس کا ساتھ چھوڑ دو۔ تاکہ وہ اور تم برابر ہو جاؤ۔ (۴/۸۹)۔ ان کے علاوہ قرآن نے کچھ ایسے لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جو چاہتے تھے کہ اَنْ یَّاْمَنُوْکُمْ وَ یَاْمَنُوْا قَوْمَھُمْ۔ (۴/۹۱) مسلمانوں کی طرف سے بھی امن میں رہیں اور اپنی پارٹی کی طرف سے بھی۔ یعنی با ما نماز

الزام تراشی

کرد و بہ زاہد شراب خورد، کی دوغلی پالیسی پر عمل کرنے والے۔ جب اس طرح ان لوگوں کی منافقت کا پردہ چاک ہوتا تو وہ الزام تراشیوں اور بہتان بانیوں کے اوچھے اور کمینے ہتھیاروں پر اُتر آتے۔ پہلے وہ اُن لوگوں کے خلاف طعن و تشنیع شروع کر دیتے جو جماعت کا ساتھ نہ چھوڑتے۔ ان میں سے جو لوگ تحریک کے کاموں کے لئے کچھ صرف کرنے کے قابل ہوتے، یہ ان کی نیتوں پر حملے کرتے۔ اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ۔ اور جو غریب صرف محنت سے جماعت کے کاموں میں حصہ لیتے، یہ اُن کا تمسخر اڑاتے۔ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُھْدَھُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْھُمْ۔ (۹/۷۹) جو لوگ اس جماعت کی مالی امداد کرتے، اُن سے جا کر کہتے کہ ان کی امداد مت کرو۔ یہ سب دھوکا باز اور فریب کار ہیں۔ ھُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ حَتّٰی یَنْفَضُّوْا۔ (۶۳/۷) تم جب اس تحریک کی امداد نہ کرو گے تو یہ لوگ اُس رسولؐ کا ساتھ چھوڑ کر خود بخود تتر بتر ہو جائیں گے۔ ان کی اسکیم یہ بھی ہوتی کہ اپنے میں سے کچھ لوگوں کو تیار کرتے کہ وہ اس جماعت میں جا کر

دوسری چالیں

شامل ہو جائیں اور پھر اُن میں بد دلی پھیلا کر اُن سے الگ ہو جائیں تاکہ اس طرح اس جماعت کے کچھ افراد بھی ان کے ساتھ نکل آئیں۔ یہ اُن سے کہتے کہ۔ اٰمِنُوْا وَجْہَ النَّھَارِ وَاکْفُرُوْٓا اٰخِرَہٗ۔ لَعَلَّھُمْ

یَرْجِعُوْنَ ۔ (۳/۷۱) "تم صبح کے وقت ایمان کا نقاب اوڑھ کر ان کے ساتھ جا ملو اور شام کو اُن سے الگ ہو جاؤ۔ اس طرح شاید ان میں سے کچھ لوگ تمہارے ساتھ واپس لوٹ آئیں"۔ پھر ان کی چال یہ بھی ہوتی کہ اس جماعت کے افراد سے الگ الگ ملتے اور انہیں جماعت سے بالا بالا انفرادی طور پر راضی کر لینے کی کوشش کرتے تاکہ اس طرح جماعت کمزور ہو جائے۔ یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ۔ یہ تمہارے سامنے خدا کی قسمیں کھا کھا کر تمہارے ہمدرد اور بہی خواہ بنتے ہیں، تاکہ تمہیں انفرادی طور پر اپنے ساتھ ملانے پر راضی کر لیں۔ ان سے کہا گیا کہ وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۔ (۹/۶۲) اگر تم مومن ہو تو تمہارا جواب یہ ہونا چاہیے کہ سوال ہماری انفرادی رضامندی کا نہیں سوال اس نظامِ خداوندی کی رضامندی کا ہے۔ اگر وہ تمہیں معاف کر کے تم سے راضی ہو جائے تو ہم بھی تم سے راضی ہو جائیں گے۔ لیکن اگر تم اُسے راضی نہ کرو اور کوشش کرو کہ ہم اُس سے بالا بالا تم سے راضی ہو جائیں تو یہ بات ایمان کے منافی ہے۔ یہ جماعت سے غداری ہے جس کی کم از کم ہم سے توقع نہ رکھو۔

حضورؐ پر ذاتی حملے

وہ اس سے بھی آگے بڑھتے اور خود اس تحریک کے داعی حضور رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم پر ذاتی حملے شروع کر دیتے۔ کبھی کہتے کہ یہ تو ڈکٹیٹر ہے۔ اپنی ہی چلائے جاتا ہے، ہماری مانتا ہی نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو شکست پر شکست ہوتی چلی جا رہی ہے۔ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۔۔ کہتے ہیں کہ ان معاملات میں ہمارا بھی کچھ عمل دخل ہے یا یہ اپنی ہی من مانی کرتا جائے گا ۔۔۔ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۔ یہ لوگ اس قسم کی باتیں کچھ اس انداز سے کرتے ہیں، گویا اُن کے دل میں تحریک کا بڑا درد ہے اور یہ اس سے مجبور ہو کر ایسے شکوے کرتے ہیں۔ لیکن جو زہر ان کے دل میں بھرا ہے اُسے ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ کہتے ہیں کہ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۔ (۳/۱۵۳) اگر اس معاملہ میں یہ ہماری سنتا تو ہم اس طرح جنگ میں کبھی نہ مارے جاتے۔ لیکن وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ (۳/۱۵۳) خدا خوب جانتا ہے کہ ایسا کہنے سے ان کا درحقیقت

منشا کیلہ ہے۔ کبھی کہتے کہ هُوَ اُذُنٌ (۹/۶۱) یہ بڑا کانوں کا کچا ہے۔ اپنی کوئی رائے ہی نہیں رکھتا۔ جو کچھ کسی نے آکر کہہ دیا اُسے صحیح تسلیم کر لیا اور اس کے مطابق فیصلے دینے شروع کر دیتے۔ وہ یہاں تک بھی کہتے کہ اس پر وحی وغیرہ کچھ نازل نہیں ہوئی۔ نہ ہی اس میں خود اتنی قابلیت ہے کہ اس قسم کی باتیں اپنے ذہن سے کرسکے۔ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ۔ (۱۶/۱۰۳) اصل بات یہ ہے کہ یہ سب کسی اور شخص کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ وہی آکر اسے سکھا جاتا ہے۔

انتہائی کمینگی

اس قسم کے کمینہ فطرت لوگوں کا آخری حربہ یہ ہوتا ہے کہ اس داعیٔ انقلاب کے خلاف مال کی تقسیم کے معاملہ میں الزامات لگا دیئے جائیں۔ غور فرمائیے، کہ وہ ذاتِ اقدس و اعظم (صلے اللہ علیہ وسلم) جسے زمانہ قبل از نبوت میں لوگ امین کہہ کر پکارتے تھے جس کے متعلق ہرقل کے دربار میں ابوسفیان جیسا سخت دشمن بھی اس کا اعتراف و اعلان کرتا تھا کہ ہم نے اس میں جھوٹ اور بددیانتی کی کوئی بات نہیں دیکھی، اُس ذاتِ گرامیؐ کے متعلق یہ بدنہاد مشہور کرتے تھے کہ آپ (معاذ اللہ) مال کی تقسیم کے معاملہ میں جادۂ انصاف سے انحراف کرتے ہیں — وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۔ (۹/۵۸)۔ ان میں وہ بھی ہیں جو بیت المال کے روپے کے معاملہ میں بھی تجھ پر الزام لگاتے اور طعنے دیتے ہیں۔ غور کیجئے کہ ان باتوں سے حضورؐ کا کلیجہ کس طرح چھلنی نہیں ہوتا ہوگا۔

الزام تراشی کے نتائج

قرآن کریم نے الزام تراشی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا ہے کہ کسی شخص کو اس کے مقام سے گرانے، اور اسے اذیت پہنچانے اور ذلیل کرنے کے لئے یہ سب سے زیادہ مؤثر حربہ ہوتا ہے۔ آپ اپنی روزمرہ کی زندگی پر غور کیجئے۔ آپ نہایت شرافت سے پُراطمینان زندگی بسر کر رہے ہیں کہ ایک فتنہ جو آپ کے خلاف ایک الزام لگا دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ ایک منٹ میں اپنے مقام سے گر کر، اس کی سطح پر آجاتے ہیں اور ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ دنیا جہان کے کام چھوڑ کر اپنی مدافعت پیش کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس میں جج کون ہوتا ہے —؟ ہر وہ راہ رو جو آپ سے پوچھے کہ اس الزام

کی حقیقت کیا ہے ؟ اگر آپ اس کے سامنے اپنی صفائی پیش نہیں کرتے اور معذرت کر دیتے ہیں تو وہ لوگوں میں جا کر مشہور کر دیتا ہے کہ یہ جھوٹا ہے۔ اگر سچا ہوتا تو اپنی صفائی پیش نہ کرتا ــــ جب آپ صفائی پیش کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر نہایت معتبر بن کر کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک کچھ قصور اُس (الزام لگانے والے) کا ہے کچھ اِن کا ہے۔ جو زیادہ تفصیل میں نہیں جاتے وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ صاحب! کچھ تو بات ہوتی ہی ہے جس کی وجہ سے کسی پر الزام لگتا ہے۔ یوں کس کا سر پھرا ہے کہ دوسروں کو مفت میں بدنام کرے لیکن ہمیں اس جھگڑے سے کیا ؟ پھر بہی خواہوں اور ہمدردوں کا گروہ باہر نکلتا ہے کہ ان دونوں میں مصالحت کی کوشش کی جائے۔ مصالحت کی کوشش کی بنیاد اس مفروضہ پر ہوتی ہے کہ غلطی دونوں سے ہوتی ہے۔

ــــ اور آپ کو معلوم ہے کہ ایسا سمجھنے اور کہنے والے کے لئے دلیل کیا ہوتی ہے ؟ ــ یہ محاورہ، کہ صاحب! تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اس محاورے کو ایسے پیش کر دیا جاتا ہے گویا یہ قرآن کی آیت ہے۔ اور کہنے والا اتنا بھی نہیں سوچتا کہ جس آواز کو اس نے تالی کی آواز سمجھا تھا وہ کہیں طمانچے کی آواز تو نہ تھی، جو کسی دراز دست نے کسی بے گناہ کے منہ پر دے مارا تھا! بہرحال، یہ مصالحت کرانے والے بلاتحقیق کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! غلطی دونوں سے ہوئی ہے۔

اب صلح جوئی اور امن پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ کچھ وہ ہٹے اور کچھ یہ بڑھیں۔ اور اگر یہ بڑھنے پر آمادہ نہیں ہوتے تو پھر ان کے اچھے اچھے بہی خواہ بھی ناراض ہو کر کوسنے لگ جاتے ہیں کہ بڑا ضدی واقع ہوا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ الزام تراشی کس قدر مؤثر حربہ اور کیسا اذیت دہ نشتر ہے۔ قرآن کریم نے ان لوگوں کے متعلق کہا ہی یہ ہے کہ ــــ وَ مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ ($\frac{9}{61}$) ــــ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو نبی کو اذیت پہنچانا چاہتے ہیں۔

اذیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مال کی تقسیم کے متعلق الزام کے سلسلہ میں حضورؐ کو اپنی مدافعت پیش کرنی پڑی ــــ غور فرمائیے! کہ

دنیا کا عظیم ترین انسان (علیہ التحیۃ والسلام) جس کے متعلق خود خدا شہادت دیتا ہے کہ وہ اخلاق کی بلند ترین سطح پر ہے، وہ مجمع کے سامنے اپنی برّیت پیش کر رہا ہے کہ میں نے بے انصافی سے کام نہیں لیا۔ پناہ بخدا! فتنہ پرداز عناصر کی اذیت کوشیاں اس حد تک چلی جاتی ہیں!

---(۰)---

پھر تماشہ یہ کہ یہ لوگ یہ سب کچھ کرتے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے آپ کو اس تحریک کا مخلص حامی بھی ظاہر کرتے۔ چنانچہ جب منافقینِ مدینہ نے جماعت میں تفرقہ پیدا کرنے کی آخری اسکیم سوچی، تو اس کے لئے کوئی مخالف تحریک نہیں شروع کی۔ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کی — کوئی گرجا یا بتکدہ نہیں بنایا —

مسجد ضرار

اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ مسلمان کسی دوسری تحریک کے ساتھ وابستہ ہو نہیں سکتے۔ یہی وہ مسجد تھی جس کے متعلق قرآن نے کہا کہ وہ مسجد نہیں بلکہ کُفْرًا وَّ تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُولَهٗ مِنْ قَبْلُ ۔ (۹/۱۰۷)۔ یہ مسجد ایمان کا نہیں کفر کا مرکز ہے۔ یہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے کھڑی کی گئی ہے۔ یہ درحقیقت ایک کمین گاہ ہے، اُن لوگوں کے لئے جو اس سے پہلے اس تحریک سے الگ ہو کر مقابلہ کے لئے کھڑے ہو گئے تھے، لیکن انہیں کوئی مرکز نہیں ملتا تھا — وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰى ۔ ان سے پوچھو گے تو قسمیں اٹھا اٹھا کر کہیں گے کہ ہمارا منشاء تحریک کی بھلائی کے سوا کچھ نہیں — وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ ۔ (۹/۱۰۷)۔ لیکن خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ سخت جھوٹے ہیں۔ چنانچہ اس مسجد کے متعلق حضورؐ کو حکم ملا کہ — لَا تَقُمْ فِيهِ اَبَدًا ۔ (۹/۱۰۸)۔ تم اس میں قدم تک بھی نہ رکھنا۔ اس مسجد کی بنیاد ریت کے ایسے ٹیلے پر رکھی گئی ہے جو اسے جہنم کے گڑھے میں لے کر گرے گا۔ اور وہ جہنم کیا ہے؟ یہ کہ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ اِلَّا اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۔ (۹/۱۱۰) — اس مسجد کی تعمیر ان کے دل میں پھانس بن کر کھٹکتی رہے گی، اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے گی۔

چنانچہ اس مسجد کے متعلق تاریخ میں ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ کو بھیج کر اسے گرا دیا۔

اتنا عرصہ ساتھ رہے

جب اس قسم کے فتنہ پرور عناصر کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جائے تو اکثر لوگ کہتے ہیں کہ یہ لوگ اتنا لمبا عرصہ آپ کے ساتھ رہے۔ اُس وقت تو آپ نے ان کے خلاف کچھ نہ کہا۔ اب انہیں منافق اور متفنّی بنایا جا رہا ہے۔ آپ کو پہلے کیوں نہ پتہ چلا کہ یہ منافق ہیں۔ لیکن آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ حضور نبی اکرمؐ کی بصیرت سے بڑھ کر دنیا میں کسی کی بصیرت ہو سکتی ہے؟ پھر حضورؐ کے ساتھ صحابہ کبارؓ کی بھی پوری جماعت تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہوا کیا؟ — یہ فتنہ پرور لوگ حضورؐ کے ہاتھ پر اسلام لاتے، اور اس جماعت کے اندر رہتے سہتے تھے۔ ان کے معاشرے کا ایک جزو تھے۔ لیکن سوچئے کہ ان لوگوں کو پہچاننے اور جماعت سے نکالنے میں کتنا وقت لگا۔ حضورؐ کی مدنی زندگی کی کُل مدت دس سال کی تھی۔ اور غزوۂ تبوک حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کی آخری مہم تھی، جو ۹ھ میں واقع ہوئی تھی۔ یہ منافقین غزوۂ تبوک تک میں شامل تھے۔ اس کے بعد اُن کے استیصالِ کُلی کا انتظام کیا گیا۔ یعنی حضورؐ اور جماعتِ صحابہؓ کو ان منافقین کی آخری پہچان کے لئے نو سال کا عرصہ لگ گیا۔ خدا نے کہہ دیا تھا کہ ہم وحی کے ذریعے ان کی نشاندہی نہیں کرنا چاہتے کہ تم ان کی پیشانیوں سے ان کے دِل کی حالت معلوم کر لو۔ یہ چیز تمہیں ان کے اقوال و افعال اور اعمال و کردار ہی سے معلوم کرنی ہوگی — سورۂ محمد میں ہے — وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ۔ (۴۷/۳۰) اور اعمال و کردار سے پہچاننے میں اتنا عرصہ لگ گیا۔ اور اس عرصہ میں یہ لوگ جس قدر خرابی کا موجب بنتے رہے قرآن کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔

منافقین کے خلاف جنگ

اس مقام پر پہنچ کر اس گروہ کے متعلق حکم آیا ہے کہ — يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (۹/۷۳) اے رسول! کفار اور ان منافقین کو ایک

ہی صف میں شمار کرو۔ ان کے خلاف جنگ کرو، اور ان سے بڑی سختی کا سلوک کرو۔ غور کیجئے! وہی رسول جن کی امتیازی خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (۳/۱۵۹) یہ خدا کی رحمت تھی کہ تو ایسا نرم دل واقع ہوا ہے۔ اگر تو دل کا سخت ہوتا تو یہ لوگ تیرے ارد گرد سے بکھر جاتے"۔ یعنی جس رسول کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ وہ " غَلِيظَ الْقَلْبِ" نہیں، اب اُسی سے کہا جا رہا ہے کہ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ اس پر ان لوگوں کو بھی غور کرنا چاہیئے جو نہایت ہمدردانہ انداز میں کہا کرتے ہیں کہ انسان کو سخت دل نہیں ہونا چاہیئے، اور اپنے "رفقا" کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کرنا چاہیئے۔ نہ تو رسولؐ اللہ سے زیادہ کوئی نرم دل ہو سکتا ہے اور نہ ہی ان "ساتھیوں" سے زیادہ لمبے عرصہ کا کوئی ساتھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس انگلی کے زخم کا علاج مرہم سے نہ ہو سکتا ہو اور وہ ناسور بنتا جا رہا ہو، جس سے باقی جسم کے زہر آلود ہو جانے کا خطرہ ہو، اُسے بالآخر کاٹ کر الگ کرنا پڑتا ہے۔ یہ ڈاکٹر کی سنگدلی نہیں ہوتی، علاج کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس رسولؐ سے یہی نہیں کہا گیا کہ وہ ان سے جنگ کرے۔ یہ بھی کہا گیا کہ ان سے ہر قسم کے معاشرتی تعلقات منقطع کر لے۔

معاشرتی تعلقات کا انقطاع

معاشرتی تعلقات میں کسی کی موت پر تعزیت اور دعائے خیر آخری چیز ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے متعلق حکم دیا گیا کہ۔ لَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ۔ (۹/۸۴)۔ اگر یہ مر جائیں تو ان کے لئے دعائے خیر نہ کرو، کبھی نہ کرو۔ نہ ہی ان کی قبر پر کھڑے ہو۔ یوں اس گروہ سے جماعتِ مومنین پاک اور صاف ہوتی۔ جماعتِ مومنین سے اس کا وعدہ کیا گیا تھا کہ تم میں سے بالآخر خبیث اور طیب الگ ہو کر رہیں گے۔ مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ۔ (۳/۱۷۸) یہ ہو نہیں سکتا کہ خدا جماعتِ مومنین کو اسی حالت میں چھوڑ دے جس میں یہ اب ہے۔ وہ رفتہ رفتہ ایسا کرے گا کہ خبیث اور طیب چھٹ کر الگ الگ ہو جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی

وفات کے وقت جماعتِ مومنین میں کوئی منافق نہیں رہا تھا۔ منافقین کٹ کر یا چھٹ کر الگ ہو چکے تھے۔

پارٹی کا ساتھ

اس سلسلہ میں ایک بات اور بھی پیش نظر رکھنی چاہیے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ خود تو بدفطرت نہیں ہوتے لیکن وہ پارٹی بازی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ دل سے مانتے ہیں کہ ہماری پارٹی غلطی کر رہی ہے۔ لیکن ان میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ پارٹی کا ساتھ چھوڑ دیں۔ اس لئے وہ ان مذموم فتنہ سامانیوں میں منافقین کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے تخریب کے جرم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے پارٹی بازی کو لعنت قرار دیا ہے۔ — وہ تو اس باب میں اس حد تک جاتا ہے کہ اس جماعت میں شامل ہونے والوں سے کہتا ہے کہ — یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِیْمَانِ ۔ اے ایمان والو! اگر تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ عزیز رکھیں تو تم انہیں بھی اپنا دوست مت بناؤ — وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (9/23) جو کوئی تم میں سے انہیں اپنا دوست بنائے گا تو اس کا شمار بھی انہی ظالموں کے زمرے میں ہو گا — قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِیْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ِاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۔ (9/24)۔

اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے ماں باپ یا اولاد، تمہارے بہن بھائی یا بیویاں، تمہارے دیگر اہل خاندان، تمہارے مال و دولت، جسے تم اس محنت سے کماتے ہو، تمہاری تجارت، جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو، تمہارے مکانات، جنہیں تم نے اپنی پسند سے بنوایا ہے، غرضیکہ دنیا کا کوئی رشتہ اور کوئی جاذبیت خدا اور رسولؐ اور اس کے راستے میں جہاد کے مقابلہ میں، تمہیں زیادہ محبوب ہیں، تو تم انتظار کرو

یہاں تک کہ تمہارے متعلق خدا کا آخری فیصلہ آجائے۔ یاد رکھو! جو لوگ صحیح راستے کو چھوڑ کر کسی اور طرف نکل جاتے ہیں وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! ایمان کا تقاضا اور خدا کا فیصلہ۔ کس قدر صحیح کہا تھا مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

یہ مقام انسانی کیریکٹر کی بہت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے۔ ہم اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہیں کہ نیک آدمی وہ ہوتا ہے جو کسی کو بُرا نہ کہے، جو کسی کا دل نہ دکھائے۔ ایسے آدمی کی سب تعریف کرتے ہیں۔ لیکن قرآن کی رُو سے نیک آدمی کا فریضہ اس سے کہیں آگے ہے۔ اور وہ ہے نہی عن المنکر۔ غلط بات سے دوسروں کو روکنا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی سے یہ کہنا کہ وہ غلط راستے پر چل رہا ہے' اور اسے اس راہ سے روکنے کی کوشش کرنا، اس سے عداوت مول لینا ہے، اس کے نزدیک بہت بُرا بننا ہے ــــ اگر کوئی شخص اس طرح بُرا بننے کے لئے تیار نہیں ہوتا تو وہ اپنے آپ کو مومن نہیں کہلا سکتا۔ خدا کی میزان میں اس کی ایسی نیکیوں کا پرکاہ جتنا بھی وزن نہیں جن سے مقصود یہ ہو کہ اسے سب اچھا جانیں۔ جب مومن کا فریضہ یہ ٹھہرا کہ وہ غلط کار کو غلط کاری سے روکے' تو اسے غلط کاریں کی دنیا میں بُرا بننے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ اسلامی معاشرہ میں (NEUTRAL یا INDIFFERENT) کا کوئی مقام نہیں۔ یہاں تو' یا خدا کا بندہ بن کر رہنا ہو گا یا طاغوت کا۔ جس میں برائی کو روک کر برا بننے کی ہمت نہیں۔ اس کے لئے اس سے بہتر نصیحت کوئی نہیں کہ

جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد!

———(٠)———

مرض کا علاج

میں نے شروع میں کہا تھا کہ قرآن کریم نے منافقت کو "دل کا مرض" قرار دیا ہے۔ یعنی (EGOISM)۔ دوسری طرف اس نے اپنے متعلق کہا ہے کہ وہ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ہے (۱۰/۵۷) یعنی دل کی بیماریوں کا علاج ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم اس مرض کا علاج کیا بتاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر مرض کو اس کے ابتدائی منازل میں پکڑ لیا جائے تو علاج آسان ہو جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی روش سے توبہ کر کے صحیح راستہ اختیار کر لیں تو ان کے لئے بہتر ہے۔ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ۔ (۹/۷۴) اس سلسلہ میں قرآن انہیں ایک بات سمجھاتا ہے اور وہ بات بڑی اہم ہے، وہ ان سے کہتا ہے کہ تم عزت کے بھوکے ہو۔ تم یہ تمام حرکات اس لئے کر رہے ہو کہ تم سے عزت کا مقام چھن گیا ہے۔ یہی تمہارا مرض ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تمہیں پھر سے عزت کا مقام مل جائے۔ اس کے لئے تم اپنے ذہن سے یہ نسخہ تجویز کرتے ہو کہ اس جماعت کی تخریب سے تمہیں عزت اور نمود حاصل ہو جائیگی۔ لیکن یہ غلط ہے۔ تم نے درحقیقت اپنے متعلق صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ تم نے سمجھا کہ اس تحریک کو تمہاری وجہ سے عزت حاصل ہے۔ اور جب تم اس سے الگ ہو کر اس کی تخریب کرو گے تو اس کی عزت چھن جائے گی اور تمہیں عزت مل جائے گی۔ یہ ہے تمہارا اپنے متعلق وہ غلط اندازہ جس کی وجہ سے تم جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو۔ یاد رکھو — وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (۶۳/۸)۔ عزت تو اس تحریک کے ساتھ وابستگی اور اس جماعت کی رفاقت ہی سے حاصل ہو سکے گی۔ جب تک تم اس حقیقت کو نہیں سمجھ لیتے، تمہارے دل کا روگ دور نہیں ہو سکتا۔ تمہارا یہی روگ تھا جس کی وجہ سے تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ تم نے اس تحریک کا ساتھ دے کر اس پر بہت بڑا احسان کیا ہے — يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا۔ (اے رسول! یہ تم پر احسان دھرتے ہیں کہ اسلام لا کر تمہارے ساتھ شامل ہو گئے)۔ اگر تمہارے دل میں للّٰہیت ہوتی تو تم یہ سمجھتے کہ اس تحریک نے تم پر احسان کیا ہے جو تمہیں زندگی کا صحیح راستہ مل گیا۔ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ

بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۴۹/۱۷)

(ان سے کہہ دو کہ تم اپنے اسلام سے مجھ پر احسان مت جتلاؤ. تمہارا اسلام پر احسان نہیں. بلکہ تم پر خدا کا احسان ہے کہ اس نے ایمان کی شمعِ نورانی سے تمہاری زندگی کی راہیں روشن کر دیں. اگر تمہارے دل میں صداقت ہوتی تو تم احسان جتلانے کے بجائے اپنے آپ کو زیر بار احسان محسوس کرتے اور اس صورت میں تمہارے دل کی کیفیت شکر گزاری کی ہوتی، نہ کہ شکوہ طرازی کی — وہ ان لوگوں کو یہ کچھ سمجھاتا ہے تاکہ وہ اپنا اور اس تحریک کا صحیح مقام سمجھ لیں. لیکن جن لوگوں کا مرض علاج کی حد سے آگے بڑھ چکا ہو، وہ ان سے کہتا ہے کہ — مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ (۳/۱۱۸) — یاد رکھو! اگر تم انہی خیالات میں غرق رہے تو تم اپنے غصے کی آگ میں بھسم ہو کر خود ہی مرجاؤ گے. کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے یہ ہے وہ عبرت انگیز انجام جو ایسی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کا ہوتا ہے — ایسا عبرت انگیز کہ

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ (۴۴/۲۹)

پھر ان پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین کی آنکھ سے کوئی آنسو ٹپکا.

میں نے عزیزانِ من! منافقین کے متعلق قرآنی تعلیم کے گوشے کو اس قدر تفصیل کے ساتھ سامنے لانے کی کوشش اس لئے کی ہے کہ اب (خدا کے فضل وکرم سے) آپ کی تحریک اس مقام پر پہنچ رہی ہے، جہاں یہ حاسدوں کی نگاہوں میں کھٹک پیدا کرنے کا موجب بنے گی. اس لئے ہو سکتا ہے کہ آپ کو ان خطرات سے دوچار ہونا پڑے جن کی طرف قرآن کریم نے اس قدر وضاحت سے اشارہ کیا ہے. قرآن نے منافقین کے اس گروہ کا ذکر محض ایک تاریخی داستان کے طور پر نہیں کیا. مقصد اس سے یہ ہے کہ جو تحریک بھی حق و صداقت کی بنیادوں پر اٹھے، اُسے اس حقیقت کو ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اسے اس قسم کے تخریبی عناصر سے بھی واسطہ پڑے گا. اور اس سلسلہ میں حفاظتی تدابیر یہ ہیں.

جہاں تک آپ کی تحریک کا تعلق ہے، آپ کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ جو شخص آپ کی تحریک کا رکن بننا چاہے، اس کے متعلق حتی الامکان تحقیق کر لی جائے کہ وہ کس ذہنیت کا

انسان ہے۔ یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ آپ ہر اُس شخص کو جو آپ کے فارم ممبری پر دستخط کر دے، ممبر بنالیں اور بعد میں اُسے رُکنیت سے خارج کرنا پڑے۔ خارج ہونے والا کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کرے گا کہ اس کا اخراج اس کی کسی غلطی، کمی یا لغزش کی وجہ سے عمل میں آیا ہے۔ (الا ماشاء اللہ) وہ سارا الزام تحریک اور اس کے اربابِ بست و کشاد کے سر دھرے گا اور اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لئے جگہ جگہ پروپیگنڈہ کرتا پھرے گا۔ پھر لوگوں کی ذہنیت بھی عجیب ہے۔ زندگی میں آپ کے بیسیوں دوست بنتے ہیں۔ اور ان میں سے کتنے ایسے ہوتے ہیں جن سے کچھ وقت کے تجربہ کے بعد آپ سے تعلقات باقی نہیں رہتے۔ انہیں اپنے دوستوں کے حلقہ سے خارج کرنے میں آپ اپنے آپ کو کبھی موردِ الزام قرار نہیں دیتے۔

احتیاطی تدابیر

لیکن اگر کوئی تحریک، انہی حالات میں کسی کو اپنے حلقہ سے خارج کر دیتی ہے تو آپ اُس شخص کو نہیں بلکہ تحریک کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ اگر آپ شروع ہی میں اس کا محاسبہ کریں اور اسے اپنی جماعت کا رفیق بننے کا اہل نہ سمجھیں تو اُس کے لئے آپ کے خلاف کسی پراپیگنڈہ کی گنجائش نہیں ہوگی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی اصلاح کر کے آپ کے ساتھ شامل ہونے کے قابل بن جائے۔ یاد رکھیے۔ آپ کی تحریک سیاسی جماعتوں جیسی نہیں، جن میں ساری نظر ارکان کی تعداد پر ہوتی ہے۔ آپ تعداد کی کثرت پر بالکل نہ جایئے۔ دس مخلص قرآنی دوست، سو مفسدین اور ہزار مذبذبین سے بہتر ہیں اور اخلاص کا معیار ایک ہی ہے۔ یعنی الہٰیت، جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کے سامنے صرف ایک مقصد ہو۔ اور وہ یہ کہ قرآنی فکر سے وابستگی کے بعد میرے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا ہوگی اور میری اس رفاقت سے اس آواز کے آگے بڑھنے میں کس حد تک مدد ملے گی۔ قرآنی تحریک میں تو شامل ہونے کا اہل ہی وہ ہے جس کا یہ ایمان ہو کہ۔

عشق میں ایک تم ہمارے ہو
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

———— o ————

قرآنی دعوتِ انقلاب کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی سامنے آتی ہے، اور وہ یہ کہ اس دعوت پر سب سے پہلے غریبوں کی جماعت لبیک کہتی ہے۔

غریب لوگ

چنانچہ قرآن کریم، اس دعوت کی سب سے پہلی آواز کو سامنے لاتے ہی اس حقیقت کو نمایاں طور پر سامنے لایا ہے۔ جب حضرت نوحؑ نے قوم کے دولتمند طبقہ کے سامنے اس دعوت کو پیش کیا تو انہوں نے اعتراض ہی یہ کیا کہ ہم تمہاری جماعت میں کس طرح شامل ہو جائیں جبکہ حالت یہ ہے کہ وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا۔ اس جماعت میں جو لوگ شامل ہوتے ہیں وہ ہمارے معاشرہ کے نہایت ادنیٰ درجے کے کمین لوگ ہیں۔ بَادِيَ الرَّاْيِ — ان کی شکل و صورت سے ظاہر ہے کہ وہ کس حیثیت کے مالک اور کس عقل و فکر کے حامل ہیں۔ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ۔ (۱۱/۲۷) کچھ اونچے طبقہ کے لوگوں کی جماعت ہوتی تو ہم اس میں شامل بھی ہو جاتے۔ آپ ان لوگوں کو جماعت سے نکال دیجئے۔ پھر ہم آپ کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ ان لوگوں سے آپ کو ملے گا کیا؟ — اُن کے اس مطالبہ اور اعتراض کے جواب میں حضرت نوحؑ نے جو کچھ کہا وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ آپ نے فرمایا۔ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ نہ ہی مجھے ایسا کچھ معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے تو اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ قلب سلیم لے کر حاضر ہوئے ہیں اور میزانِ خداوندی میں وزن، مال و دولت کا نہیں، قلب و نگاہ کا ہوتا ہے۔ تمہاری نگاہ اپنی دولت اور وجاہت پر ہے اور خدا کی نگاہ ان کے خلوص اور حسنِ نیت پر۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ۔ (۱۱/۳۱) لہٰذا، وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ میں تمہاری خاطر ان مفلسوں اور غریبوں کو دھتکار نہیں سکتا۔ میں اگر تمہارے پاسِ خاطر سے انہیں نکال دوں تو اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ (۱۱/۲۹) یہ جب خدا کے حضور اس کی شکایت کریں گے تو میں اس کا کیا جواب دوں گا۔ اس لئے تمہارا مال و دولت تمہیں مبارک۔ میرے لئے یہی مفلس و نادار

دنیا کی سب سے بڑی متاع ہیں۔

— اور یہی وہ شکایت تھی جو سرداران قریش کو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف تھی۔ اور جسے (علامہ اقبال مرحوم کے الفاظ میں) ابوجہل نے غلافِ کعبہ کو تھام کر اپنے خداؤں کے حضور باصد آہ و فغاں، ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ۔

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ
با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند!
آبروئے دودمانے ریختند!

یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے آسمانی انقلاب کے ہر داعی کی توجہ سورۂ عبس کے تمثیلی انداز میں منعطف کرائی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

عَبَسَ وَتَوَلّٰى

داعی الی القرآن کی کیفیت یہ نہیں ہونی چاہیئے کہ عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى۔ اس کے پاس ایک غریب آیا تو اس نے تیوری چڑھالی اور منہ پھیر لیا۔ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ — اس سے کوئی پوچھے کہ تجھے کیا معلوم کہ قرآن کی تعلیم اس کی کس قدر نشو و نما کر دیتی — اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى۔ یا وہ اسے سن لیتا، تو یہ اس کے لئے کچھ نہ کچھ فائدہ کا موجب ہو جاتی۔ لیکن تو ایسے لوگوں کو چھوڑ کر ان لوگوں کو زیادہ مستحقِ توجہ سمجھتا ہے — مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى۔ جو اپنے آپ کو تجھ سے، تیری دعوت سے، اس قرآن کی فکر سے، مستغنی سمجھتے

ہیں۔ تو چاہتا ہے کہ ایسے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر مومن بنائے، حالانکہ تجھ پر اس کا کچھ الزام نہیں آئے گا، کہ ایسے لوگ حق و صداقت کی راہ پر کیوں نہیں آتے۔ تو ان لوگوں کے تو پیچھے بھاگتا ہے ــــ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ــــ اور جو دوڑتا ہوا تیری طرف آتا ہے اور زندگی کی خطرناک گھاٹیوں کا خیال دل میں لیتے ہوئے آتا ہے، تو اُس سے لاپرواہی برتتا ہے۔ حالانکہ یہی وہ لوگ ہیں جو فی الحقیقت تیری توجہ کے مستحق ہیں۔ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ۔ یہ تمثیلی بیان ایک بہت بڑی حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے۔ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ۔ (۸۰/۱-۱۲) سو جس کا جی چاہے اس فراموش کردہ حقیقت کو اپنے سامنے لے آئے۔ یہ ہے وہ عظیم نکتہ جس کی یاد دہانی، قرآن ان لوگوں کو کراتا ہے جو اس دعوت کو لے کر اُٹھیں۔

ــــ لہٰذا، برادرانِ عزیز! آپ کی حقیقی متاع یہی غریب و نادار سے رفیق ہیں جن میں اکثر کے پاس، اس سردی میں جسم ڈھانپنے کے لئے گرم کپڑے بھی نہیں۔ لیکن جن کے سینے میں ایسا گرم دل ہے جس کی حرارت، موم کے بنے ہوئے بڑے بڑے مہیب "خداؤں" کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے۔ اور وہ بھی ہیں جن کے پاس آپ کی اس محفل تک پہنچنے کے لئے ریل کا کرایہ تک بھی نہیں ہوتا، لیکن وہ یہ کہتے ہوئے مستانہ وار یہاں پہنچ جاتے ہیں کہ

بے دست و پا نیم کہ ہنوز از وفورِ شوق
سودا ست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

لہٰذا، میرے عزیز بھائیو! لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ (۱۵/۸۸) تم ان مفاد پرستوں کے مال و دولت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو اور اپنی توجہ اپنے ان نادار لیکن مخلص رفیقوں پر مرکوز کرو جو آپ کی حقیقی متاع ہیں۔

بہ چشمِ کم منگر عاشقانِ صادق را
کہ ایں شکستہ بہاں متاعِ قافلہ اند

میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ کی تحریک کو آگے بڑھنے کے لئے روپے پیسے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی میرا مطلب یہ ہے کہ مال و دولت والوں میں مخلص اور وفا شعار ہوتے ہی نہیں — میرا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دل کی صداقت اور خلوص کی بنا پر نہیں، بلکہ محض مالی امداد کے سہارے تحریک میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے لئے شامل ہوں، وہ تحریک کے لئے ہمیشہ نقصان کا موجب ہوں گے۔ آپ کی تحریک میں معیار فضیلت تقویٰ ہونا چاہیے — یعنی خلوصِ قلب کے ساتھ فرائض منصبی کی ادائیگی — نہ کہ مال و دولت اور جاہ و حشمت۔ آپ یہ نہ دیکھئے کہ کسی کے پاس کیا ہے، یہ دیکھئے کہ وہ خود کیا ہے۔ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ ($\frac{۴۶}{۱۹}$) آپ کا بنیادی معیار ہونا چاہیے۔ آپ کی تو تحریک کا مقصد ہی یہ ہے کہ قرآنی تعلیم کی رو

اپنے اندر تبدیلی

سے آپ کے اندر تبدیلی کس قدر پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے آپ کے ہاں عزت اور فضیلت ماپنے کا معیار ہی "تبدیلی" ہونا چاہیے نہ کہ خارجی مقبوضات — میں نے اس مرتبہ کھلے اجلاس میں اپنے ایک خطاب کا موضوع رکھا ہے کہ "مومن کسے کہتے ہیں"۔ آپ اسے بغور دیکھئے اور پھر اس کی روشنی میں اپنا محاسبہ کرتے رہیے کہ آپ کے اندر کس قدر تبدیلی پیدا ہوئی ہے — اگر آپ کے اندر قرآنی زاویۂ نگاہ سے تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر میرے عزیز دوستو! نہ آپ کو قرآنی فکر کا سمجھنا کچھ فائدہ دے سکتا ہے اور نہ اس تحریک کے ساتھ وابستگی کچھ مفید ہو سکتی ہے — اور جب میں "آپ" کہتا ہوں تو اس کے اندر اپنے آپ کو سب سے پہلے شامل کرتا ہوں۔ اس داخلی تبدیلی کے بغیر، یہ آپ کے اجتماعات و تقاریب — آپ کے درس اور تقاریر، کھیل تماشہ سے زیادہ کچھ نہیں — قرآن کے الفاظ ہیں۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ۔ ($\frac{۹}{۶۵}$)۔ جن لوگوں کے متعلق آپ کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ وہ تحریک کے اندر ہوتے ہوئے بھی تحریک کا ساتھ نہیں دیتے بلکہ اُلٹا تخریب کا موجب بنتے رہتے ہیں — یہ وہی ہیں جو اس تمام جدوجہد کو محض کھیل تماشہ سمجھتے ہیں — وَلَمَّا بَلْ خَلَ

الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ۔ (۴۹) قرآن ان کے حلق سے نیچے اترا ہی نہیں ہوتا۔ اگر قرآن دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے تو یہ ناممکن ہے کہ اس شخص کے دماغ میں کوئی خیال بھی ایسا آنے پائے جو قرآنی تحریک کے لئے نقصان کا موجب ہو۔ اس لئے برادرانِ گرامی قدر! آپ تھوڑی دیر کے لئے رُکئے اور اپنے اپنے دل کو ٹٹولیے کہ قرآن آپ کے دل میں اتر چکا ہے یا نہیں۔ قرآن دل میں اُتر جائے تو پھر یہ ساری کائنات بدل جاتی ہے۔ پھر تو کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی!

رفیقانِ محترم! یوں تو اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں کون سا زمانہ ایسا

قرآنی دعوت کی اہمیّت

تھا جس میں قرآنی دعوت کو عام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ضرورت جس قدر شدید ہمارے دور میں آکر ہوئی ہے ایسی شدت اس نے اس سے پہلے شاید ہی کبھی اختیار کی ہو۔ آج ایک طرف تو یہ کیفیت ہے کہ ساری دنیا سمٹ کر گویا ایک بستی بن گئی ہے۔ اور دوسری طرف زمانہ وہ آگیا ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ۔ کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا (۷۶) جس میں فساد کی چنگاریاں چاروں طرف پھیل رہی ہیں اور اُڑ اُڑ کر دوسروں کو لگ رہی ہوں گی۔ اس حشر آسا افراتفری اور قیامت نما نفسانفسی میں ظاہر ہے کہ زندگی کے بلند مقاصد کی طرف توجہ دینے کی فرصت کسے ہوگی۔ ایسے عالم میں جبکہ

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے
گلوں کے چاکِ گریباں کی بات کون کرے

لیکن عزیزانِ من! یہی تو وہ وقت ہے جب قرآن کی آواز بلند کرنے والوں کی ہمتوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں قرآنِ خالص کی آواز صرف آپ کی اس ننھی سی جماعت کی طرف سے بلند ہو رہی ہے۔ اس لئے آپ کی ذمہ داریاں بڑی عظیم

اور آپ کی کوششوں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ دنیا اپنے مختلف تجارب کو آزما چکی ہے۔ اسے نجات وسعادت کی راہ کہیں نظر نہیں آئی۔ انسانوں کے خود ساختہ نظریاتِ زندگی اور نظامہائے حیات میں یہ راہ نظر آ ہی نہیں سکتی۔ یہ صرف قرآن کی شمعِ نورانی ہے جو شبِ تیرہ وتار میں، راہ گم کردہ مسافروں کو سراغِ منزل دے سکتی ہے۔ سوچئے کہ اگر قرآن کی موجودگی میں انسانیت اس طرح سرگرداں وحیراں پھرے تو اس کی ذمہ داری کس کے سر عاید ہوگی؟ وقت ہے کہ آپ اُٹھیے اور قرآن کے بابِ عالی پر دستک دے کر پکاریئے کہ

گھٹا اُٹھی ہے تو بھی کھول زُلفِ عنبریں ساقی
ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

آپ دستک دیجیے اور پھر دیکھیے کہ وہ نورانیت کا پیکر ساقیٔ ازل کس طرح کوثر بدوش و جنت بداماں وجہِ شادابیٔ عالم بنتا ہے۔ آپ نے ایک "تجارت" تو بوالہوسوں کی دیکھی ہے جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے، اور جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ان کی تجارت انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکی۔ اور ایک تجارت وہ ہے جس کے متعلق آپ کا خدا یہ کہتا ہے کہ ___ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ___ اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کی نشاندہی کروں، جو تمہیں دردانگیز عذاب سے بچالے! تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ تُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَ اَنْفُسِکُمْ۔ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۶۱/۱۱) تم خدا اور اس کے رسول پر اس طرح ایمان لاؤ کہ وہ تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ اور پھر خدا کے راستے میں اپنی جان ومال سے مسلسل جدوجہد کرتے رہو۔ اگر تم حقیقت کا علم رکھتے ہو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ سودا تمہارے لئے بہت نفع بخش ثابت ہوگا ___ یہی وہ تجارت ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ لَنْ تَبُوْرَ (۳۵/۲۹) اس میں کبھی نقصان نہیں ہوگا۔ یہ سودا گھاٹے کا ہے ہی نہیں۔ اس سے تم کبھی تباہ نہیں ہوگے ___ لہذا

برادرانِ عزیز! آپ کو اس تجارت میں اپنا، سرمایہ، لگانا چاہیئے۔ اس کا منافع روپے پیسے یا جھوٹی عزت اور تسکینِ پندار کی شکل میں نہیں ملتا۔ یہ ملتا ہے انسانی ذات کی نشوونما کی شکل میں۔ اور جسے یہ منافع مل جائے، اس کی تجارت کے نفع بخش ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے! دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ آپ احباب کی ہمتوں میں برکت، ارادوں میں استقامت، عزائم میں رسوخ اور قدموں میں ثبات عطا فرمائے اور آپ کو مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ۔ وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ۔ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ۔ سے ہر مقام پر محفوظ رکھے۔

جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے، یوں تو میری زندگی کی ہر سانس پہلے بھی اس مقصد کے لئے وقف تھی لیکن جب سے مجھے (سابقہ اپریشن کے بعد) گویا زندگی کی توسیع (EXTENSION) ملی ہے، یہ احساس اور بھی شدید ہو گیا ہے کہ مشیت نے ہنوز مجھ سے کچھ اور کام لینا ہے۔ لیکن یہ کام، میرے عزیز ہم سفرو! آپ کی رفاقت کے بغیر تکمیل تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے آپ اپنی رفتار کو اور تیز کر دیجئے۔

تیز ترک گامزن، منزلِ ما دور نیست

میری دعا تو قرآن کی بارگاہ میں ایک ہی ہے کہ

روزم تو برفروز و شبم را تو نور دہ
ایں کارِ تست، کارِ مہ و آفتاب نیست

آخر میں برادرانِ عزیز! میں بخلوص قلب آپکا سپاس گزار ہوں کہ آپنے اس سردی کے موسم میں اپنے دور دراز مقامات سے زحمت سفر گوارا فرما کر اپنے اس ملی اجتماع میں شرکت فرمائی حقیقت یہ ہے کہ آپ کے اس جذبِ کیف کو دیکھ کر خود میری زندگی بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ احباب کو خوش و خرم رکھے اور زندگی کے ہر بلند مقصد میں، جو قرآن کے مطابق ہو، شاد کام و کامران فرمائے۔

وَالسَّلَامُ عَلَیْکُمْ۔ برادرانِ عزیز!

پرویز

دُوسرا (کھلا) اجلاس

کنونیشن کا دوسرا کھلا اجلاس ۱۳ر نومبر دو بجے بعد دوپہر منعقد ہُوا، جس میں پرویز صاحب کے خطاب کا عنوان تھا ــــ

" مومن کسے کہتے ہیں ؟ "

مردِ مومن کا مقام اور مفکرِ قرآن کا بیان ، پہلے انہوں نے اس حقیقت سے اجمالاً نقاب اُلٹا اور بتایا کہ

" قرآن کی تعلیم انسان کو وہ کچھ بنا دیتی ہے جو خدا چاہتا ہے کہ وہ بن جائے . یعنی انسان اس منزل و منتہےٰ تک پہنچ جائے جو اس کے سفرِ حیات کے لئے صفحۂ ارض پر مقرر کی گئی ہے . قرآن نے ایسے فرد کو مومن کہہ کر پکارا ہے "

پھر وہ اجمال سے آگے بڑھے اور تفصیل کے رنگ میں آتے تو جماعتِ مومنین، اس کے نظام میں ایک فرد کی حیثیت ، انفرادی نیکیوں کے مروجہ تصور ، عالمگیر انسانیت کے قرآنی نصب العین اور اس سے متعلق پروگرام کا ایک ایک گوشہ نکھار اور ابھار کر ایوان کے سامنے لے آئے . مردِ مومن کن عظیم القدر صفات کا حامل ہوتا ہے . قرآن کی تعلیم اُسے شرفِ انسانیت کی کن بلندیوں پر فائز کرتی ہے اور پھر مومنین کی اس جماعت کے ہاتھوں انسانی زندگی میں کس قسم کا معاشرہ متشکل ہوتا ہے . اس معاشرے میں مرد اور عورت کس طرح شانہ بشانہ سفرِ زندگی کو طے کرتے ہیں . ان تفاصیل کو علیٰ وجہ البصیرت قرآن کی زبان سے پیش کرنا مفکرِ قرآن ہی کا حصہ تھا . کسی مقرر اور خطیب کا نہیں .

محترم پرویز صاحب نے وضاحت کی کہ عالمگیر انسانیت کے لئے قائم کردہ جماعتِ مومنین کا یہ نظام کیونکر تفرقہ بازی کے شرک سے پاک ہوتا ہے . اس میں ربطِ باہمی اور اتحاد و ائتلاف کی کس قدر خوشگوار کیفیت نمایاں ہوتی ہے . دلوں میں کس طرح اخوت اور

محبت کی لہریں دوڑتی ہیں اور اس کے صدقے میں کیسی خوشگواریاں اور سربلندیاں جماعتِ مومنین کے حصے میں آتی ہیں۔

مجلسِ استفسارات

۱۴ر نومبر کی شب کی نشست مجلسِ استفسارات کے انداز میں تھی۔ زندگی کے عملی مسائل سے متعلق اہم سوالات اور مفکرِ قرآن کی طرف سے باری باری ہر اہم سوال کا جوابِ قرآنِ کریم کی روشنی میں، سوالات تحریری صورت میں آغازِ اجلاس سے قبل ہی جمع کر لئے گئے تھے اور کچھ ساتھ ہی ساتھ موصول ہوتے رہے۔ سوالات کا پلندہ ہاتھوں میں لئے پرویز صاحب نے اپنی مخصوص نشست سنبھالی اور اپنے مختصر سے خطاب سے مجلس کا آغاز کیا۔ اس خطاب میں انہوں نے واضح کیا کہ ان کا تعلق کسی فرقے سے نہیں، وہ قرآنِ کریم کی روشنی میں زندگی کے مسائل پر غور کرتے ہیں اور اسی روشنی میں، اپنی بصیرت کے مطابق سوالات کا جواب دیں گے۔

اس دفعہ مجلسِ استفسارات کی یہ خصوصیت رہی کہ سطحی نوعیت کے سوالات بہت ہی کم بلکہ برائے نام تھے — زیادہ تر سوالات بلند علمی سطح اور حقیقت پسندی پر مبنی تھے اور اس سے واضح ہوتا تھا کہ اس مجلس کی علمی سطح پہلے سے کہیں بلند ہوتی جا رہی ہے۔

لاؤڈ سپیکر کی اجازت نو بجے شب تک تھی۔ چنانچہ کم و بیش ڈھائی گھنٹے تک مجلس وجہ شادابیٔ قلب و نظر بنی رہی۔ مفکرِ قرآن نے ایک ایک سوال کا جواب بڑی وضاحت اور مخصوص شگفتگی کے ساتھ دیا۔ علم و بصیرت کی یہ جوئے سلسبیل نو بجے شب تک رواں دواں رہی۔ مجلس میں موافق اور مخالف ہر طبقہ کے حضرات شریک تھے۔ لیکن مفکرِ قرآن کے لبوں سے جب ہر سوال کا نکھرا نکھرا جواب ابھر کر سامنے آتا تو چاروں طرف سے مرحبا اور تحسین و آفرین کی صدائیں بے ساختہ بلند ہونے لگتیں۔ قرآن کے ایک عظیم طالبِ علم کی عظمت کی

اس سے بڑھ کر رشن دلیل بھلا اور کیا ہو گی کہ مخالف بھی وارفتہ وار خراجِ تحسین پیش کریں۔
۹ بجے شب جب لاؤڈ سپیکر کی پابندی کی بنا پر مجلس کے خاتمہ کا اعلان ہوا تو پوری مجلس مرجھا کر رہ گئی۔ سب چاہتے تھے کہ یہ سلسلۂ علم و بصیرت ختم نہ ہونے پائے۔ لیکن مجلس کو بالآخر ختم ہونا تھا اور وہ ختم ہو گئی۔ تمام حاضرین دلوں میں ایک حسرت لئے آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے اور جب اجلاس کا خاتمہ ہوا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وقت کی پابندی نے ایک سہانے خواب کا سلسلہ جان نواز توڑ کر رکھ دیا۔

آخری کھلا اجلاس

۱۵ ر نومبر (اتوار) کی صبح کو ٹھیک نو بجے کنونشن کا آخری کھلا اجلاس شروع ہوا۔ پنڈال آخری گوشوں تک کھچا کھچ بھرپور تھا۔ کہ ابتدائی کارروائی کے بعد میر کارواں محترم پرویز صاحب اپنے خطاب کے لئے مائیک پر تشریف لائے۔ خطاب کا عنوان تھا ـــــ

"قانون کی حکمرانی"

ہمارے ہاں قانون کا مفہوم بڑا محدود سا ہے اور اس سے مراد وہ عدالتی ضابطے ہیں جن کے تحت ایک عدالت کسی مقدمہ کا فیصلہ سرانجام دیتی ہے۔ لیکن پرویز صاحب قانون کا وہ عالمگیر اور حدود فراموش تصور لے کر سامنے آتے تھے جس کے مطابق پورا سلسلۂ کائنات جاری و ساری اور ارتقاء پذیر ہے۔ خدا کا ہر فیصلہ اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ خارجی کائنات میں بھی اور انسانوں کی اپنی زندگی میں بھی۔ اسی سے کائنات اور انسانی زندگی میں ایک ایسا نظامِ عدل قائم ہے۔ اس میں کسی سے ادنیٰ رو رعایت کا سوال نہیں۔ اور نہ کسی کی خاطر کسی تبدیلی کا۔

انہوں نے واضح کیا کہ یہی قانونِ مکافاتِ عمل تھا جو انسانوں کے لئے وحی کی وساطت سے خدا نے دیا اور اس کا تصور قرآن کے اوراق میں محفوظ ہے۔ اور پھر ثابت کیا کہ انسانوں کے خود ساختہ مذاہب نے کس طرح خدا کے نظامِ عدل کے اس قانونی تصور کو ختم کر کے

ذاتوں اور ورنوں کی تقسیم، بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل کی تفریق اور گناہوں کے کفارہ کے غیر قانونی تصورات رائج کئے اور عمل اور بروئے قانون اس کے نتائج کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی۔ پھر انہوں نے اسلام میں ملوکیت اور شخصی حکومت کی کارفرمائیوں کی تفصیل پیش کی جس کا اثر براہِ راست خدا کے قرآنی تصور پر پڑا، اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ تصور اس شہنشاہیت کے تصور میں بدل گیا جس میں نہ کسی قانون کا سوال باقی رہتا ہے اور نہ کسی اصول کا ــــ قریب دو گھنٹے کا یہ خطاب کیا تھا، قرآنی منذرات و مبشرات کا عجیب امتزاج تھا جو ایک طرف باطل تصورات کی بنیادوں تک کو ہلا گیا اور ــــ دوسری طرف دلوں کی بستیوں کو بسا گیا۔

الوداعی خطاب

اتوار کی دوپہر کو کنونشن کا وہ نازک ترین مرحلہ سامنے آگیا جو ہر کارواں کے الوداعی خطاب سے تکمیل پاتا ہے۔ تحریکِ قرآنی کے قافلہ سالار جن کے چہرے پر چار دن سے مسلسل مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں، اب احباب کی جدائی کی حسرت زا کیفیت دل میں لیے ایوان کے سامنے آئے۔ اور جب انہوں نے الوداعی خطاب کا آغاز کیا تو ان کی آواز قلب و نگاہ کی لرزشوں کی ترجمان تھی۔ انہوں نے آغاز خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

پچھلے سال جب آپ احباب گلے مل مل کر رخصت ہو رہے تھے تو مجھے جگر کا یہ شعر یاد آرہا تھا کہ

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
محبت کا زمانہ آرہا ہے

میں اس کنونشن کا سال بھر انتظار کرتا ہوں۔ اس قدر انتظار کے بعد آپ تشریف لاتے ہیں اور اب جو جانے لگے ہیں تو وہی کیفیت پھر مجھ پر طاری ہو رہی ہے۔ چند ماہ قبل جب میری علالت ایک نازک مرحلے سے دوچار تھی تو اس وقت دل میں یہ تمنا بار بار ابھر رہی تھی کہ ایک بار آپ کو پھر دیکھ لوں۔ سو اللہ کا شکر ہے کہ میری یہ آرزو پوری ہو گئی۔

جس ہجومِ شوق کو دلوں میں لئے آپ کنونشن میں شریک ہوتے ہیں' وہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ قرآن کا رشتہ ہی بہترین رشتہ ہے۔ یاد رکھیئے کہ آپ قرآن کے پیامبر ہیں۔ آپ کی مختصر سی جماعت اس شمع کو ہاتھوں میں لے کر اٹھی ہے' اسی لئے اپنی ذمہ داریوں کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیئے۔ زمانہ مایوسی کی تاریکیوں میں کھڑا ہے اور اس روشنی کو قبول کرنے کیلئے بے قرار ہے' اس لئے عزم و ہمت سے شمعِ قرآنی کو لے کر آگے بڑھیئے اور اس کی روشنی کو تاریک فضاؤں میں پھیلا دیجیئے۔

خدا آپ کو اپنی رحمت کے سائے میں مسرتوں سے مالا مال رکھے۔ آپ بار بار جائیں اور بار بار تشریف لائیں۔ کیونکہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

یوں یہ کاروانِ شوق' جذب و کیف اور علم و بصیرت کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے واپس لوٹا۔

آپ آ گئے
تو رونق کاشانہ ہو گئی

طلوعِ اسلام کی نویں کنونشن

منعقدہ ۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۔ لاہور
۱۷ ؍ تا ۲۰ ؍ مارچ ۱۹۶۶ء

روئیداد ماخوذ از طلوعِ اسلام اپریل ۱۹۶۶ء

پیش لفظ

نومبر ۱۹۶۴ء کی طلوعِ اسلام کنونشن کے بعد تحریکِ قرآنی کے طائرانِ پیش رس کا آئندہ سالانہ اجتماع گذشتہ اکتوبر میں طے پایا تھا۔ تحریک کے تمام مراکز میں مقررہ تاریخوں کا انتظار شدتِ آرزو کا رنگ لئے ہوئے تھا کہ عین اسی مرحلہ انتظار کے دوران پاک بھارت کش مکش معرکۂ حق و باطل کی صورت اختیار کر گئی۔[ل] زمین کی پستیوں، آسمان کی بلندیوں اور سمندر کی وسعتوں میں جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور پوری ملتِ پاک ایک ایسے دشمن کے خلاف سینہ سپر ہو گئی جو اپنی کثرتِ تعداد، بے پناہ جنگی وسائل اور اٹھارہ سال کی شبانہ روز اور بھرپور تیاریوں سے ہماری مملکت اور قومی وجود کو مٹانے کے ناپاک عزائم لے کر ہماری سرحدوں پر حملہ آور ہوا تھا۔ ملکی دفاع اور قومی سالمیت کے مقدس تقاضوں نے جہاں حیاتِ ملی کے دیگر منصوبے اور پروگرام پسِ پشت ڈال دیئے وہاں طلوعِ اسلام کنونشن کا انعقاد بھی التوا میں پڑ گیا۔ اواخر ستمبر میں جنگ کے شعلے سرد پڑ گئے۔ لیکن دونوں مملکتیں ایک دوسرے کے مقابل سنگینوں سے صف آراء رہیں۔ تا آنکہ ایک دن اس عارضی صلح و امن کا آ گیا جو سرحدوں کے ہر دو جانب زندگی کو معمول پر لے آیا۔ اور کنونشن کے لئے سازگار صورت حال پیدا ہو گئی۔

اس صورت حال میں جب کنونشن کی نئی تاریخوں کا اعلان ہوا تو ملک کے مختلف گوشوں میں

[ل] ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ۔

احباب قرآنی کی بزم ہائے شوق میں وفورِ مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ہنگامی صورتِ حال میں کھویا ہوا گوہر مقصود انہیں واپس مل گیا اور ولولہ ہائے شوق و مستی سے، ۱۷ مارچ کی اس شام کا انتظار کیا جانے لگا جو ڈیڑھ سال کے سلسلۂ فراق کے بعد ان کی ہم آغوشیوں کی رسمِ افتتاح کا اعزاز حاصل کر رہی تھی۔ گردشِ شام و سحر کے درمیان شدتِ انتظار کے یہ صبر آزما مرحلے ایک ایک کر کے طے ہوتے اور بالآخر ۱۷ مارچ کا وہ مبارک دن آ گیا جب گلبرگ کا خیابانِ آرزو ان طائرانِ مشتِ رس کے خیر مقدم کے لئے آراستہ و پیراستہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہی وہ خیابانِ آرزو ہے جسے فیض کے الفاظ میں مخاطب کرتے ہوئے وہ بجا طور پر جھوم جھوم کر کہا کرتے ہیں کہ

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں، تری محفل سے آئے ہیں!

گھڑی دن کے گیارہ بجا رہی تھی کہ صحنِ چمن مسرت کے قہقہوں سے گونج اٹھا۔ کراچی کا کاروانِ شوق کنونشن ہاؤس میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ قافلہ اس سفر میں ہمیشہ سب سے آگے رہا اور اس داخلہ میں بھی اولیت کا شرف و اعزاز پا رہا تھا۔ شاداب فضا میں چاروں طرف مسکراہٹوں اور قہقہوں سے فردوسِ گوش کا سماں بندھ گیا۔ میر کارواں آگے بڑھ کر ایک ایک کو اپنی آغوش میں لے رہے تھے۔ کس قدر اثر آفریں تھا یہ منظر! خلوص و محبت میں ڈوبی ہوئی امنگوں کا بند ٹوٹ گیا۔ میر کارواں کی پلکوں پر مسرت کے آنسو ڈھلک آئے۔ ان کے احباب کی آنکھیں بھی نمناک تھیں۔

کراچی کے قافلے کے ساتھ کوئٹہ کے احباب بھی مسرت بداماں پہنچ گئے اور پھر ملک کے مختلف گوشوں سے رفقائے منزل کی آمد آمد کا سلسلۂ جاں نواز شروع ہو گیا۔ ملتان۔ ڈیرہ اسماعیل خان، مردان پنج کسی، لائلپور، راولپنڈی، پنڈدادن خان، ربوہ منڈی، سید حسین، پشاور صدر جگہ جگہ سے تشنہ قرآنی کے یہ شیدائی خمکدۂ قرآنی میں پہنچنے شروع ہو گئے۔ پنڈال اور آرامگاہوں کی ترتیب نقشے کے مطابق دن ڈھلتے تک تکمیل پاتی رہی۔ بک سٹال، طعام گاہ اور مطبوعات ادارہ کے سٹال الگ الگ اپنی جگہ قائم ہو گئے اور تین بنگلوں کی وسعت میں غروبِ آفتاب تک ایک نئی بستی وجود میں آ گئی۔ وہ بستی جس کے طول و عرض میں احباب کی چھوٹی چھوٹی مجالس آراستہ تھیں۔ دلوں کے غنچے کھل رہے تھے۔ چہروں پر مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں۔ لبوں پر دعوتِ قرآنی کے چرچے تھے۔ قلب و نگاہ

میں ذکر و فکر کی شادابیاں دوڑ رہی تھیں۔ اور تعارفی اجلاس کا بے تابی سے انتظار ہو رہا تھا۔

تعارفی اجلاس

رات کے کھانے سے فراغت ہوئی تو لاؤڈ سپیکر کی آواز نے سب کو ایوانِ کنونشن میں جمع ہونے کا مژدہ سنایا۔ اور عین اس وقت جب گھڑی نو بجا رہی تھی، پنڈال میں تعارفی اجلاس آراستہ ہو چکا تھا۔ تلاوتِ قرآنِ پاک اور نظم خوانی کے بعد حسب سابق مختلف بزموں کے نمائندگان نے تعارف کا فریضہ ادا کیا۔

اجلاس کی کارروائی نصف تک پہنچی تھی کہ بادوباراں کے تند و تیز طوفان نے یکایک ایوان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اجلاس برخاست کرنا پڑا۔ جب اجلاس شروع ہوا تھا تو آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ لیکن کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ ابر آلود مطلع یک دم فضا میں ایسا ہنگامہ پھیلا دے گا۔ ایوان میں کبھی کبھی بادلوں کی گرج سنائی دے جاتی تھی۔ لیکن سب شرکائے کنونشن ربطِ باہمی کے اس سرور انگیز ماحول میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ انہیں آخر تک خبر نہ ہوئی کہ یہ طوفان آنِ واحد میں سارا نظم و ضبط درہم برہم کر کے رکھ دے گا۔ ایوان کنونشن میں طوفان کی یورش پر ابھی وہ سنبھلنے نہ پائے تھے کہ بادوباراں کے طوفان کے ساتھ ہی روشنی گل ہو گئی۔ اور چاروں طرف گہری تاریکیاں مسلط ہو گئیں۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اور طوفان تھا کہ قیامگاہوں تک کو اپنی زد میں لے چکا تھا۔ مہمان خانوں کے شامیانے اور قناتیں طوفان کے سامنے اعترافِ شکست پر مجبور تھیں۔ بستر، چارپائیاں، کتبے، ہر شے اندھیرے میں تربتر ہوئی جا رہی تھی۔ لیکن سب نے ہمت سے کام لیا۔ اور جہاں ممکن ہوا پناہ لے لی۔

کچھ دیر بعد، جب بجلی کی روشنی واپس لوٹی اور اندھیروں میں نور پھیلا تو ہر شے اپنے مقام پر نظر آنے لگی اور سب کو شب باشی کے لئے مناسب جگہ تلاش کرنے کا موقع مل گیا۔ عام حالات میں اس قسم کے حوادث ہزار پریشانیوں کا موجب بن جاتے ہیں۔ لیکن وحدتِ فکر و نظر کے صدقے، ان بادہ مستانِ حجازی میں سے کسی کے ماتھے پر شکن نہ تھی اور سب شاداں و خنداں مصروفِ گفتگو تھے۔

۱۸ مارچ ۔ صبح کا خصوصی اجلاس

۱۸ مارچ کے ابتدائی اجلاس میں، استقبالیہ اور ناظم ادارہ کی رپورٹ کے بعد، پرویز صاحب نے ان الفاظ سے شرکائے محفل کا استقبال کیا۔

آپ آگئے تو رونقِ کاشانہ ہوگئی

رفقائے کاروانِ قرآنی! میرا محبت بھرا ہدیۂ سلام و رحمت قبول فرمائیں!

میری تنہائیوں کے غمگسار اور امیدوں کے مرکز دوستو! خدا کا شکر ہے کہ قریب ڈیڑھ سال کے انتظار کے بعد ہمیں پھر سے مل بیٹھنے کی مسرت اور سعادت نصیب ہوئی ہے۔ یہ مدت بڑی طویل اور یہ مرحلہ بڑا صبر آزما تھا لیکن آپ احباب کے تصور نے اس عرصہ کی درازی کو سمٹا کر بہت مختصر کردیا اور اس کی صعوبات کو راحتوں سے بدل دیا۔

بیادِ گیسو و رخسارِ یار گذری ہے
بڑے مزے میں شبِ انتظار گذری ہے

اور پھر کنونشن کے انعقاد کی تاریخیں مقرر کر دینے کے بعد تو یوں کہئے گویا آپ احباب کے پاؤں کی آہٹ میرے لئے ہر وقت فردوسِ گوش بنتی رہی۔ آپ کی یاد کی شمیمِ جانفزا، دوشِ ہوا پر مستانہ وار آتی اور در و دیوار کو مہکاتی چلی گئی۔

اس مرتبہ ان انتظار کی گھڑیوں میں گذشتہ ستمبر کی جنگ کا حادثہ بھی شامل تھا۔ یوں تو یہ جنگ سارے ملک کے لئے بڑی جانکاہ آزمائش اور کاہش کا موجب تھی۔ لیکن ہم اہلِ لاہور کے لئے اس کے تاثرات کچھ اور انداز کے تھے۔ ہمارے، اور بھارت کے جناتی لشکر کے درمیان پاکستانی مجاہدین کی بس ایک دیوار حائل تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ دیوار بنیان مرصوص تھی لیکن، بایں ہمہ، یہ خدشہ تو ہر وقت موجود تھا کہ اگر خدانکردہ اس دیوار میں کسی وقت ذرا سا بھی رخنہ پڑ گیا تو دشمن کے سپاہی ہمارے گھروں کے صحن میں ہوں گے — اس دشمن کے سپاہی ہمارے گھروں کے صحن میں ہوں گے — اس دشمن کے سپاہی کہ انسانیت جس کے پاس نہیں پھٹکی۔ اور شرافت کا جس نے نام تک نہیں سنا۔ چنانچہ

یہاں کامل سترہ دن اسی بیم و رجا میں گزرے کہ

اب چھری صیاد نے لی اب قفس کا در کھلا

لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہمارے جسور و غیور دکلاں گیر مجاہدین نے اپنی جانیں تک قربان کر دیں لیکن اس بنیانٌ مرصوص میں رخنہ تو ایک طرف کہیں دراڑ تک نہ پڑنے دی ان کی گراں بہا قربانیوں نے قوم کی متاعِ عزت وناموس کو بچا لیا۔ کتنا بڑا احسان ہے ان کا ہماری، اور ہماری آنے والی نسلوں کی گردن پر! ؎

سرِ خاک شہیدے برگہائے لالہ می پاشم

کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

جنگ کے دوران، اندرونِ ملک کے دور دراز گوشوں تک سے احباب کا مسلسل اصرار رہا کہ میں اپنا مستقر چھوڑ کر کسی زیادہ محفوظ مقام کی طرف منتقل ہو جاؤں۔ بہت سے بہی خواہوں نے اس سلسلہ میں جملہ انتظامات کی پیش کش بھی کی۔ ان کا اندیشہ قابلِ فہم اور ان کا جذبہ مستحقِ ستائش تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میرے یہاں سے اٹھ جانے سے کتنوں کے حوصلے پست اور کتنوں کی ہمتیں شکستہ ہو جائیں گی۔ اس لئے میں نے یہاں سے جانا مناسب نہ سمجھا۔ الحمد للہ کہ وہ سیلاب بلا بخیر و خوبی گذر گیا۔

ملک کے دیگر کاروبارِ حیات کے ساتھ، اس جنگ کا اثر ہماری تحریک کی سرگرمیوں پر بھی پڑا۔ رفقائے کار بیک انداز و دگر، ہنگامی کشمکش سے متاثر رہے اس لئے وہ تحریک کے کاموں کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ بایں ہمہ، یہ امر موجبِ اطمینان ہے کہ ایسے تشویش انگیز حالات میں بھی احباب اس فریضہ کی طرف سے غافل نہیں رہے۔ لاہور کے خصوصی حالات کے پیش نظر، یہاں چند ایک ہفتہ واری درسوں کا ناغہ ہوا۔ دوسرے مقامات پر یہ سلسلہ بھی بدستور جاری رہا۔

سرِدست جنگ کا ہنگامی خطرہ تو ٹل گیا ہے۔ لیکن ہمیں اس فریب میں مبتلا ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیئے کہ اب پاکستان کی حفاظت اور سالمیت کے متعلق کوئی خطرہ ہی باقی نہیں رہا۔

چراغ گل کر کے بیٹھ جانا تو کچھ دلیلِ سحر نہیں ہے

جیسا کہ آپ احباب پر واضح ہے، پاکستان کا تحفظ عام نقطۂ نگاہ سے بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن قرآنی فکر و نظر کے حاملین کے لئے تو یہ دینی تقاضا ہے۔ ہمارے لئے پاکستان محض وطن کی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا خطۂ زمین ہے جسے ہم نے قرآنی نظام کی آماجگاہ بننے

کے لئے حاصل کیا ہے اس لئے اس کی حفاظت کے لئے ہر کوشش جہاد ہے۔ اور کوئی ایسا خیال، نظریہ، یا حرکت جس سے اس کی حفاظت اور سالمیت کو کسی قسم کے نقصان کا احتمال یا امکان ہو، بارگاہِ خداوندی میں جرمِ عظیم ہے — ہمیں اس کی اس حیثیت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھیئے کہ اس خطۂ زمین کی حفاظت کے بعد ہمیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، یہ خطۂ زمین مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ مقصد ہے قرآنی نظام کا قیام۔ ہمیں اس مقصد کے حصول کی طرف سے تغافل یا تساہل نہیں برتنا چاہیئے۔ اس کے لئے بہر حال اور بہر نوع کوشش جاری رکھنی چاہیئے۔ لیکن اسے بھی یاد رکھیئے کہ اس کوشش کے لئے ہمارا طریقِ کار ہنگامہ آرائی اور تماشہ گری نہیں، ہمارا طریق نہایت خاموش اور پُرامن طور پر قرآنی فکر کو عام کئے جانا ہے۔ تاکہ اس نظام کے قیام کا تقاضا، لوگوں کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔ ہم میں سے بعض تیز طبائع پر، اس طریقِ کار کی سست روی بعض اوقات گراں گذرتی ہے۔ وہ عام سیاسی جماعتوں کے ہنگامہ آرائی کے پروگرام اختیار کرنے کی تجویز کرتے ہیں۔ ان کی خدمت میں گذارش ہے۔ کہ ہمارا یہ طریقِ کار، قرآنی فکر، تاریخی شواہد اور انسانی نفسیات کے گہرے مطالعہ پر مبنی ہے۔ جو احباب ہمارے ہمسفر ہونا چاہیں انہیں یہ سب کچھ سمجھ سوچ کر شریک ہونا چاہیئے۔ یہ کوہ کنی بڑی صبر آزما ہے۔ یہ، قرآن کریم کے الفاظ میں، پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے کے مرادف ہے جس میں قدم قدم ہی چلا جا سکتا ہے ورنہ سانس اکھڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یاد رکھیئے! قلب و نگاہ میں انقلاب اس براہیمی انداز ہی سے پیدا کیا جا سکتا ہے جس میں انہیں (تمثیلاً) بتایا گیا تھا کہ جنگل کے غیر مانوس پرندوں کو کیسے سدھایا جاتا ہے۔ اس میں شور و غوغا تو ایک طرف، پتہ کھڑکنے سے بھی پرندہ اڑ جایا کرتا ہے۔ اگر یہ مقصد ہنگامے برپا کرنے سے حاصل ہو سکتا تو خدا کے آخری رسولؐ کی عمرِ رسالت کا نصف سے زیادہ حصہ مکہ کی شکیب آزمائیوں میں کیوں گذر جاتا — بیتابیٔ تمنا اور صبر طلبیٔ عشق کی اس کشمکشِ پیہم میں اسلام کے السابقون الاولون کی قلبی کیفیات کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟

خبر نہیں کہ نگارِ سحر کی حسرت میں
تمام رات چراغِ وفا پہ کیا گذری

اسی قسم کی بیتابیٔ تمنّا کا مظاہرہ بعض ایسے احباب کی طرف سے بھی ہوتا ہے جو تقاضا کرتے رہتے ہیں کہ اب ہمیں کچھ اور پروگرام بھی ملنا چاہیئے۔ میں ایسے احباب سے باادب پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے موجودہ پروگرام کو بخیر و خوبی مکمل کر چکے ہیں جو اس کی اگلی کڑی کا تقاضا شروع کر دیا ہے؟ آپ کا موجودہ پروگرام یہ ہے کہ قرآنی فکر کو ملک میں اس طرح عام کیا جائے کہ قرآنی نظام کے قیام کا تقاضا آپ کی اپنی جماعت ہی کا نہیں، پوری ملّتِ پاکستانیہ کا قلبی تقاضا بن جائے۔ ذرا سوچیئے، کہ کیا یہ کچھ ہم کر چکے ہیں؟ کیا اس فکر کی اشاعت ملک گیر ہو چکی ہے؟ کیا آپ اسے ہر کان تک پہنچا چکے اور اسے ہر دل میں اتارنے کا فریضہ ادا کر چکے ہیں؟ — جب آپ اس فریضہ سے فارغ ہو جائیں گے تو پھر اس پروگرام کی اگلی کڑی کا مطالبہ کیجیئے گا۔ اس وقت اگلی کڑی کا مطالبہ قبل از وقت ہے ؎

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی

بڑھے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی!

میرے عزیز ہم سفرو! اگر آپ درازیٔ منزل اور سستیٔ رفتار سے تھک کر بیٹھ گئے، تو یاد رکھیئے — آپ کی ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔ منزل سے دو قدم ورے تھک کر بیٹھ جانے والا اور سرے سے آغازِ سفر نہ کرنے والا، نتیجہ کے اعتبار سے دونوں برابر ہوتے ہیں۔ لیکن وقت اور توانائی کے ضائع ہونے کے اعتبار سے، منزل کے قریب پہنچ کر بیٹھ جانے والا، زیادہ خاسر و نامراد ہوتا ہے اُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ۔ انہی کے لئے آیا ہے۔ مخاطر رہیئے کہ کہیں آپ کا شمار بھی اسی زمرہ میں نہ ہو جائے — یہ بڑی حرماں نصیبی ہوگی۔ ؎

راہوں کا غبار ہو گئے ہیں

جن کو نہ ملے تیرے ٹھکانے

یہ آوازیں بھی میرے کانوں میں پڑتی رہتی ہیں کہ صاحب! جو کچھ ہم کہتے ہیں اس پر پہلے ہمیں خود عمل کرنا چاہیئے اس کے بغیر ہم دوسروں کو اس کی دعوت کس طرح دے سکتے ہیں؟ یہ اعتراض بظاہر وزنی معلوم ہوتا ہے اس لئے بڑی توجّہ کا محتاج ہے۔ پہلے آپ اسے سمجھ لیجیئے کہ ہم کہتے کیا ہیں؟ ہم کہتے یہ ہیں کہ ملک کا سیاسی، معاشی، معاشرتی نظام قرآنی بنیادوں پر متشکل ہونا چاہیئے۔ سوال

یہ ہے کہ اس دعوت یا مطالبہ پر ہم انفرادی طور پر کس طرح عمل کر سکتے ہیں؟ ہمارا کام یہ ہے کہ اس دعوت کو عام کرتے جائیں۔ تا آنکہ ملک کے اجتماعی نظام میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جائے۔

البتہ ہماری اس فکر کا دوسرا گوشہ ایسا ہے جس پر انفرادی طور پر عمل کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہم باہمی معاملات میں (خواہ وہ اپنوں کے ساتھ ہوں یا غیروں کے) عدل و احسان سے کام لیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ تعاون کا ثبوت دیں۔ احترامِ انسانیت بہرحال ملحوظ رکھیں۔ ہم بات کے سچے اور قول کے پکے ہوں۔ حسد، کینہ، تنگ نظری، منافقت وغیرہ انسانیت کش جذبات سے اپنے سینوں کو پاک رکھیں۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے محاسن ہیں جن پر انفرادی طور پر عمل کیا جا سکتا ہے اور اس کی میں شروع سے تاکید کرتا چلا آ رہا ہوں۔ اگر کوئی شخص، قرآن کا نام لینے کے باوجود اپنے اندر اس قسم کی تبدیلی تا بحدِّ امکان پیدا نہیں کرتا تو اس کی بدنصیبی پر رونا چاہیئے۔

زتیرہ بختیِ آئینہ حیرتے دارم!
تراکشید در آغوش و آفتاب نشد!

اس قسم کے اعمالِ حیات پر عمل، خارجی قوانین، یا رسمی قواعد و ضوابط کی رُو سے نہیں کرایا جا سکتا مالی خیانتوں کا عدل تو قانون کے زور سے کرایا جا سکتا ہے، نگاہ کی خیانتوں کا عدل دنیا کا کونسا قانون کرا سکتا ہے؟ یہ عدل صرف خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان کی رُو سے ہو سکتا ہے جو نگاہ کی خیانتوں اور دل کے ارادوں تک سے بھی واقف ہے۔ اگر قرآن کا نام لینے والوں کا دل بھی اس ایمان سے عاری ہے تو ان میں اور دوسروں میں فرق کیا ہے؟ یاد رکھیئے عزیزانِ من! آپ کی تحریک محض ایک تنظیم کا نام نہیں —— یہ دل و نگاہ کی تبدیلی کی تحریک ہے۔ یہ صرف قرآنی تصورات کو ذہنی طور پر سمجھ لینے کی تحریک نہیں۔ یہ ان تصورات کے مطابق اپنے اندر انقلاب پیدا کرنے کی تحریک ہے۔ اگر آپ کے اندر اس قسم کا انقلاب پیدا نہیں ہوتا، تو پھر آپ کی اس تحریک سے وابستگی نہ صرف بے مقصد ہے، بلکہ خود فریبی کا موجب بھی ہے۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ —— تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

لیکن اس ضمن میں ایک ابلیسی حربہ سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے۔ ہمارا پندارِ نفس

ہمیں ہمیشہ اکسایا رہتا ہے کہ ہم دوسروں کے نقائص تلاش کرتے اور انہیں ان کی کمزوریوں پر مطعون کرتے رہیں۔ ہں سے اس کا مقصد اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا رکھنا ہوتا ہے کہ مجھ میں یہ کمزوریاں نہیں ۔ جب آپ کسی کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ بڑا تنگ نظر ہے تو اس سے آپ درحقیقت اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ میں تنگ نظر نہیں، کشادہ ظرف ہوں۔ یہ نفس انسانی کا بہت بڑا فریب ہے۔ انسان کے لئے سب سے مقدم کرنے کا کام احتساب خویش ہے۔ آپ نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ قرآن کریم نے انسان کا سب سے بڑا محاسب خود اس کے اپنے نفس کو قرار دیا ہے۔ اس لئے ہمیں دوسروں کے نقائص کی ٹوہ میں رہنے کے بجائے خود اپنی کمزوریوں پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔ آپ کے محاسن، دوسروں کی اصلاح کا مؤثر ترین ذریعہ بن سکتے ہیں۔

جہاں تک آپ کی تحریک کی رفتارِ ترقی کا تعلق ہے، اسے آپ بزموں کے اراکین کی تعداد سے نہ ناپئے۔ بزموں کی رکنیت کی شرائط بڑی کڑی ہیں اس لئے اس منزل تک پہنچنے والوں کی تعداد زیادہ ہو نہیں سکتی۔ لیکن جہاں تک آپ کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کا تعلق ہے، بلاشائبہ تردید کہا جاسکتا ہے ـــــ اور یہ کہتے ہوئے میرا سر نیاز بدرگاہِ رب العزت جھک جاتا ہے ـــــ کہ اس وقت ملک کے سنجیدہ، ہوشمند طبقہ میں کوئی دوسری فکر اس قدر مقبول نہیں، بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ملک میں کوئی دوسری مربوط قرآنی فکر موجود ہی نہیں۔ آپ کسی صاحبِ ہوش سے بات کر کے دیکھئے۔ وہ آپ کی زبان میں گفتگو کرے گا۔ آپ کو یوں محسوس ہو گا گویا وہ پہلے ہی سے آپ کی تلاش میں تھا۔ کسی فکر سے فضا کا غیر شعوری طور پر اس طرح معمور ہو جانا، عزیزانِ من! کچھ کم کامیابی نہیں ـــــ اور کامیابی بھی اس بے سروسامانی کے ساتھ!

عشق جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے

آپ کی اس فکر سے ذہنوں میں یہ تعمیری تبدیلی ہو رہی ہے۔ دوسری طرف یہ کیفیت ہے کہ غیر قرآنی فکرِ قدیم کی عمارتوں کی اینٹیں ایک ایک کر کے گرتی چلی جا رہی ہیں۔

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے

کہیں کوئی مذہب گزیدہ حجرۂ مسجد سے یہ کہتا ہوا نکلتا نظر آتا ہے کہ:-

تیری باتوں سے آج تو واعظ　　وہ جو تھی خواہش نجات گئی!

اور کہیں کوئی "ارباب طریقت کا زخم خوردہ" یہ کہتا ہوا گوشہ خانقاہ سے باہر نکلتا دکھائی دیتا ہے کہ

وہی خاص وعام کا تفرقہ، وہی بخشش وکرم کا معاملہ
میں سمجھ رہا تھا کہ میکدہ میں سکوں ملے گا، مگر کہاں

غرضیکہ عجمی فکر قدیم کی ہر عمارت کی بنیادوں میں تزلزل آچکا ہے اور ہر صاحب عقل و ہوش کسی پناہ گاہ کی تلاش میں یوں سراسیمہ پھر رہا ہے، جیسے زلزلہ کی آمد سے پہلے، پرندے حواس باختہ پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان مضطرب و سکون باختہ قلوب کو قرآن کے آستانے کے سوا اور کہاں پناہ مل سکتی ہے۔ برادرانِ عزیز! خود زمانے کے تقاضوں نے آپ کی پیش کردہ قرآنی فکر کے لئے فضا کو سازگار کر دیا ہے یہ اگر ملائکہ کی تائید نہیں تو اور کیا ہے؟ کس قدر خوش بخت ہے آپ کا یہ مختصر سا گروہ، جس نے قرآن کے پیغام کو اس وقت عام کیا جس وقت زمانہ خود اس کی تلاش میں تھا۔ اسے اچھی طرح سن رکھئے کہ زمانے کا مستقبل آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم زمانے کی امامت کے لئے بھیجا گیا ہے اور آپ ہی قرآن کا پیغام زمانے کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

تحریک کے فروغ کے سلسلہ میں ایک اور اہم نکتہ کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ نکتہ میں اس سے پہلے بھی آپ حضرات کے سامنے پیش کر چکا ہوں لیکن اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے بار بار دہرایا جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی تحریک بھی پیسے کے بغیر چل نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں مالی قربانی پر اس قدر زور دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ تحریکوں میں مالدار بھی شامل ہوتے ہیں اور غریب آدمی بھی۔ اور آسمانی انقلاب کی تحریک کے سلسلہ میں تو ابتداءً غریب لوگ ہی زیادہ تعداد میں آگے بڑھتے ہیں۔ قرآن کریم نے انبیاء کرامؑ کی جن جماعتوں کا ذکر کیا ہے اس میں اس حقیقت کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا، آپ کی اس تحریک میں بھی زیادہ تعداد غیر مستطیع احباب کی ہے اور بہت کم حضرات ایسے ہیں جو تحریک کے مالی کاموں میں نمایاں حصہ لے سکتے ہیں۔ جو حضرات تحریک کی مالی امداد کرتے ہیں۔ ان کی یہ قربانی قابلِ ستائش ہے اور ہم میں سے ہر ایک کو اس کا احساس کرنا چاہیئے۔ لیکن جو احباب غیر مستطیع ہیں، اور مالی تعاون نہیں کر سکتے، یا نسبتاً کم حصہ لے سکتے ہیں، انہیں اپنے دل میں قطعاً اس امر کا خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ ان کا مقام دیگر احباب کے مقابلہ

میں کسی طرح بھی پست ہے۔ قرآنی میزان میں عزت اور مقام کا معیار عمل ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مالی امداد عمل کی صرف ایک شکل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عمل کی دوسری شکلوں میں ان احباب کا پلڑا جھکتا ہو جو مالی امداد نہیں کر سکتے، یا اس میں دوسروں سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر مالی امداد کرنے والے محض اپنے اس عمل کی وجہ سے غیر مستطیع احباب کو ذرا بھی کسی ایسی نگاہ سے دیکھیں گے جس سے ان کی کسی قسم کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہو تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جائے گا۔ سورہ توبہ میں ہے۔ وَ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُھْدَھُمْ ــــ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْھُمْ ــــ تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس تحریک کے لئے اپنی دوڑ دھوپ کے علاوہ اور کچھ پیش کر سکنے کے قابل نہیں بعض لوگ انہیں بنظر حقارت دیکھتے ہیں اور ان کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْھُمْ وَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۹/۷۹)ــــ ان کی اس ذہنیت کا نتیجہ ان کے لئے الم انگیز تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ ــــ محض امارت کو تقرب خداوندی کا ذریعہ سمجھنے والوں کے متعلق دوسرے مقام پر ہے کہ وَ مَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓی ــــ خالی مال و دولت یا جتھ کی زیادتی تمہیں خدا کا مقرب نہیں بنا سکتی ــــ اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ــــ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم قرآنی ھدایت کی صداقت پر ایمان رکھو اور صلاحیت بخش کام کرو۔ اس کے ساتھ ہی اگر تم مالی قربانی بھی کر دو گے تو ــــ فَاُولٰٓئِكَ لَھُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا ــــ (۳۴/۳۷)۔ تو تمہارے اعمال کا تمہیں دُگنا معاوضہ ملے گا۔ لہٰذا، ہمیں قرآن کریم کی اس راہنمائی کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے ــــ اور ایک دوسرے کے ساتھ اخوت اور مساوات کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ یاد رکھئے ــــ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ــــ بارگاہِ خداوندی میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے۔ خود میری نگاہوں میں بھی، وہ غریب دنادار جو قلب سلیم اور نگاہِ پاک ہیں لے کر آتا ہے، زیادہ محبوب ہوتا ہے ــــ ؎

شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

میں نے اس دفعہ اپنے ایک خطاب کا موضوع "میرا پیغام" رکھا ہے جس میں آپ کی اس تحریک کی تفصیل آجائے گی۔ اس لئے میں اس وقت صرف انہی چند اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

لیکن آخر میں ایک گذارش ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ احباب اتنا دور دراز کا سفر طے کر کے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ آپ تحریک کے مختلف پہلوؤں پر بحث و تمحیص کریں گے۔ باہمی مشاورت سے کچھ فیصلے کریں گے جنہیں قراردادوں کی شکل میں پاس کریں گے۔ علاوہ ازیں کچھ انفرادی وعدے بھی کریں گے۔ ان قراردادوں اور وعدوں کے متعلق اتنا خیال رکھیئے کہ ان کی حیثیت پختہ معاہدوں کی ہے جن کا پورا کرنا آپ کا قرآنی فریضہ ہو جاتا ہے۔ "قرآنی فریضہ" اس لئے کہ قرآن کریم نے ایفائے عہد پر بڑا زور دیا ہے اور کہا ہے کہ وعدوں سے متعلق تم سے بارگاہِ خداوندی میں سوال ہوگا۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا یا نہیں۔ لہذا، آپ قراردادیں پاس کرتے، یا انفرادی وعدے کرتے وقت سوچ لیجئے کہ آپ انہیں پورا بھی کر سکیں گے یا نہیں۔ جن قراردادوں پر آپ عمل نہ کریں، یا جن وعدوں کو پورا نہ کریں، ان کا یہاں اعلان کر کے، آپ خواہ مخواہ عدالتِ خداوندی میں مجرم کیوں بنتے ہیں؟ اس سے تو بہتر ہے کہ آپ اس قسم کے وعدے کریں ہی نہیں۔ اس سے آپ ایسے سنگین جرم کے ارتکاب سے تو بچ جائیں گے۔ اگر آپ نے اپنے کسی سابقہ وعدہ کو ابھی تک پورا نہیں کیا تو اس کی خود اپنے آپ سے معافی مانگیئے۔ اور آیندہ ہر وعدہ سے پہلے سوچ لیجئے کہ آپ اسے پورا بھی کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر قرآن کریم کی تعلیم سے ہم نے اپنے اندر اتنی تبدیلی بھی پیدا نہیں کی کہ ہم ان وعدوں کی پاسداری کریں جو ہم خود اپنی تحریک کے ساتھ کرتے ہیں، تو اس تعلیم کا فائدہ کیا ہوا؟ —— اس پر بڑی سنجیدگی سے غور کیجئے، عزیزانِ من! کہ یہ بڑی غور طلب بات ہے!

آخر میں، میری دلی آرزو ہے کہ آپ کا یہ اجتماع ان بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنے، جن کے لئے آپ اس تحریک سے وابستہ ہیں اور آپ کی کوششیں بارآور ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

والسلام

پرویز

۱۸ مارچ کا کھلا اجلاس

۳ بجے بعد دوپہر کنونشن کا پہلا کھلا اجلاس شروع ہو رہا تھا۔ مفکر قرآن اس اجتماع عام میں ارشاد فرما

کے اہم موضوع پر خطاب فرمارہے تھے۔ خطاب کی اہمیت کے پیشِ نظر اجلاس میں بے پناہ حاضری کی توقع تھی۔ اس لئے کنونشن کمیٹی نے قبل از وقت نشستوں کے سلسلے میں بڑے معقول انتظامات مکمل کر لئے تھے۔ اجلاس شروع ہونے میں ابھی نصف گھنٹہ باقی تھا کہ اہلِ ذوق کی آمد کا تانتا بندھ گیا۔ اور جب اجلاس شروع ہوا تو پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

ناظم ادارہ کے مناسب تعارف اور تلاوتِ کلام پاک اور نظمِ اقبال کے بعد مفکرِ قرآن اہلِ شوق کی بیتابیٔ تمنا کے لئے منت کشِ ایجاب بن کر اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ پنڈال کے ہر گوشے سے پرجوش تالیوں سے ان کا خیر مقدم کیا۔ "آرٹ اور اسلام" کا موضوع بصیرتِ قرآنی کی تب وتاب اور مفکرِ قرآن کا حسنِ بیان — پوری فضا تحسین و آفرین کی والہانہ صداؤں سے جھوم اٹھی۔ مذہبی پیشوائیت حسنِ کائنات اور فنِ لطیف کے بارے میں کس قدر رجعت پسندانہ اور منفی نقطہ لئے ہوئے ہے قرآن کریم کی بارگاہ میں اس کی اہمیت کیا ہے۔ وہ کن شرائط کے ساتھ جمالیات سے متمتع ہونے کی تاکید کرتا ہے اور جب وہ حسن کی تعریف ہی صحیح توازن و اعتدال سے کرتا ہے تو کس طرح وہ یہ توقع کرتا ہے کہ حسنِ کائنات سے لذت یاب ہونے میں بھی اعتدال اور توازن قائم رکھا جائے۔

انہوں نے آرٹ کا قرآنی مفہوم متعین کرتے ہوئے اقبالؒ کے الفاظ میں کہا کہ؎

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حُسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں

اور ——

اگر بایں نرسیدی، تمام بولہبی است

ہم ہر شئے کے جانچنے اور اس کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کے لئے عقلِ خود فریب کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ حق اور باطل میں امتیاز قائم کرنے کے لئے خالقِ کائنات کی عطا فرمودہ روشنی قرآن کریم کی صورت میں موجود ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ مفکرِ قرآن کی فکر و بصیرت کا امتیازی پہلو یہی ہے کہ وہ ہر معاملہ میں قرآن کے سرچشمۂ حقیقت سے روشنی حاصل کرتی، اور اس کے فیصلے کو حرفِ آخر کا درجہ دیتی ہے۔ اسی امتیازی خصوصیت کے ساتھ جب وہ کسی اہم سے اہم موضوع کو منظرِ عام پر لاتے ہیں تو حقیقت کشائی کا یہ انداز قلب و نگاہ کو ایک نئی روشنی عطا کر دیتا

ہے۔ آرٹ کے موضوع پر ان کا یہ خطاب اسی حقیقت کا آئینہ دار تھا۔ اور حاضرین یہ محسوس کر رہے تھے کہ ظن و تخمین کی بھول بھلیوں سے دامن چھڑا کر وہ ایک تابناک فضا میں پہنچ گئے۔

۱۹ مارچ ½ ۸ بجے شب

مجلس استفسارات

۱۹ مارچ کی شب کو کنونشن کی اس اہم ترین اور علم افروز مجلس کا انعقاد تھا جو مجلس استفسارات کے نام سے ہر سالانہ کنونشن میں نمایاں دلکشی کی حامل قرار پاتی ہے۔ اس نشست میں مفکرِ قرآن زندگی کے عملی مسائل سے متعلق ہر اہم سے اہم سوال کا جواب قرآن کریم کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ساڑھے آٹھ بجے شب کنونشن کا پنڈال حاضرین سے کھچا کھچ بھر چکا تھا۔ انہوں نے اپنی مخصوص نشست سنبھال لی اور ضابطہ کی پابندیوں سے آزاد اس مجلس کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ سابقہ اجلاس کے اختتام پر اس سلسلے میں جو اعلان عام کیا گیا تھا اس کے مطابق سوالات کا پلندہ میز پر پہنچ چکا تھا۔ اپنے جوابات پیش کرنے سے قبل پرویز صاحب نے اپنے افتتاحی خطاب میں فرمایا کہ کنونشن کی یہ مجلس ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے اور ہم اس مجلس میں رسمی پابندیوں سے آزاد ہو کر ایک گھرانے کے افراد کی طرح جمع ہوتے ہیں۔

آپ کے سوالات میرے سامنے ہیں اور آپ میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہوگی کہ اُسے اپنے سوال کا جواب مل جائے۔ لیکن یہ سوالات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان سب کے جواب کے لئے ایک الگ کنونشن منعقد کرنی چاہیئے۔ اس لئے اس ایک نشست میں یہ ممکن نہیں ہوگا کہ میں ہر ایک کی خواہش کو پورا کر سکوں۔ میں قرآن کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور قرآن کی بارگاہ سے جو کچھ سمجھا ہے اُسے پیش کرتا ہوں۔ میں اپنی کسی بات کو غلطیوں سے پاک اور منزہ نہیں سمجھتا۔ اور نہ میری فکر و بصیرت کی کوئی پیش کش حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ میں اپنی غلطی کا بھی فراخدلی سے اعتراف کر لیتا ہوں بشرطیکہ اس غلطی کو قرآن کریم کی روشنی میں مجھ پر واضح کر دیا جائے۔

میں اپنی اسی بصیرتِ قرآنی کی روشنی میں آپ کے سوالات کے جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ اگر آپ کا اطمینان ہو جائے تو مجھے مسرت ہوگی اور اگر کوئی بات وضاحت طلب رہ جائے تو آپ کسی

فارغ وقت میں میرے پاس تشریف لاکر اس کی مزید وضاحت طلب کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ لیکن میں مناظرہ بازی کا قائل نہیں اور جو شخص ایسا ارادہ لے کر آنا چاہتا ہے میں اس سے معافی کا خواستگار ہوں۔

ان الفاظ کے ساتھ انہوں نے سوالات کا پلندہ سنبھال لیا اور ایک ایک کر کے بڑے اہم سوالات اور ان کے جوابات مجلس کے سامنے آنے لگے۔ حالیہ جنگ میں سبز پوشوں کی امداد اور نزولِ ملائکہ کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ دعاؤں سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ بنی اسرائیل کی تباہی کے محرکات کیا تھے؟ قطبین میں جہاں چھ چھ ماہ کے دن اور رات ہوتے ہیں، نماز اور روزہ کے اوقات کیونکر متعین ہوں گے؟ نظامِ ربوبیت کا قیام کیونکر ممکن ہوگا؟ ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء اور اسلامی تصورِ ارتقاء میں فرق کیا ہے؟ اسلام میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت کن حالات میں ہے۔ الائمہ من قریش کی روایت کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ تخلیقِ کائنات کا مقصد کیا ہے؟ —— یہ اور اس قسم کے لاتعداد سوالات سامنے آئے اور مفکرِ قرآن نے جس حقیقت کشا اور بصیرت آفرین وضاحت کے ساتھ قرآن کریم کی روشنی میں جواب دیئے اس سے بار بار سینکڑوں لبوں پر تحسین و آفرین کی بے ساختہ صدائیں اُبھرتی رہیں اور رات گئے تک پوری مجلس پر نور و نکہت کا پر کیف سماں طاری رہا۔ مجلس میں ہر مکتبۂ فکر و خیال کے وابستگان شامل تھے اور ان سب کے قلب و نگاہ برملا شہادت دے رہے تھے کہ ذہنِ انسانی کی الجھنوں کی جو عقدہ کشائی قرآن کے بابِ عالی سے میسر آ سکی ہے وہ کسی دوسری بارگاہ سے ممکن نہیں —— سوا گیارہ بجے شب کے قریب جب اس مجلس کا اختتام لازم ہو گیا تو ہر دل میں یہی ایک آرزو مچل رہی تھی کہ یہ نشست برابر جاری رہے اور یہ رات کبھی ختم نہ ہو۔

۲۰ مارچ —— نو بجے صبح کا کھلا اجلاس

اگلی صبح اتوار کی صبح تھی —— سرکاری دفتروں کی تعطیل اور کاروبار کی بندش کے باعث یہ زندہ دلانِ لاہور کی فراغت کا دن تھا اور اس کے پیش نظر پنڈال میں حسب ضرورت نشستوں کا مزید انتظام کر دیا گیا۔ اس اجلاس میں پرویز صاحب کے خطاب کا عنوان تھا —— "میرا پیغام" —— یعنی اس اجتماع میں عشق کے دردمند کا وہ پیغام وجہ شادابیٔ قلب و نگاہ بن رہا تھا جس میں دیدۂ تر کی

بے خوابیوں، نالہ ہائے نیم شب کا گداز، رومی کا سوز و ساز۔ رازی کا پیچ و تاب۔ اس پیچ و تاب میں ڈوبی ہوئی امنگیں اور جستجوئیں اور سب سے بڑھ کر بصیرتِ قرآنی کی شدتِ آرزو کا حسین امتزاج نور و نکہت کی دل کشائیاں لیے ہوئے تھا۔ انسانی مفاد پرستیوں کی روشِ کہن کے ہاتھوں دینِ خداوندی پر کیا بیتی؟ خدا کا یہ عالم آرا دین از سرِ نو کیونکر حیاتِ انسانی کا مرکز و محور قرار پائے! کشف و الہام اور تصوف کی توہم پرستیوں کے لات و منات کی خدائی کیسے ختم ہو! دین و دنیا کی ثنویت کے تصورِ باطل سے کیونکر نجات حاصل ہو! نظامِ سرمایہ داری اور فرقہ بندی کی ظلمت انگیزیوں نے کیا کیا ڈھونگ رچائے! تحریکِ پاکستان کا منشا ر و مقصود کیا تھا اور مذہبی پیشوائیت کیونکر اس کے آڑے آئی! خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا مفہوم کیا ہے اور اس کے قیام کا مقصد کیا! بڑھائے طلوعِ اسلام کی تشکیل کن تقاضوں کی حامل ہے! نئی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کس قدر ضروری اور ناگزیر ہے! — پرویز صاحب کا پیغام انہی نکات کی تفسیر اور انہی اجمال کی تفاصیل پر مشتمل تھا۔ پرویز صاحب نے اس پیغام کے ایک ایک گوشے کی وضاحت کی اور گذشتہ تیس پینتیس برس میں اس دعوتِ قرآنی کے جو محرکات ابھر ابھر کر سامنے آتے رہے انہوں نے ایک ایک کر کے ان سب کو اجاگر کیا۔

خطاب کے آخر میں انہوں نے طلوعِ اسلام کالج کے قیام اور بالآخر اسے یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کی ضرورت و اہمیت واضح کی اور اسے اپنی دعوتِ انقلاب کی آخری کڑی قرار دیا۔ کیونکہ یہی درسگاہ اس پیغام کے مقصود و منتہا کو محسوس و مشہود پیکروں میں متشکل کر سکے گی۔ اور اسی سے قوم ایک نیا موڑ مڑنے اور تاریخ کے دھارے کا رُخ بدلنے کے قابل ہو سکے گی۔ انہوں نے آخر میں دعا کی کہ خدا اس شدتِ آرزو اور بیتابیٔ تمنا کو شرفِ اجابت عطا فرمائے۔

اس خطاب کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے بجنسہٖ یہاں درج کر دیا جائے۔ سو آپ اسے ملاحظہ فرمائیں۔

میرا پیغام

مئے من از تنک حباماں نگہدار شراب پختہ از خاماں نگہدار
شرر از نیستانے دور تر بہ بخاصاں بخشش و از عاماں نگہدار

برادران عزیز ـــ السّلام علیکم

جیساکہ آپ احباب کو معلوم ہے، میں گذشتہ پچیس تیس برس سے مسلسل قوم کے نام ایک پیغام دیئے چلا آ رہا ہوں۔ جوں جوں اس پیغامِ حیات آور کے اثرات فضا کی پہنائیوں میں پھیلتے اور دلوں کی گہرائیوں میں اُترتے جا رہے ہیں۔ مفاد پرست طبقات کی طرف سے اس کی مخالفت بڑھتی جا رہی ہے چونکہ مخالفین کے پاس، اس پیغام کی تردید کے لئے نہ کوئی سند ہے نہ دلیل، اس لئے وہ کرتے یہ ہیں کہ پہلے اسے نہایت غلط انداز سے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر ان غلط بنیادوں پر اپنی مخالفت کی عمارت استوار کرتے چلے جاتے ہیں ـــ یہ منکرِ خدا ہے۔ یہ منکرِ رسالت ہے۔ یہ ایک نیا مذہب پیش کر رہا ہے۔ یہ تین نمازیں اور نو دن کے روزے بتاتا ہے، یہ اردو زبان میں نماز پڑھنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ کسی دن نبوت کا دعویٰ کرے گا ـــ یہ اور اس قسم کے اور بیسیوں الزامات نت نئے دن تراشے اور میری طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ چونکہ میرا پیغام، طلوعِ اسلام کے ہزارہا صفحات، اور میری تصانیف کے بے شمار اوراق میں بکھرا پڑا ہے۔ اور ہر شخص سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ طلوعِ اسلام کی فائلوں اور میری کتابوں

کی اوراق گردانی کرکے، اس پیغام کو اس کی حقیقی شکل میں اپنے سامنے لے آئے، اس لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اسے مختصر الفاظ میں یک جا بیان کر دیا جائے۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ میں کیا کہتا ہوں، اور کیا چاہتا ہوں اور قدامت پرست طبقہ کی طرف سے میرے خلاف جو الزامات عاید کئے جاتے ہیں۔ ان کی اصل و حقیقت کیا ہے جو کچھ میں کہتا ہوں، اس کی تفصیل کتنی ہی طول طویل کیوں نہ ہو، اس کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ

(۱) اسلام، خدا کی طرف سے دیا ہوا، آخری اور مکمل دین، یعنی نظام حیات ہے۔

(۲) اس دین کو نبی اکرمؐ نے عملاً متشکل کرکے، دنیا کو دکھا دیا کہ اس زمین پر خدا کی حکومت کا تخت اجلال کس طرح بچھتا ہے اور اس کے نتائج نوعِ انسان کے لئے کس قدر انسانیت ساز خوشگواریوں اور سرفرازیوں کے حامل ہوتے ہیں۔

(۳) بعد کے آنے والے مسلمانوں نے اس نظام کو آگے نہ چلایا۔ اور ہم خدا کی راہ کو چھوڑ کر انسانوں کے تراشیدہ غلط راستوں پر پڑ گئے جس کا نتیجہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

(۴) میری دعوت یہ ہے کہ ہم، ان غلط راستوں کو چھوڑ کر، پھر اسی نظام کو متشکل کرلیں۔ اس کے لئے بنیادی طور پر کرنے کا کام یہ ہے کہ اس نظام کے ضابطۂ حیات، یعنی قرآن کریم کو زندگی کے ہر معاملہ میں غلط اور صحیح، اور حق و باطل کا معیار قرار دیا جائے۔ جو کچھ اس کے مطابق ہو اُسے صحیح تسلیم کیا جائے اور جو اُس کے خلاف ہو اُسے مسترد کر دیا جائے۔

آپ کہیں گے کہ اس میں کون سی ایسی بات ہے جو خلافِ اسلام ہے، اور جس کی مخالفت میں اس قدر طوفان برپا کیا جا رہا ہے۔ اس میں خلاف اسلام تو کوئی بات نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ قرآنی نظام میں مفاد پرست گروہوں کا وجود باقی نہیں رہتا ـــ اس میں کسی فرعون، ہامان یا قارون کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی ـــ اس لئے ان گروہوں کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت ناگزیر ہے۔ لیکن ان لوگوں میں اتنی جرأت نہیں ہوتی، کہ برملا یہ کہہ سکیں کہ ہم اس کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ اس سے ہمارے مفادات پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے یہ "اسلام خطرے میں ہے" کی گھنٹی بجا کر عوام کو مشتعل کرتے رہتے ہیں اور یوں انہیں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے آلہ کار بناتے ہیں۔ ہماری پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جونہی کسی نے ان کی مفاد پرستی اور ارباب فریبی کے خلاف آواز بلند کی، انہوں نے کفر و الحاد کے فتوے لگانے شروع

کر دیئے۔ یہی کچھ پہلے ہوتا رہا ہے اور یہی کچھ آج ہو رہا ہے۔ ملک کے سنجیدہ، دانشور طبقہ سے میری شروع سے یہ گذارش رہی ہے۔ اور آج میں پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ جو کچھ میں کہتا ہوں آپ لسے خود قرآن کریم کی روشنی میں پرکھ کر دیکھیں اور فیصلہ کریں کہ وہ اسلام کے خلاف ہے یا اس کے مطابق۔

اب آپ دیکھئے کہ میرے پیغام کی تفصیل کیا ہے۔؟

میں ہنوز، قرآن کریم کو غور و فکر کے ساتھ سمجھنے کے ابتدائی مراحل میں سے گزر رہا تھا۔ کہ ۱۹۳۲ء میں مولانا ابو الکلام آزاد (مرحوم) کے تفسیری ترجمہ — ترجمان القرآن — کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ اس میں

مولانا آزاد کی تفسیر

انہوں نے، سورۃ الفاتحہ کی تفسیر کے سلسلہ میں اپنے اس نظریہ کی تبلیغ بڑی صراحت سے کی تھی کہ عالمگیر سچائیاں دنیا کے ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس لئے تمام مذاہب سچے ہیں۔ لیکن پیروان مذہب سچائی سے منحرف ہو گئے ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سرِ نو اختیار کر لیں تو میرا کام پورا ہو گیا — یہ فراموش کردہ سچائی کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں کہ اُس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے۔

میری بصیرت قرآنی کے مطابق، یہ نظریہ' اسلام کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ برہمو سماج کی تعلیم تو ہو سکتی ہے، قرآن کی نہیں۔ اس لئے میں نے اس کی تردید میں ایک تفصیلی مقالہ لکھا' جو ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) کی جنوری ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس میں میں نے کہا تھا کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کے رسول، دنیا کی ہر قوم کی طرف آئے تھے۔ اور وہ اصولی طور پر ایک ہی دین لائے تھے۔ لیکن وہ تعلیم اب دنیا کی کسی قوم کے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں' وہ صرف قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس لئے اب خدا کی طرف سے سچا دین وہی ہے جو اس کتاب کے اندر ہے۔ اب انسان کو نجات و سعادت کے لئے رسالتِ محمدیہ پر ایمان لانا' اور قرآن کریم کی طرف پیش کردہ دین کو خدا کا واحد' سچا دین تسلیم کرنا ضروری ہے۔ جو اس دین کو اپنا نصب العین حیات قرار نہیں دیتا۔ نہ اس کی خداپرستی' خداپرستی ہے۔ نہ نیک عملی درحقیقت نیک عملی۔

مولانا آزاد کی شہرت اس زمانے میں تا بہ ثریا پہنچی ہوئی تھی۔ وہ قلم اور زبان کے بادشاہ' اور

علم کے سمندر سمجھے جاتے تھے۔ علماء کی صف میں وہ امام الہند قرار دیئے جاتے تھے۔ ان کی پیش کردہ تفسیر کی مخالفت، اور وہ بھی ایک "غیر مولوی" کی طرف سے، کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ اس لئے ابتداً ہر طرف سے میری مخالفت ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب ہنگامہ خیزی کے بادل چھٹے تو، اور تو اور، خود مولانا آزاد کے حلقۂ ارادت کے بعض نامور افراد تک نے بھی میری گزارشات کو درخورِ غور و فکر سمجھا، اور مولانا آزاد کے پیش کردہ تصور کو غلط قرار دیدیا۔

دین اور مذہب

جب میں نے مولانا آزاد کے پیش کردہ نظریہ کی لِم پر غور کیا — جو بظاہر بڑا خوش آیند اور مذہبی رواداری کا آئینہ دار نظر آتا ہے — تو اس کی یہ وجہ سامنے آئی۔ کہ اسلام، جو خدا کی طرف سے عطا کردہ دین ہے، مذہب کی سطح پر آچکا ہے اور مذہب کی سطح پر مختلف مذاہب میں واقعی کوئی فرق نہیں رہتا — دین، زندگی کا عملی نظام ہے اور نظام ایک ہی سچا ہو سکتا ہے۔ اس نظام میں خدا پرستی سے مقصود ہوتا ہے، خدا کے قوانین کو دنیا میں عملاً نافذ کرنا۔ اور نیک عملی کے معنی ہوتے ہیں ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا — اس کے برعکس، مذہب نام ہوتا ہے خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا جو ہر قسم کے نظام میں قائم کیا اور باقی رکھا جا سکتا ہے۔ یہ تعلق، انسان کے اپنے ذہنی تصور سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس میں خدا پرستی سے اتنا ہی مقصود ہوتا ہے — باقی رہی نیک عملی، سو وہ چند اخلاقی مواعظ کا نام ہوتی ہے جو دنیا میں قریب قریب ہر جگہ یکساں پائے جاتے ہیں۔ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، کسی کو ستاؤ نہیں وغیرہ وغیرہ۔ حضرات انبیائے کرامؑ خدا کی طرف سے دین لائے لیکن، ان کے بعد، ان کے پیرو، اس دین کو مسخ کر کے مذہب کی سطح پر لے آئے۔ دنیا کے مذاہب، خدا کی طرف سے دیئے ہوئے دین کی مسخ شدہ صورتیں ہیں۔ یہ دین، اپنی آخری اور مکمل شکل میں، نبی اکرمؐ کی وساطت سے دنیا کو ملا۔ حضورؐ نے اسے عملاً متشکل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ اس کے نتائج، عالمِ انسانیت کے لئے کس قدر خوشگوار ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد، اس دین کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو اس سے پہلے دیگر اقوام کے یہاں ہوا تھا۔ اس کے نام لیواؤں نے رفتہ رفتہ اسے بھی مذہب کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ جس کی وجہ سے، یہ چند بے جان عقاید اور چند بے روح رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ اسی مذہب کا نام اب اسلام ہے۔ لیکن ہم میں اور دیگر اہلِ مذاہب میں فرق یہ ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس خدا کی کتاب، جس میں دین دیا گیا تھا، اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔ اور ہمارے پاس

قرآن کریم غیر محرف شکل میں محفوظ ہے۔ لہذا اگر وہ لوگ چاہیں بھی کہ وہ اپنے مذہب کو پھر سے دین میں تبدیل کرلیں تو ان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ لیکن ہمارے لئے یہ ممکن ہے۔ ہم قرآن کریم کی رُو سے خدا کے حقیقی دین کو پھر سے متشکل کر سکتے ہیں۔

بنیادی نقطہ میری دعوت کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ہم اپنے موجودہ مذہب کی جگہ، خدا کی طرف سے عطا کردہ دین کو دوبارہ قائم کریں تاکہ سب سے پہلے، ہمارے اپنے معاشرہ کا وہی نقشہ ہو جائے جو عہد مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ (رضی اللہ عنہم) میں تھا۔ اور اس کے بعد ہم اس کے انسانیت ساز نتائج کو سامنے لا کر، اس دین (نظامِ زندگی) کو باقی دنیا میں بھی عام کریں۔

ختمِ نبوّت

قرآنِ کریم کو دین کا مکمل ضابطہ ماننے، اور اس کے اپنی اصلی شکل میں محفوظ رہنے کا فطری اور لازمی نتیجہ، ختمِ نبوت کا عقیدہ ہے۔ نبوت کے معنی ہیں خدا کی طرف سے راہ نمائی پانا۔ یہی راہ نمائی دین کا ضابطہ کہلاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دین کا ضابطہ — جو کسی خاص زمانے اور خاص مقام کے لئے نہیں، بلکہ عالمگیر انسانیت کے لئے ابدی ضابطۂ حیات ہے — ہر طرح سے مکمل ہو گیا۔ اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ (جو ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے ہے)، تو پھر نبوت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی — ابدی، عالمگیر، مکمل اور محفوظ راہ نمائی کے بعد، خدا کی طرف سے کچھ اور دیئے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہذا، اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کرنے کے بعد لازمی طور پر اگلی کڑی یعنی ختمِ نبوت کی حقیقت اور اہمیت کو واضح اور اجاگر کرنا تھا۔ اور یہ میری دعوت کا دوسرا نقطہ تھا۔

اس زمانہ میں ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں، احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان ایک مقدمہ چل رہا تھا جس نے ملک میں خاصی شہرت حاصل کر رکھی تھی۔ اس سلسلہ میں بحث کا نقطہ، ماسکۂ ختمِ نبوت کا سوال تھا۔ مقدمہ کافی عرصہ تک چلتا رہا۔ بالآخر جج نے اپنا فیصلہ سنایا، اور اس میں ختمِ نبوت سے متعلق، میرے ایک مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے، اس نے لکھا کہ مقدمہ کے سلسلہ میں اس مسئلہ کو جس قدر

سلجھانے کی کوشش کی جاتی تھی یہ اسی قدر الجھتا چلا جاتا تھا، تا آنکہ (محولہ بالا) مقالہ میری نظر سے گزرا۔ اور اس نے اس مسئلہ کو اس طرح صاف کر دیا کہ اس بارے میں میرے دل میں کوئی شبہ باقی نہ رہا کہ ختمِ نبوت واقعی اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ میں نے اس مقالہ میں، اس موضوع پر، خالص قرآنی نقطۂ نگاہ سے بحث کی تھی جس کے بعد، اس میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

میں نے جب اس مسئلہ پر قرآن کریم کی روشنی میں غور کیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ ہم بابِ نبوت کے بند کرنے کے عقیدہ کے تو اس شد و مد سے قائل ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی، ہم ان عقائد اور نظریات پر بھی اسی شدت سے قائم ہیں جو اس دروازے کو نہایت آسانی سے کھول دیتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ بند ہونے ہی نہیں دیتے۔ یہ بات ذرا غور سے سمجھنے کی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، نبوت کے معنی ہیں خدا کی طرف سے وحی کا ملنا۔ وحی وہ علم ہے جو نبی کو خدا کی طرف سے براہ راست ملتا ہے۔ وحی کے علاوہ، ہر علم، انسان کی اپنی محنت و کاوش، غور و فکر، عقل و بصیرت، تجربہ و مشاہدہ وغیرہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن وحی میں ان امور کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ نبی کو خدا کی طرف سے، براہ راست ملتی ہے۔ ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کسی انسان کو اب خدا کی طرف سے ایسا علم نہیں مل سکتا۔ یہ علم، قرآن کریم کے اندر آ چکا ہے۔ اس کے بعد، اس کا دروازہ بند ہو گیا۔ اب انسانی علم کے ذرائع دو ہی ہیں —— قرآن کریم اور عقلِ انسانی۔

کشف و الہام

لیکن ہمارے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہوتا ہے جس میں ان کی اپنی عقل و فراست کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ آپ نے دیکھا کہ حقیقت کے اعتبار سے یہ بعینہٖ وہی چیز ہے جسے وحی کہا جاتا ہے لیکن انہوں نے اس کا صرف نام بدل دیا ہے۔ یہ اسے وحی کی بجائے الہام یا کشف کہتے ہیں۔ لیکن نام بدل دینے سے کسی شے کی حقیقت اور ماہیت تو نہیں بدل جاتی۔ خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونے کا نام وحی رکھ لیجئے یا الہام، بات ایک ہی ہے۔ اور یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، قیاس پر مبنی نہیں۔ ان حضرات کا دعوےٰ یہی ہے۔ چنانچہ سرخیلِ طائفہ صوفیا، شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی، اپنی مشہور کتاب فصوص الحکم میں لکھتے ہیں:-

جس مقام سے نبی لیتے تھے اُسی مقام سے انسان کامل، صاحب الزمان، غوث، قطب

لیتے ہیں...... ارباب شریعت تو وہ ہیں جو قرآن و حدیث سے حکم دیتے ہیں...... مگر اس کے برعکس ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف و الہام کے ذریعے خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں...... پس ایک طور پر مادۂ کشف و الہام اور مادۂ وحی رسول ایک ہے۔ صاحب کشف اللہ تعالیٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیین سے موافق ہے...... ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسول اللہ کا لینا ہے...... خدا تعالیٰ ایسے لوگوں کو وہی احکام شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر کے انبیاء کو دیئے گئے تھے۔

آپ نے غور فرمایا' برادران عزیز! — کہ اس عقیدہ کے بعد' وحی رسول اور ان حضرات کے الہام

تصوف

اور کشف میں کوئی بھی فرق رہ جاتا ہے؟ یہ عقیدہ' تصوف کی اصل و بنیاد ہے۔ صوفیہ کے مختلف خانوادوں میں' فروعات کا جو فرق ہو سو ہو' لیکن یہ بنیادی عقیدہ ہر ایک کے ہاں پایا جاتا ہے۔ لہذا' تصوف' اسلام میں اس ہیر کو توڑنے کے لئے لایا گیا تھا جس نے نبوت کے دروازے کو بند کیا تھا۔ یہ مذہب کی سطح پر ہی مسلمانوں میں آسکتا تھا۔ دین میں اس قسم کے عقاید کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

وحدت الوجود

(دو ایک خانوادوں کو چھوڑ کر) تصوف کا دوسرا بنیادی عقیدہ وحدت الوجود ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے — انسان' حیوان' درخت' پہاڑ وغیرہ — یہ سب خدا ہی ہے جس نے مختلف روپ دھار رکھے ہیں۔ اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ وہ ہے جسے ابن عربی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے (جنہیں میں ہزار ہزار توبہ کے بعد نقل کرنے کی جرأت کرتا ہوں) نصوص الحکم میں لکھا ہے۔

اس (فرعون) کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے — اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی — کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔

اتنا ہی نہیں' بلکہ وہ تو اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ' معاذ اللہ' صد ہزار بار معاذ اللہ)

در مذہب عاشقان یک رنگ		ابلیس و ...[1]... است یک سنگ		(حکیم سنائی)

---

[1] یہاں حضور نبی اکرمؐ کا اسم گرامی لکھا ہے۔ (استغفر اللہ)

رومی کہتا ہے ۔

می گفت دربیاباں رندِ دھن دریدہ!
صوفی خدا ندارد، اونیست آفریدہ

ان کے نزدیک، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں جس جس چیز کو لوگوں نے اپنا معبود بنا رکھا ہے وہ سب خدا ہی ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ

کفر دین است در رہت پویاں
وَحدَہٗ لَا شَرِیکَ لَہٗ گویاں

اور پنجابی زبان میں تو آپ نے اس قسم کی کافیاں اکثر سنی ہوں گی کہ۔

آپے دِھیاں، تے آپے پُتّر، آپے بَنیا ماپے
آپے مارے، تے آپے پٹّے، آپے کرے سیاپے!

یعنی ______

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِلِ کوزہ خود رند وسبوکش
خود بر سرِ آں کوزہ خریدار برآمد، بشکست و رواں شد

یہ حضرات جو ہمارے ہاں بڑے بڑے صوفیائے کرام اور ولی اللہ کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا یہی عقیدہ تھا (اور اب بھی وہ یہی عقیدہ رکھتے ہیں)۔

اسی عقیدہ کی ذرا سی بدلی ہوئی شکل یہ ہے کہ انسانی روح، خدا کی روح کا ایک حصہ ہے یہ روح مادہ کی دلدل میں پھنس چکی ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح اس روح کو مادہ کی دلدل سے نکال دے۔ تاکہ یہ جُز اپنی اصل (روح خداوندی) کے ساتھ جا کر مل جائے۔ روح کی اسی جدائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا رومؒ اپنی مشہور مثنوی کا آغاز اس طرح کرتے ہیں کہ

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائیہا شکایت می کند

اور غالب تنگ دتاز زندگی کا منتہی یہ بتاتا ہے کہ

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان دنیا سے نفرت کرے، خانقاہیت کی زندگی اختیار کرے۔ جوں جوں انسان اس طریق خانقاہیت میں پختہ ہو جائے گا۔ خدا کا مقرب بنتا جائے گا۔ افراد، اور اقوام کی تقدیر اس کے ہاتھ میں ہو گی۔ وہ اپنی زندگی میں ہی نہیں، مرنے کے بعد بھی لوگوں کی قسمت کے فیصلے کرے گا۔

اس عقیدہ نے یونان میں جنم لیا۔ ایران کے آتشکدوں میں اسے پختگی حاصل ہوئی۔ ہندوستان میں آکر اس نے ویدانت کے طلسماتی فلسفہ کی شکل اختیار کی اور پھر مسلمانوں میں عین دین ہی نہیں بلکہ مغز دین بن گیا۔ چنانچہ مولانا رومؒ لکھتے ہیں کہ

بازقرآں مغز را برداشتیم

استخواں پیش سگاں انداختیم

یہ ہے وہ تصوف، جسے عین اسلام ہی نہیں، بلکہ مغز اسلام کہا جاتا ہے۔ اور یہ ساری دنیا کے مسلمانوں میں عام ہے اور ہر ایک کے ذہن پر مستولی۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے وہ فرقے جو اپنے آپ کو متشدد طور پر بدعت کے خلاف اور متبع سنتِ رسول اللہؐ کہتے ہیں، وہ بھی کشف و الہام کے قائل اور کرامات کے معتقد ہیں۔ بیعت لیتے ہیں اور ورد و وظائف کی تعلیم دیتے ہیں۔ قرآنی آیات کے تعویذ لکھتے ہیں اور پانی دم کر کر کے مریدوں کو پلاتے ہیں۔

میرا پیغام یہ ہے۔ کہ جب تک ہم میں تصوف باقی ہے، ہم دین کی سطح پر نہیں آسکتے۔ تصوف کا نام تک نہ قرآن کریم میں ملتا ہے، نہ ہمارے ابتدائی لٹریچر میں کسی اور جگہ۔ یہ، اقبال کے الفاظ میں، اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے۔

مامورین من اللہ

ختمِ نبوت کا عملی مفہوم یہ تھا کہ اب کوئی شخص یہ دعوےٰ نہیں کرسکے گا کہ میں مامور من اللہ ہوں یعنی مجھے خدا نے ایک خاص مقصد کے پورا کرنے کے لئے دنیا میں بھیجا ہے۔ خدا کی طرف سے مامور، حضرات انبیاء کرامؑ ہوتے تھے۔ جب نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا، تو مامورین من اللہ کی آمد بھی بند ہو گئی۔

لیکن جب اسلام، دین کی سطح سے گر کر مذہب کی سطح پر آ گیا، تو ہم میں یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ ماموریین من اللہ وقتاً فوقتاً آتے رہیں گے۔ ان میں سے، مجدّدین کے متعلق یہ عقیدہ قائم کر لیا گیا کہ وہ ہر سو سال کے بعد آیا کریں گے۔ ان کے علاوہ قیامت کے قریب، امام مہدی تشریف لائیں گے اور آسمان سے حضرت عیسیٰؑ نازل ہوں گے۔ دین میں ان عقاید کی بھی گنجایش نہیں۔ قرآن کریم میں ان آنے والوں کا کوئی ذکر نہیں۔ ماموریین من اللہ کا عقیدہ بھی ختم نبوت کے منافی اور دین کی نقیض ہے۔ اور یہی میری پکار ہے۔ نبی اکرمؐ کے بعد، اب نہ کوئی نبی آ سکتا ہے، نہ کسی اور نام سے کوئی مامور من اللہ۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

نبوت حضورؐ پر ختم ہو گئی اور دین قرآن میں مکمل ہو گیا۔ اللہ بس - باقی ہوس!

مذہبی فرقہ بندی

خدا کی طرف سے جو دین ملا، وہ ایک تھا۔ اس دین کی بنیادوں پر، نبی اکرمؐ نے جو امت تیار کی وہ امت واحدہ تھی۔ اس امت کا ایک خدا، ایک رسول، ایک ضابطۂ زندگی، ایک نصب العین حیات، ایک مسلک اور ایک منہاج تھا۔ ان میں کوئی اختلاف نہ تھا، کوئی تفرقہ نہ تھا۔ اختلاف کو خدا نے عذاب قرار دیا ہے۔ اور فرقہ بندی کو بنص صریح شرک بتایا ہے (۳۰ ، ۳۱) اس لئے اس امت میں باہمی اختلاف کیسے پیدا ہو سکتا، اور فرقے کیسے وجود میں آ سکتے تھے؟

لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو امت کی وحدت پارہ پارہ ہو گئی۔ اس میں سینکڑوں اختلافات نمودار ہو گئے ــــ اور ان اختلافات کو رحمت کہہ کر پکارا گیا ــــ ان میں متعدد فرقے پیدا ہوتے چلے گئے جن میں سے ہر ایک کا یہ دعوےٰ تھا (اور ہے) کہ وہی نجات یافتہ ہوں اور باقی سب گمراہ، فلہٰذا، جہنمی ہیں۔

لیکن سوال کسی ایک فرقے اور دوسرے فرقے کا نہیں۔ دین میں سرے سے فرقوں کا

وجود ہو ہی نہیں سکتا۔ فرقے، مذہب میں باقی رہ سکتے ہیں دین میں نہیں۔ اس لئے جب قرآن کریم کا نظام قائم ہوگا تو اُس میں صرف اُمّتِ مسلمہ ہوگی۔ اس اُمّت میں فرقہ کوئی نہیں ہوگا۔

یہی میری دعوت ہے۔ میں بار بار اعلان کرتا رہتا ہوں کہ میرا تعلق کسی مذہبی فرقے سے نہیں اور نہ ہی میں نے کوئی نیا فرقہ بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص فرقہ بندی کو (قرآن کریم کی نص صریح کے مطابق) شرک سمجھتا ہو، وہ خود کوئی فرقہ کیسے بنا سکتا ہے؟

دین اور دنیا کی ثنویت

دین اس لئے دیا گیا تھا کہ انسان اپنے دنیاوی امور، قوانین خداوندی کے مطابق، سرانجام دے۔ یا، اقبال کے الفاظ میں، انسان، دنیا کا ہر تالہ دین کی چابی سے کھولے۔ اس تعلیم کی رُو سے دین اور دنیا اور مذہب اور سیاست میں ثنویت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب دین، مذہب میں بدل جاتا ہے تو اس میں مذہبی امور اور دنیاوی امور، دو الگ الگ شعبوں میں بٹ جاتے ہیں۔ دنیاوی امور، اربابِ سیاست کے سپرد ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں مذہب سے تعلق نہیں رہتا۔ امور مذہبی، مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں آجاتے ہیں، اور امور دنیا سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ دونوں کے دائرے الگ الگ اور متمیز ہو جاتے ہیں۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت دو الگ الگ شعبے ہو جاتے ہیں۔ "دنیاداروں" کا آخرت میں کم حصہ قرار دیا جاتا ہے اور آخرت سنوارنے والے، دنیاوی مفاد سے محروم رہتے ہیں۔ یہ تصور، قرآن کریم کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت، دونوں کا وجود مذہب کا پیدا کردہ ہے۔ دین میں نہ ملوکیت ہوتی ہے اور نہ مذہبی پیشوائیت — ملوکیت سے مراد وراثتی بادشاہت ہی نہیں۔ اس سے مقصد ہر وہ اندازِ حکومت ہے جس میں خدا کا قانون — جو اس کی کتاب کے اندر محفوظ ہے — نافذ نہ ہو۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں پھر سے دین کا نظام قائم ہو۔

نظامِ سرمایہ داری

دین کے نظام کی غرض اور غایت یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو نہ محتاج' اس نظام کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرے۔ اور ہر فرد کو اپنی صلاحیتوں کی نمود، اور اپنی ذات کی نشو و نما کے لئے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ یہ نظام اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتا جب تک رزق کے وسائل (یعنی ذرائع پیداوار) پر اس کا کنٹرول نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جب ذرائع پیداوار انفرادی ملکیت میں رہنے کے بجائے، نظامِ خداوندی کی تحویل میں رہیں گے' تو معاشرہ میں سرمایہ داری کا تصور تک پیدا نہ ہوگا۔ ملوکیت، اور مذہبی پیشوائیت کی طرح، دین اور سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو پھر، ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے ساتھ، نظامِ سرمایہ داری بھی عین مطابق شریعت قرار پا جاتا ہے۔ اس شریعت کی رو سے انبار در انبار دولت جمع کرنا، زمین کے لامحدود رقبوں کو ذاتی ملکیت میں لے لینا، بے حد و نہایت جائیدادیں کھڑی کرتے جانا سب جائز ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں سے خدا کے نام پر کچھ پیسے الگ کر دیئے جائیں۔ اور ثواب حاصل کرنے کے لئے انہیں خیرات کے طور پر غریبوں اور محتاجوں میں بانٹ دیا جائے۔ اس کے بعد خلقِ خدا پر کیا گزرتی ہے، اس سے ان دولتمندوں کو، از روئے شریعت کوئی واسطہ نہیں رہتا۔

اس قسم کا تصورِ معیشت، قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس کی رو سے، معاشرہ کے ہر فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا، اور اس کی صلاحیتوں کی نشو و نما اور ذات کی برومندی کے لئے سامانِ پرورش بہم پہنچانا ـــ دین کے نظام کی اولین ذمہ داری ہے۔ یہ اس نظام کا کام ہے کہ دیکھے کہ ذرائع پیداوار کا انتظام کس طرح کیا جائے جس سے وہ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکے۔ قوم کے سامنے قرآن کریم کے اس تصور کا عام کرنا تاکہ وہ اس قسم کا معاشی نظام قائم کرے ـــ میری دعوت کا مقصود ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کریم کے نظامِ ربوبیت اور کمیونزم میں بُعد المشرقین ہے۔ جس فلسفۂ حیات پر کمیونزم کا معاشی نظام استوار ہوتا ہے۔ وہ فلسفۂ اسلام کے فلسفۂ زندگی کی یکسر نقیض ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے نہ خدا کو مانا جاتا ہے نہ وحی کو۔ نہ انسانی ذات کے وجود کو تسلیم کیا جاتا ہے نہ مستقل

اقدارِ زندگی کو، نہ قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان ہوتا ہے نہ حیاتِ آخرت پر۔ یہ وجہ ہے کہ میں اس حقیقت کا بتکرار و اصرار اعلان کرتا رہتا ہوں کہ کمیونزم کے فلسفۂ حیات کو ماننے والا مسلمان نہیں ہو سکتا:
اور یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ بھی میری دعوت کی اسی طرح مخالفت کرتے ہیں جس طرح نظامِ سرمایہ داری کے حامل اور مؤید۔ قرآن کا معاشی نظام اس کے فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے اور یہ کسی دوسرے فلسفۂ حیات سے مفاہمت نہیں کر سکتا۔

عقل و بصیرت

دین اپنے ہر دعوے کو قرآنی سند کے ساتھ پیش کرتا اور علم و بصیرت کی بنا پر منواتا ہے۔ وہ، قرآن کریم کی مستقل اقدار کی روشنی میں، عقلِ انسانی سے کام لینے کو مومنین کا شیوہ قرار دیتا ہے وہ مومنوں کی خصوصیت یہ بتاتا ہے۔ کہ وہ، اور تو اور، آیاتِ خداوندی کے سامنے بھی اندھے اور بہرے بن کر نہیں جھکتے۔ (۲۵/۷۳)۔ وہ انہیں عقل و بصیرت کی رو سے ملتے ہیں۔ قرآن کی رُو سے ایمان نام ہی، وحی کی صداقتوں پر، دل اور دماغ کے کامل اطمینان کے بعد، یقین کرنے کا ہے۔

لیکن جب دین مذہب کی سطح پر آجاتا ہے تو وہ سب سے پہلے علم و عقل کو دیس نکالا دیدیتا ہے۔ اس لئے کہ مذہب پنپتا ہی تاریکیوں میں ہے۔ اس کے پاس نہ اپنے کسی دعوے کی تائید میں قرآن کی سند ہوتی ہے نہ علمی اور عقلی دلائل۔ "جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے"۔ اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے جانا، اس کے نزدیک صراطِ مستقیم پر چلنے کا نام ہے۔ جو کچھ ہم سے پہلے کسی انسان نے کہہ دیا، اس پر کسی قسم کی تنقید کرنا، یا اسے قرآن کریم کی روشنی میں پرکھنا، انتہائی گستاخی اور الحاد و بے دینی ہے۔ اگر آپ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں، یا کسی اور مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہو گئے ہیں، تو اس کے بعد، کسی ایسے عقیدہ کے خلاف جو متوارث چلا آرہا ہے، کسی خیال کا اظہار، آپ کو مرتد بنا دے گا۔ جس کی سزا موت ہے۔

میری قرآنی بصیرت کے مطابق، اس قسم کے تصورات، اسلامی تعلیم کے خلاف ہیں۔ اور میری دعوت ان کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ اسلام روشنی ہے تاریکی نہیں۔ قرآن کریم، نوعِ انسان کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لانے کے لئے دیا گیا تھا۔ وحی کی روشنی میں عقلِ انسانی سے کام لینا — دین کا

بنیادی تقاضا ہے۔

عورت کی پوزیشن

قرآن کریم کی رُو سے، ہر انسان، انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ اور عورت بھی اُسی قسم کی انسان ہے جس قسم کا انسان مرد ہے۔ انسان ہونے کی جہت سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ افزائش نسل کے سلسلہ میں اس فطری وظیفہ کے علاوہ جو عورت سے مخصوص ہے، مرد اور عورت کی صلاحیتوں میں کوئی فرق نہیں۔ عورت زندگی کے ہر شعبہ میں مرد کی رفیق ہے اور ان کی باہمی رفاقت سے زندگی کی گاڑی آگے چلتی ہے۔

لیکن مذہب نے ہمیشہ عورت کو مرد کا غلام بنا رکھا ہے۔ وہ اسے مقامِ انسانیت دینے پر کسی صورت میں رضامند نہیں ہوتا۔ اس کے لئے اس نے ایک عقیدہ وضع کیا کہ خدا نے پیدا تو آدم (مرد) ہی کو کیا تھا، لیکن جب وہ تنہائی کی وجہ سے اداس رہنے لگا۔ تو اس کی پسلی سے عورت کو نکالا۔ تاکہ اس سے اس کا دل بہل جائے۔ گویا فطرت کے تخلیقی پروگرام میں مقصود بالذات مرد تھا۔ عورت، محض مرد کا دل بہلانے کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ لیکن عورت نے شیطان کے فریب میں آکر مرد کو بہکایا اور اس طرح اس بے گناہ کو جنت سے نکلوا دیا

اب ضروری ہے کہ عورت اپنے اس جرم کی سزا بھگتے۔ اور یہ سزا وہ مرد کے ہاتھوں بھگتتی ہے۔ ہم نے ان خیالات کو اسرائیلیات سے لیا۔ اور انہیں عین اسلامی بنا کر اپنے عقاید میں داخل کر لیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

چونکہ یہ عقاید قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہیں، اس لئے میں ان کے خلاف مسلسل آواز اٹھاتا رہتا ہوں ــــ میرا پیغام، عورت اور مرد دونوں کے لئے یکساں مقامِ انسانیت کا پیغام ہے۔

یہ عقیدہ کہ عورت، مرد کے دل بہلانے کے لئے پیدا کی گئی ہے، اس قدر عام کیا گیا، کہ خود عورت نے بھی یہی سمجھ لیا کہ اس کا مقصدِ زندگی، مرد کے لئے جاذبِ توجہ بننا ہے۔

اس عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ عورت، ہر وقت اپنی نمود و نمائش کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتی ہے۔

قرآن کریم نے جو عورت کو زینت و زیبائش کی نمود سے منع کیا ہے تو اس سے وہ عورت کو اس کے صحیح مقامِ انسانیت سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ تیرا مقصدِ زندگی، مرد کا کھلونا بننا نہیں۔ شرفِ انسانیت کا بلند مقام حاصل کرنا ہے۔

میں عورت تک خدا کا یہ پیغام پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں دنیا میں قرآن کے اس تصور کو عام کرنا چاہتا ہوں کہ ہم جب عورت اور مرد کے متعلق گفتگو کریں۔ تو دو انسانوں کی حیثیت سے گفتگو کریں۔ یہ دونوں انسان ہیں اور انسانیت کی میزان میں ان کا وزن یکساں ہے۔

تحریکِ پاکستان

آپ نے غور کیا ہوگا، برادرانِ عزیز! کہ ہمارے ہاں عقیدہ و عمل کی تمام خرابیوں کی علت العلل یہ ہے کہ اسلام جو ایک دین تھا، مذہب میں بدل چکا ہے۔ لہٰذا، ان خرابیوں کا علاج صرف ایک ہے کہ اسے مذہب کے مقام سے اٹھا کر پھر سے اس دین میں تبدیل کر دیا جائے جسے خدا نے نوعِ انسانی کیلئے (قرآن کریم میں) عطا کیا تھا۔ اور جسے اس کے رسول (صلعم) نے عملاً متشکل کر کے دکھایا تھا۔

اس کا طریق

سوال یہ ہے کہ اس مذہب کو دین میں بدلنے کا طریقہ کیا ہے۔ میں یہ پہلے بتا چکا ہوں کہ دین ایک نظامِ حیات ہے۔ جس میں، خدا کے احکام کو بطور قوانین نافذ کیا جاتا اور ان کے مطابق زندگی بسر کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی حکم یا اصول کو بطورِ قانون اسی صورت میں نافذ کیا جا سکتا ہے کہ ان اصولوں کے ماننے والوں کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ دوسروں کی مملکت میں مذہب تو باقی رہ سکتا ہے، دین نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ باقی رہ سکتا ہے۔ چنانچہ جب غیر منقسم ہندوستان میں، مسلمانوں کے لئے الگ آزاد مملکت کے حصول و قیام کی تحریک شروع ہوئی ــــ جسے تحریک مسلم لیگ یا تحریک پاکستان کہا جاتا ہے ــــ تو طلوعِ اسلام جاری ہوا۔ اور اس نے قرآنی خطوط پر اس تحریک کا پورے شد و مد سے ساتھ دیا۔ جو حضرات اس تحریک کی تاریخ سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس تحریک کی سخت مخالفت ہوئی۔ بجز چند افراد کے، علماء کا گروہ، مجموعی طور پر اس کا مخالف تھا۔ اس گروہ کے سرخیل مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ

(مرحومین) جیسے اکابر مفتیانِ شرع مبین تھے۔ تحریک پاکستان اور ان حضرات کی طرف سے اس کی مخالفت درحقیقت دین اور مذہب کی کشمکش تھی۔ (اب آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ میں نے اس تذکرہ کی ابتدا مولانا آزاد مرحوم سے کیوں کی ہے؟)۔ یہ حضرات اسلام کو ایک مذہب سمجھتے تھے۔ دین کا تصور ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اسلام کے پانچ ارکان ہیں ـــ کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ـــ اور یہ پانچوں ہر اس مملکت میں ادا کئے جا سکتے ہیں جو ان کی ادائیگی پر پابندی عاید نہ کرے۔ اور آزاد ہندوستان میں ان کی ادائیگی کی مسلمانوں کو کامل آزادی ہوگی۔ اس لئے یہ کہنا کہ اسلام پر کاربند ہونے کے لئے ایک آزاد مملکت کی ضرورت ہے۔ اپنے "سیاسی مقاصد" کے لئے خواہ مخواہ اسلام کو درمیان میں گھسیٹ لانا ہے۔ ان کے مقابلہ میں 'طلوع اسلام' اسلام کو بہ حیثیت دین (نظامِ زندگی) پیش کرتا اور قرآن کریم کی واضح تعلیم کی روشنی میں اس حقیقت کو نمایاں کرتا تھا۔ کہ ایک آزاد خطۂ زمین، اسلام کے احیاء کے لئے اولین شرط ہے۔ اسی کشمکش میں یہ حقیقت بھی سامنے آئی، کہ مذہب، اصطلاحات تو وہی استعمال کرتا ہے جنہیں دین متعین کرتا ہے۔ لیکن ان اصطلاحات کا مفہوم اور تصور بدل دیتا ہے ـــ کلمہ، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، امام، جماعت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، ثواب، عذاب، اطاعت و معصیت خدا و رسول وغیرہ اصطلاحات دین نے استعمال کی تھیں۔ یہ اصطلاحات اس نظام کے مختلف گوشوں کو سامنے لاتی تھیں۔ اور عملاً بتاتی تھیں کہ ان میں سے ایک ایک جزو کس طرح دین کی عمارت کے لئے لاینفک ہے۔ مذہب نے انہی اصطلاحات کو اپنے ہاں منتقل کر لیا۔ لیکن ان کا مفہوم اور تصور بدل دیا۔ یہ سب سے بڑا مغالطہ ہے جو مذہب، اپنے برسرِ حق ہونے کے لئے پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ ٹکنیک تھی جسے متحدہ ہندوستان کی تحریک کے حامی؛ نیشنلسٹ علماء استعمال کرتے تھے۔ اور اس سے عوام بڑی آسانی سے فریب میں مبتلا ہو جاتے تھے۔

دین کی اصطلاحات

اس سے اس امر کی اہمیت اجاگر ہو کر میرے سامنے آئی کہ جب تک ان اصطلاحات دینیہ کا صحیح تصور (قرآن کریم کی روشنی میں) متعین کر کے سامنے نہ لایا جائے، دین کی بات سمجھ میں نہیں آسکتی چونکہ اس کی حیثیت بنیادی تھی، اس لئے اس فریضہ کو میں نے خاص طور پر اپنے ذمہ لیا۔ اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ اس کی ادائیگی میں صرف کیا (اور اب تک کر رہا ہوں)۔ اس سلسلہ میں میری متفرق کوششوں کے علاوہ؛ لغات القرآن بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں میں نے

کوشش کی ہے۔ کہ قرآن کریم کے پیش کردہ تمام تصورات کا صحیح مفہوم متعین کر کے سامنے لایا جائے۔
یہ کتاب، قرآنی الفاظ کے معانی ہی نہیں دیتی، دین کے تصورات کا صحیح مفہوم بھی متعین کرتی ہے۔
میری پیش کردہ قرآنی فکر کے سمجھنے کے لئے اس بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا ازبس ضروری ہے۔ یعنی اس نکتہ کا کہ ہمارے ہاں الفاظ اور اصطلاحات تو قرآن ہی کی رائج ہیں۔ لیکن ان کا مفہوم بالکل بدل چکا ہے۔
دین کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان اصطلاحات کا صحیح (قرآنی) مفہوم سامنے آئے۔

اسلامی نظامِ مملکت

پاکستان بننے سے ایک آزاد خطۂ زمین حاصل ہو گیا۔ تو اس میں صحیح اسلامی نظام قائم کرنے کا سوال سامنے آیا۔ اس لئے کہ خطۂ زمین کا حصول مقصود بالذات نہیں تھا۔ یہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ لہٰذا اصل کام، خطۂ زمین کے ملنے کے بعد شروع ہوا۔ اور یہ منزل بڑی کٹھن تھی۔ اب دین اور مذہب میں جنگ، اپنی انتہائی شدت کے ساتھ سامنے آئی تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، دین کے نظام سے مفہوم، یہ ہے کہ زندگی، قوانینِ خداوندی کے مطابق بسر کی جائے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں بنیادی سوال یہ تھا کہ وہ قوانین کونسے ہیں جن کے نافذ کرنے کا ذریعہ اسلامی حکومت ہے۔ اس سوال کا جواب (بظاہر) بڑا آسان اور واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ خدا کے قوانین سے مراد، اس کی کتاب میں دیئے ہوئے احکام و قوانین ہیں۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس کتاب کا انداز یہ ہے کہ اس میں کچھ احکام متعین طور پر دیئے ہوئے ہیں۔ لیکن دیگر امور کے متعلق صرف اصول اور حدود دیئے گئے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ان اصولوں کی روشنی میں، جزئی احکام، وہ اُمت خود متعین کرے جو دین کو بحیثیت نظام قائم اور متشکل کرنے کا ذمہ لے۔ قرآن کریم کے متعین کردہ قوانین ہوں یا اصول، یہ سب ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا حق کسی فرد یا جماعت حتیٰ کہ ساری اُمت کو بھی نہیں ہو گا ـــــ لیکن ان اصولوں کی روشنی میں مرتب کردہ احکام، حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے۔ ان میں اس قسم کی تبدیلی اسلامی مملکت کرے گی جسے اصطلاح میں خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہا جاتا ہے۔

خلافت علیٰ منہاجِ نبوت

اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "خلافت علیٰ منہاجِ نبوت" کی تھوڑی سی وضاحت کردی جائے۔ نبی اکرمؐ نے دین کو ایک نظام کی شکل میں قائم کرکے دکھایا۔ اسے قرآنی مملکت کہئیے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام رسول اللہؐ کی ذات تک محدود نہ تھا۔ اس نظام کو آگے بھی چلنا تھا۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد یہی نظام حضورؐ کے سچے جانشینوں کے ہاتھوں آگے چلا۔ رسول اللہؐ کے بعد اس دور کو جس میں یہ قرآنی نظام قائم رہا، "خلافت علیٰ منہاجِ نبوت" کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس طرح نبوت حضورؐ کی ذات پر ختم ہوگئی، اسی طرح یہ خلافت، خلفائے راشدینؓ کے ساتھ ختم ہوگئی۔ اس کا دوبارہ قیام ممکن نہیں۔

یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ خلافت علیٰ منہاج نبوت نام ہے قرآن کریم کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کا۔ چونکہ قرآن کریم ہمارے پاس ہر وقت موجود ہے، اس لئے اس کے مطابق نظام ہر زمانے میں قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کا جو سلسلہ منقطع ہوگیا تھا، اُسے دوبارہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ جو مملکت بھی قرآن کے مطابق نظام قائم کرے گی اسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کہا جائے گا۔ اس حکومت کو یہ حق حاصل ہوگا، کہ قرآنی اصولوں کے جو جزئی قوانین، کسی سابقہ دور میں مرتب ہوتے تھے۔ ان کا جائزہ لے، ان میں سے جو قوانین زمانے کی ضرورتوں کو پورا کریں، انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دے۔ جن میں کسی ترمیم و تنسیخ کی ضرورت ہو ان میں مناسب ترمیم و تنسیخ کردے۔ جہاں نئے قوانین کی ضرورت ہو وہاں نئے قوانین مرتب اور نافذ کرے۔ اسی کو اجتہاد کہا جاتا ہے جس کا عمل ہمیشہ جاری رہے گا۔ لیکن راسے پھر دہرا دیا جائے کہ اس طرح قانون سازی کا حق یعنی حق اجتہاد صرف خلافت علیٰ منہاج نبوت (یعنی قرآنی حکومت) کو ہوگا کسی فرد یا افراد کی کسی جماعت کو نہیں ہوگا۔ لیکن جب تک ایسی حکومت قائم نہ ہو۔ اُس وقت تک اس کے سوا چارہ نہیں کہ قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں جو جزئیات کسی زمانے میں متعین ہوئی تھیں اور جن پر امت کے مختلف فرقے کاربند چلے آرہے ہیں ان پر اسی طرح عمل ہوتا رہے۔ کسی فرد یا گروہ کا یہ سمجھ لینا کہ اسے ان جزئیات میں تغیر و تبدل کا، یا نئی جزئیات مرتب کرنے کا حق حاصل ہے، امت میں انتشار

پیدا کرنے کا موجب ہے۔ جس کی میں شدت سے مخالفت کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں فرقہ اہل قرآن یا ایسے افراد کا بھی مخالف ہوں جو کبھی تین نمازوں اور نو دن کے روزوں کا پرچار کرتے ہیں اور کبھی اردو زبان میں نماز پڑھنے کی اختراع کرتے ہیں۔ البتہ ہمارے مروجہ عقاید اور عمل میں جو بات مجھے قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف نظر آتی ہے۔ میں اس کی نشاندھی ضروری سمجھتا ہوں اور ایسا کرتا رہتا ہوں۔

یہ ہے قرآنی اصولوں کی روشنی میں جزئی احکام مرتب کرنے کا وہ طریقہ جسے میں قرآن اور سیرت نبی اکرمؐ کے مطالعہ سے صحیح سمجھتا ہوں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ خلافت راشدہ میں قانون سازی کا یہی اصول تھا۔۔ حضرت عمرؓ نے کئی ایسے فیصلوں میں تبدیلی کی جو ان سے پہلے عہد حضرت ابوبکرؓ اور زمانہ نبی اکرمؐ میں نفاذ پذیر ہوئے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات (چھٹے خطبہ) میں بڑی وضاحت سے بتایا ہے کہ امام اعظم (ابو حنیفہؒ) اور شاہ ولی اللہ کا یہی مسلک تھا۔ ہمارے زمانے کے اکثر علماء (مثلاً مولانا عبید اللہ سندھیؒ) نے اس کی تائید کی ہے۔ خود میری مخالفت کرنے والوں میں ایسے حضرات موجود ہیں۔ جو اسی خیال کے مؤید ہیں۔ لیکن ہمارے عام قدامت پرست طبقہ کا عقیدہ اس کے خلاف ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ شریعت کے تمام احکام پہلے سے مرتب ہو چکے ہیں۔ اور اسلامی حکومت کا فریضہ صرف ان احکام کو نافذ کرنا ہے۔ وہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کرسکتی۔ ایک گروہ کے نزدیک یہ احکام، کتب احادیث میں مجتمع ہیں اور دوسرے گروہ کے نزدیک ائمہ فقہ کی کتابوں کے اندر۔ تغیر و تبدل نہ ان میں ہوسکتا ہے نہ ان میں۔ ان میں سے بعض نے اب اتنا کہنا شروع کر دیا ہے کہ جن امور کے متعلق کتب احادیث یا فقہ میں کوئی حکم نہ ملے ان کے متعلق نئے احکام مرتب کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان احکام کی ترتیب و تدوین علمائے کرام کریں گے حکومت نہیں۔ حکومت اگر کوئی قانون بنانا چاہے تو جب تک اسے علماء کی طرف سے سند حاصل نہ ہو جائے اسے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ اس بات کو ان الفاظ میں نہیں کہتے، اس مطالبہ کو وہ بھی بڑی شد و مد سے پیش کرتے ہیں کہ پرسنل لاز (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق احکام) بالضرور علماء کی تحویل میں رہنے چاہئیں۔ حکومت کو ان میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔۔ چنانچہ عائلی قوانین (فیملی لاز) کی مخالفت اسی نظریہ کے ماتحت کی جا رہی ہے۔

—— ۔ ۔ ۔ ——

جماعت اسلامی

اگرچہ ان نظریات و مطالبات میں سے ہر نظریہ و مطالبہ، خلافت علیٰ منہاج نبوت میں طریق قانون سازی کے اصول کے خلاف ہے جس میں مذہبی پیشواؤں کا کوئی الگ گروہ ہوتا ہی نہیں تھا — یہ گروہ اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا جب دین، مذہب اور سیاست کے دو الگ الگ گوشوں میں بٹ گیا تھا۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ قابل اعتراض بلکہ خطرناک مؤقف جماعت اسلامی کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا ہے۔ باقی گروہوں میں اتنی بات مسلم اور واضح ہے کہ احکام شریعت پہلے سے موجود ہیں اور ان احکام کی فہرست یہ ہے۔ ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ سنت رسول اور ائمہ فقہ، دونوں کے متبعین کا یہی مسلک ہے۔ لیکن مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ

(۱) حکومت کو از خود قانون سازی کا حق حاصل نہیں۔

(۲) پاکستان میں جملہ قوانین، کتاب و سنت کے مطابق ہونے چاہئیں۔

(۳) سنت کا تعین یا جن احادیث سے سنت متعین کی جائے گی ان کے صحیح اور ضعیف قرار دینے کا کام از سر نو کیا جائے گا۔ اس کے لئے کوئی خارجی اصول یا معیار نہیں ہوگا۔ مزاج شناس رسول کی نگہ بصیرت غلط اور صحیح کا معیار ہوگی۔ حتیٰ کہ جن امور میں کوئی حکم پہلے سے موجود نہیں اس کے متعلق بھی وہی کہہ سکے گا کہ ایسے مقام پر رسول اللہ ؐ کیا حکم دیتے۔ اس لئے اس کے حکم کو رسول ؐ کا حکم سمجھا جائے گا۔

(۴) اور جماعت اسلامی کے اکابرین کے بیانات کے مطابق، یہ مزاج شناس رسول ؐ خود مودودی صاحب ہیں۔

اس سلسلہ میں خود مودودی صاحب کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔ احادیث کے متعلق وہ اپنی کتاب رسائل و مسائل میں لکھتے ہیں:۔

> اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ ؐ کی طرف منسوب ہو، اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (یعنی فریق مقابل) کے نزدیک ہر اس حدیث کو حدیث رسول مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں لیکن

ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی حجت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (صفحہ ۲۹۰)

سنت کی حجت اگر دلیل نہیں تو پھر حدیث کے صحیح یا ضعیف ہونے کا معیار کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ اس کا فیصلہ وہی کر سکتا ہے۔

جس نے حدیث کے ذخیرے کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہؐ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے ...... اس مقام پر پہنچ کر وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا.. ...... وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اول نظر میں سمجھ لیتا ہے کہ رسول اللہؐ ایسا فرما سکتے تھے یا نہیں۔ آپ کا عمل ایسا ہو سکتا تھا یا نہیں ...... یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں وہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلعم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا۔ تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔

(تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۰۲ و صفحہ ۳۲۴۔ شائع شدہ محرم ۱۳۵۹ء)

یعنی پہلے یہ، مزاج شناس رسول، تمام سابقہ معیاروں کو بالائے طاق رکھ کر، اپنی نگہ بصیرت سے اس امر کا فیصلہ کرے گا کہ احادیث کے مجموعوں میں سے کون کون سی حدیث قابل قبول ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اس کی نگاہ اس کا بھی فیصلہ کرے گی کہ ان احادیث میں سے کن احادیث سے مرتب کردہ سنت کو فی الواقع سنتِ رسول کہا جائے گا۔ اس سلسلہ میں ان کا ارشاد ہے۔

سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بہ حیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے ...... بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا سنت بنانا مقصود نہیں تھا...... (اسی طرح) جو امور آپ نے عادۃً کئے ہیں، انہیں سنت

بنا دینا، اور تمام دنیا کے انسانوں سے مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں
اللہ اور اس کے رسول کا ہر گز منشا نہیں تھا۔ یہ دین میں تحریف[1] ہے۔

(رسائل و مسائل۔ صفحہ ۳۰۷ ؛ صفحہ ۳۱۰ ؛ صفحہ ۳۱۱ ؛ صفحہ ۳۱۴ ؛ صفحہ ۳۱۷)

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ جس سنت کو ملک کا قانون قرار دیا جائے گا۔ اس کا تعین یکسر مزاج شناس رسول کی مرضی پر موقوف ہوگا۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ تھیاکریسی کس قدر آمرانہ اور مستبدانہ شکل ہو گئی جس میں تمام قوانین ایک شخص کے فیصلوں کے مطابق وضع ہوں گے اور ان قوانین کا اتباع "خدا اور رسول کے فیصلوں" کی حیثیت سے کرایا جائے گا۔ جن کی خلاف ورزی دنیا اور آخرت میں سخت ترین سزا کی مستوجب۔ اور جن سے انکار ارتداد ہوگا جس کی سزا موت ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی کتاب (مرتد کی سزا) میں یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ پاکستان میں جب نظام شریعت قائم ہوگا تو یہاں کے مسلمانوں کو ایک سال کا نوٹس دیا جائے گا کہ وہ اپنے عقائد و مسالک اس اسلام کے مطابق کر لیں جسے یہ صحیح اسلام قرار دیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کریں گے انہیں قتل کر دیا جائے گا۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ مودودی صاحب وہی پوزیشن اختیار کرنا چاہتے ہیں جو عیسائیت میں کلیسا (یعنی چرچ) نے اختیار کر رکھی تھی اور جس کی رو سے ہر معاملہ کا آخری فیصلہ پادریوں کے ہاتھ میں تھا۔ چرچ اینڈ اسٹیٹ (کلیسا اور حکومت) کی اس کشمکش نے کیا قیامت برپا کی تھی، اس پر یورپ کی تاریخ کے خونی اوراق شاہد ہیں۔ صدیوں کی مسلسل تباہیوں کے بعد وہاں مفاہمت کی شکل یوں پیدا کی گئی کہ حکومت سیکولر ہوگی اور مذہب کا کام چرچ تک محدود رہے گا۔ یعنی مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے قرار پا گئے۔ جماعت اسلامی اس بدنصیب ملک کو اس مقام پر لیجانا چاہتی ہے جہاں سے یورپ میں چرچ اور اسٹیٹ کی یہ کشمکش شروع ہوئی تھی۔ اگر یہ جماعت تقویت پکڑ گئی تو خطرہ ہے کہ جو کچھ یورپ میں ہوا تھا وہی کچھ یہاں ہو کر رہے گا۔ میں اسے اسلام اور پاکستان دونوں کے لئے تباہی کا موجب سمجھتا ہوں۔

---

[1] واضح رہے کہ حدیث کی کتابوں میں یہ نہیں لکھا ہوتا کہ فلاں فلاں امور حضورؐ نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے سرانجام دیئے تھے یا وہ حضورؐ کے شخصی مزاج کے مطابق اختیار کردہ تھے۔ یا ان امور کو حضورؐ نے عادۃً اختیار کیا تھا۔ یہ تمیز و تفریق بھی مزاج شناس رسولؐ ہی کرے گا۔

میری کوشش یہ ہے کہ کسی طرح ملک کو ان تباہیوں سے بچا لیا جائے۔

آپ نے غور فرمایا، برادرانِ عزیز! کہ قانون سازی کے سلسلہ میں یہاں مذہب اور دین کی کشمکش کس شدت سے جاری ہے۔ میری پکار یہ ہے کہ قانون سازی کے لئے وہی طریق اختیار کیا جائے جسے خود قرآن کریم نے تجویز کیا ہے اور جسے میں پہلے بیان کر چکا ہوں، یعنی جن احکام و قوانین کو قرآن کریم نے متعین شکل میں دیدیا ہے انہیں اسی طرح نافذ کیا جائے اور جن امور کو اس نے اصولی حیثیت سے بیان کیا ہے ان کی جزئیات، ان اصولوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، اسلامی حکومت، امت کے باہمی مشورہ سے متعین کرے۔ ایسا کرنے سے ان جزئیات کو بھی جو پہلے کبھی متعین ہوئی تھیں یقیناً پیشِ نظر رکھا جائے گا وہ قانون سازی کے سلسلہ میں نظائر کا کام دیں گی۔

حضورؐ کی سیرت طیبہ

احادیث کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے۔ قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کی بلندیٔ سیرت اور پاکیزگیٔ کردار کو نوعِ انسان کے لئے بہترین نمونہ (اسوہ حسنہ) قرار دیا ہے۔ اس نے حضورؐ کی سیرت کے نمایاں خط و خال کو اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے۔ لیکن جزئی واقعات، کتبِ احادیث و تاریخ (سیر) میں پائے جاتے ہیں۔ ان کتابوں میں غلط اور صحیح ہر قسم کی باتیں آ گئی ہیں جس کی وجہ سے ان میں ایسے ایسے واقعات بھی ملتے ہیں۔ جن سے حضورؐ کی سیرت (معاذ اللہ) داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔

اسی طرح قرآن کریم نے جماعت صحابہؓ کی بڑی تعریف کی ہے اور مہاجرین و انصار کے متعلق تو بالتخصیص کہا ہے کہ وہ مومنین حقا (یکے اور سچے مومن) تھے لیکن ہماری کتب تاریخ میں ان کے متعلق بھی ایسے ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ان پر تبرا طعن ملتا ہے۔

میری دعوت یہ ہے کہ ان کتب احادیث و تاریخ پر اس انداز سے نظرثانی کی جائے کہ ان میں سے تمام قابل اعتراض مواد خارج کر دیا جائے۔ تاکہ حضورؐ کی سیرت اور صحابہؓ کی زندگی اپنی صحیح اور پاکیزہ شکل میں دنیا کے سامنے آئے۔ لیکن یہ کام بھی اسلامی حکومت کے کرنے کا ہے۔ اگر اسے انفرادی طور پر کیا جائے گا تو افراد کا تعصب یا عقیدت صحیح منزل تک پہنچنے کے راستے میں حائل

ہو جائے گی۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت ان کتابوں کو ــــ جو انسانوں ہی کی مرتب کردہ ہیں ــــ وحیِ آسمانی کی طرح تنقید سے بالا قرار دیتی ہے۔ وہ اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی کہ رسول اللہؐ کی سیرتِ طیبہ کا کوئی گوشہ (معاذاللہ) داغدار ہو جائے، یا صحابہ کبارؓ کی زندگی قابلِ اعتراض شکل میں سامنے آئے۔ لیکن وہ اسے نہیں برداشت کر سکتی کہ ان کتابوں کے مصنفین یا مؤلفین کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ ان سے کوئی غلطی یا سہو ہوا ہے۔ دیکھئے! اسلاف پرستی انسان کو کہاں تک لیجاتی ہے؟ لیکن مذہب کی تو بنیاد ہی اسلاف پرستی پر ہے۔

اسلامی مملکت سے مقصود کیا ہے؟

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، مذہب کی رو سے دنیا اور آخرت میں ثنویت ہوتی ہے۔ اور ایک مذہب پرست انسان کی تمام تگ و تاز کا ماحصل اور سعی و کاوش کا منتہیٰ یہ ہوتا ہے۔ کہ اس کی عاقبت سنور جائے اسے اس سے غرض نہیں ہوتی کہ اس کی اس دنیا کی زندگی کس قسم کی گذر رہی ہے بلکہ ان کے نزدیک خدا کے مقرب بندوں کی نشانی یہ ہے کہ ان کی اس دنیا کی زندگی نہایت عسرت اور افلاس میں گزرے ــــ جو یہاں جس قدر ذلیل ہو گا وہ وہاں اسی قدر واجب التکریم ہو گا۔ ان کے نزدیک، اسلامی مملکت سے مقصد اتنا ہی ہے کہ وہ چور کے ہاتھ کاٹ دے۔ زانی کو سنگسار کر دے۔ شرابی کے کوڑے لگائے۔ زکوٰۃ کا روپیہ اکٹھا کر کے، مذہبی تعلیم اور تبلیغ کے کاموں پر صرف کرے۔ حج کے لئے سہولتیں بہم پہنچائے وقس علیٰ ذٰلک۔

لیکن قرآن کریم کی رُو سے، اسلامی مملکت کے قیام کا منتہیٰ کچھ اور ہے۔ اس میں شبہ نہیں۔ کہ اس میں قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں دی جائیں گی اور احکام اسلامی کی پابندی ضروری ہو گی۔ لیکن یہ تمام امور ذریعہ ہوں گے ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ــــ اور وہ مقصد یہ ہے، کہ یہاں ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جس میں خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار اس طرح جاری و ساری ہوں جس طرح فضا میں صاف اور خوشگوار ہوا رواں دواں رہتی ہے۔ کہ ہر متنفس

اس سے بلا کاوش و مشقت سامانِ زیست حاصل کرتا رہتا ہے۔ ان اقدار کے مطابق معاشرہ کے متشکل ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے جنت کی جن نعمتوں اور آسائشوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس دنیا میں ہر فرد معاشرہ کو از خود ملتی چلی جاتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی، اس کی ذات کی نشو و نما اس طرح ہوتی رہتی ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی جنتِ اخروی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ جس معاشرہ میں خدا کی مستقل اقدار جاری و ساری نہ ہوں، اس میں افرادِ معاشرہ کی یہ زندگی بھی جہنم کی زندگی ہوتی ہے، اور مرنے کے بعد بھی وہ جہنم ہی میں رہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا مقصد افرادِ معاشرہ کو اس دنیا اور اگلی دنیا، دونوں میں، جنت کی زندگی عطا کرنا ہے۔ لہذا، اس بات کے پرکھنے کا معیار کہ جو حکومت کسی جگہ قائم ہے وہ اسلامی ہے یا نہیں، یہ ہے کہ اس میں افرادِ مملکت کو وہ سامانِ زیست میسر ہے یا نہیں جسے نعمائے جنت کہہ کر پکارا گیا ہے اور انہیں اپنی ذات کی نشو و نما کے مواقع حاصل ہیں یا نہیں، اور یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمیں آخرت میں جنت ملے گی یا نہیں، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ہماری یہاں کی زندگی جنت کی زندگی کے مشابہ ہے یا نہیں ـــ اور اگر سر دست ہماری زندگی ایسی نہیں تو ہم اس زندگی کے حصول کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں یا نہیں ـــ یاد رکھئے! قرآن کریم کی رُو سے، ایمان اور اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ، اس دنیا اور آخرت، دونوں میں جنت کی زندگی ہے۔ اس کے برعکس اس کا فیصلہ یہ ہے کہ

مَنْ كَانَ فِىْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷/۷۲)

جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہی ہوگا۔ دنیا، آخرت کی کھیتی ہی نہیں بلکہ وہ آخرت کے پرکھنے کی کسوٹی بھی ہے۔

معاشرتی خرابیاں

ہمارے ہاں حالت یہ ہے کہ جہاں دو آدمی ملیں گے وہ معاشرتی خرابیوں کا رونا روئیں گے ـــ بلکہ اب تو حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ روتے روتے آنسو ہی خشک ہو گئے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ (غالب کے الفاظ میں) ـــ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں ـــ یہ خرابیاں اس

قدر عام اور معاشرہ کا معروف چلن بن گئی ہیں۔ کہ ان پر رونے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ البتہ ان پر بطور فیشن، منبر اور اسٹیج دونوں سے آنسو ضرور بہائے جاتے ہیں۔ منبر سے یہ آواز عادۃً صبح و شام دھرائی جاتی ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو چھوڑ دیا اس لئے ان میں یہ خرابیاں عام ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ کبھی نہیں بتایا جاتا کہ مسلمانوں نے کیا چھوڑا ہے جس کا فطری نتیجہ یہ خرابیاں ہیں، اور وہ کیا کریں جس سے یہ خرابیاں فی الواقعہ دور ہو جائیں۔

یہی کیفیت اسٹیج کی ہے۔ وہ وزیر ہو یا امیر، صنعت کار ہو یا زمیندار، مستقل لیڈر ہو یا ہنگامی مقرر — کوئی تقریب ہو یا کسی قسم کا اجتماع ...... تان یہاں ٹوٹے گی کہ مسلمانو! تم اپنی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھال لو۔ تمہارے سارے کام سنور جائیں گے۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتلائے گا کہ وہ سانچہ ہے کیا جس میں ڈھلنے سے یہ خرابیاں رفع ہو جائیں گی۔

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ یہ خرابیاں غلط نظام زندگی کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ (یا یوں کہئے کہ وہ غلط نظام کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں) اور افراد بالعموم اُن سے ملوث ہوتے ہیں۔ جب تک وہ نظام نہیں بدلا جاتا، معاشرہ کی خرابیاں دور نہیں ہو سکتیں۔ نہ ہی ان خرابیوں کی یہ صورت ہے کہ کسی ایک شعبہ کو لے کر اس کی خرابیوں کی اصلاح شروع کر دی جائے۔ اس سے اصلاح کبھی نہیں ہو سکتی جہنم سارے کا سارا جہنم ہوتا ہے۔ اس کے کسی ایک گوشے کو آپ جنت میں بدل نہیں سکتے۔ چیچک کا علاج الگ الگ آبلوں پر مرہم لگانے سے نہیں ہو سکتا۔ پورے جسم کے خون کو زہریلے جراثیم سے پاک کرنے سے ہوتا ہے۔ اس لئے غلط نظام کی پیدا کردہ خرابیوں کا علاج اسی صورت میں ممکن ہے کہ اسے صحیح نظام سے بدلا جائے۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱/۱۱۵) — خدا کا بتایا ہوا طریق علاج ہے۔ یعنی سیّات کے دور کرنے کا طریق یہ ہے کہ انہیں حسنات سے بدل دیا جائے۔ حسنات صحیح معاشرہ کے کاروبار کا نام ہے۔ صحیح معاشرہ میں، افراد کی چھوٹی موٹی لغزشوں کے نقصانات ان کے حسن عمل کے عالمگیر نتائج سے ڈھک جاتے ہیں۔ (۵۳/۳۲)۔ لہٰذا، جب تک ہم اپنے موجودہ غلط نظام معاشرت، نظام معیشت نظام سیاست وغیرہ کو قرآنی نظام سے نہیں بدلیں گے، معاشرہ کی خرابیاں دور نہیں ہو سکیں گی۔ صحیح قرآنی نظام میں، صوم و صلوٰۃ اور حج اور زکوٰۃ سب اپنے اپنے خوشگوار نتائج مرتب کرتے ہیں۔ غلط نظام میں یہ محض رسومات بن کر رہ جاتی

ہیں۔ اور جب ان کا کوئی زندہ نتیجہ سامنے نہیں آتا تو یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دلایا جاتا ہے۔ کہ ان سے ثواب ہوتا ہے۔ جو آخرت میں ہماری نجات کا ذریعہ بنے گا۔

میری دعوت یہ ہے کہ موجودہ غیر قرآنی نظام کی جگہ قرآنی نظامِ زندگی قائم کیا جائے تاکہ معاشرہ کی خرابیاں دور ہوں۔ ہمیں دنیا میں خوشگواری اور سرفرازی کی زندگی نصیب ہو اور ہماری عاقبت بھی سنورے ـــ اس دعوت کی مخالفت ہر اس گروہ کی طرف سے ہوتی ہے ـــ خواہ وہ مذہب پرستوں کا ہو یا دنیا داروں کا ـــ جو غیر قرآنی معاشرہ ہی میں اپنا مفاد دیکھتے ہیں۔ اور قرآنی معاشرہ میں انہیں اپنا وجود خطرہ میں نظر آتا ہے۔

اس سلسلہ میں اتنا واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس تمام مخالفت میں، میں کسی سے ذاتی طور پر قطعاً نہیں اُلجھتا۔ میری مخالفت بھی اصول کے لئے ہوتی ہے اور موافقت بھی اصول کی خاطر۔ اس تگ و تاز میں، میں ذاتیات کو درمیان میں لاتا ہی نہیں ـــ قرآن کریم جب لَآ اِلٰہَ کہہ کر دنیا کے ہر صاحبِ اقتدار کی نفی کرتا ہے، تو اس سے اس کا مقصود کسی سے ذاتی مخاصمت یا نفرت نہیں ہوتا۔ وہ ہر اس اصولی نظریہ یا نظام کی مخالفت کرتا ہے جس میں قوانین خداوندی کے علاوہ کسی اور کو صاحبِ اقتدار تسلیم کیا جائے ـــ ملوکیت، سرمایہ داری یا مذہبی پیشوائیت سے میری مخالفت اسی لَآ اِلٰہَ کے اصول کی متابعت کی وجہ سے ہے تاکہ اس انکار سے اِلَّا اللہ کے مثبت مقام تک قوم کو لیجایا جا سکے۔

انقلابی آواز

یہ ہے عزیزانِ گرامی قدر! مختصر الفاظ میں میری وہ دعوت جسے میں قریب تیس سال سے مسلسل پیش کئے چلا آرہا ہوں۔ جس دن میں نے اس قرآنی فکر کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا مجھے اس کا اچھی طرح سے علم تھا کہ اس کی کس قدر مخالفت ہوگی ـــ جو شخص لوگوں کے سامنے اُن کے مروجہ عقاید اور متوارث نظریات پیش کرتا ہے، پہلے ہی دن ایک انبوہِ کثیر اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اُسے 'ان کا مسلمہ لیڈر، راہ نمائے شریعت یا مرشدِ طریقت بن جانے میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن جو شخص اُن کے غلط عقاید اور غیر صحیح اعمال کی تردید کر کے' انہیں ایسے راستے کی طرف دعوت دیتا ہے جو

ان کی پامال راہوں سے ہٹا ہوا ہے، وہ دنیا بھر کی مخالفت مول لیتا ہے۔ میری اپنی پہلی زندگی خود انہی پامال راہوں میں گزری تھی۔ اس لئے ایک ہجوم کو اپنے پیچھے لگا لینا، اور ایک بہت بڑی جماعت کھڑی کر کے اس کا قائد بن جانا میرے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ لیکن میری قرآنی بصیرت کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے یہ توفیق عطا فرمائی، کہ میں ان تمام نگاہ فریب جاذبیتوں اور دامن گیر کششوں سے منہ موڑ کر، قرآن کی آواز پر لبیک کہوں۔ اور اس طرح دنیا جہان کی مخالفت مول لے لوں میں نے یہ فیصلہ سب کچھ جانتے بوجھتے، سوچتے سمجھتے کیا، اور مجھے کبھی اس پر افسوس نہیں ہوا۔

سوال یہ ہے کہ میں نے مقبولیتِ عامہ کا وہ آسان راستہ چھوڑ کر ان پر خار وادیوں کو اپنایا کیوں کیا۔ اس کا بنیادی جواب تو یہی ہے کہ جب کسی کے سامنے صداقت آ جائے، تو خود صداقت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اُسے عام کیا جائے خواہ اس میں کتنی ہی شفقتیں کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔ دوسرے یہ کہ تاریخ اقوام کے مطالعہ سے میں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اب مذہب کا دور ختم ہو چکا ہے۔ مذہب تاریکیوں میں پنپتا ہے۔ جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جاتی ہے، مذہب چمگادڑ کی طرح آنکھیں بند کرتا چلا جاتا ہے۔ بادنیٰ تدبّر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ایک کر کے ختم ہو گئے یا ختم ہونے جا رہے ہیں

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

یہ تو دین کا خاصہ ہے، کہ وہ علم کی روشنی میں اور زیادہ چمکتا ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، ہم بھی اپنے دین کو مذہب کی سطح پر لے آئے ہیں۔ اس لئے جب دنیا کے دیگر مذاہب باقی نہیں رہے، تو یہ مذہب کیسے باقی رہ سکے گا؟ فطرت کے قانون کے مطابق، ہر وہ نظریہ جو زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔

مذہب کے ختم ہو جانے کے بعد، اگر اُس قوم کے سامنے دین نہ ہو، تو وہ دہریت اختیار کر لیتی ہے۔ اس وقت یورپ کی سیکولر مملکتوں اور کمیونسٹ سلطنتوں کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ان دونوں میں

؎ جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے کہ خدا کی طرف سے دین عطا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد مذہبی پیشوائیت اسے پامال کر کے، مذہب میں تبدیل کر دیتی ہے۔

سیاست، مستقل اقدار سے الگ ہو جاتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) "چنگیزیت" کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

دہریت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ خاص اسی قوم کو تباہ نہیں کیا کرتی، اس کا اثر بڑا دور رس ہوتا ہے جب اقتدار کسی ایسی قوم کے ہاتھ آ جائے جو مستقل اقدارِ حیات پر ایمان نہ رکھتی ہو، تو اس سے دنیا جس جہنم میں مبتلا ہو جاتی ہے اس کے شعلے ہم آج ساری دنیا میں مشتعل دیکھ رہے ہیں۔ میری نگہ بصیرت، یہ دیکھ رہی ہے کہ مذہب کے ساتھ جو کچھ یورپ میں ہوا ہے، وہی کچھ اب پاکستان میں ہونے والا ہے ـــ یہاں اس وقت جو آپ مذہبی پیشوائیت کا جوش و خروش دیکھ رہے ہیں یہ مذہب کی حرکتِ مذبوحی اور رقصِ بسمل سے زیادہ کچھ نہیں۔ مجھے خطرہ یہ ہے کہ اگر اس وقت قوم کے سامنے خدا کا دین نہ لایا گیا تو یہاں بھی دہریت چھا جائے گی۔ میری انتہائی آرزو اور کوشش یہ ہے کہ قبل اس کے کہ دہریت کا بڑھتا ہوا سیلاب ادھر کا رُخ کرے، یہاں مذہب کو دین سے بدل دیا جائے تاکہ دنیا میں ایک خطۂ زمین تو ایسا ہو جو خدائی پروردگاری کا مظہر بن سکے۔ یہ ہے میرا وہ احساس اور اس کے ماتحت میری یہ آرزو اور ارادہ، جس کی بنا پر میں دنیا جہان کی مخالفت مول لے کر، مروجہ مذہب کے ایک ایک گوشے کو سامنے لاتا اور اس کی جگہ دینِ خداوندی پیش کئے جا رہا ہوں، اس امید پر کہ

ہجر کی رات ہوئی ہے تو سحر بھی ہو گی

لہٰذا، میری دعوت اور پیغام کا ملخص (کم از کم) پاکستان میں، انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی جگہ خدا کے عطا کردہ دین کی حکمرانی کو قائم کرنا ہے۔

جب میں نے پہلے پہل یہ آواز بلند کی تو اپنے آپ کو تنہا پایا ـــ بالکل تنہا ـــ لیکن قرآنِ کریم کی صداقتوں پر یقینِ محکم نے میری دستگیری کی اور ان جانکاہ تنہائیوں کے باوجود میں نے کبھی اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کیا۔ "اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" کی نویدِ حیات بخش، مجھے پکارتی ہوئی آگے بڑھاتی چلی گئی ـــ مجلہ طلوعِ اسلام، لاکھوں کی تعداد میں شائع شدہ پمفلٹ، میری تصانیف، لقاء، خطبات، مذاکرات، نجی گفتگوئیں، اس فکر کی نشر و اشاعت کے ذرائع تھے۔ آہستہ آہستہ یہ فکر فضا میں پھیلتی اور رفتہ رفتہ قلوبِ سلیم میں اترتی چلی گئی۔ اور ایک ایک، دو دو، کر کے، مجھے رفیقِ سفر ملنے شروع ہو گئے۔ جب ان کی تعداد کچھ زیادہ ہو گئی تو بعض رفقاء نے یہ تجویز پیش کی کہ بجائے اس کے

طلوعِ اسلام کی بزمیں

کہ ہم انفرادی طور پر اس فکر کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں، کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ ایک بستی یا شہر کے رہنے والے متفقین فکر اجتماعی طور پر اس کی نشر و اشاعت کریں۔ تجویز معقول تھی۔ اسے اختیار کر لیا گیا۔ اور یوں طلوعِ اسلام کی بزموں کا وجود عمل میں آ گیا۔

طلوعِ اسلام کی بزمیں، نہ سیاسی پارٹیاں ہیں، نہ مذہبی فرقے، نہ ہی انہیں کسی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ سے تعلق ہوتا ہے اور نہ ہی یہ عملی سیاست میں حصہ لیتی ہیں۔ ان بزموں کا مقصد، اس قرآنی فکر کی اجتماعی طور پر نشر و اشاعت ہے۔ اور بس ـــ انہیں یونہی سمجھئے جیسے بزمِ اقبال جس کا مقصد فکرِ اقبال کی نشر و اشاعت ہوتا ہے۔ میرے پیشِ نظر صرف فکری انقلاب ہے اور یہی وجہ ہے کہ میرے پیغام کا اولیں مخاطب، قوم کا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ہے۔

اس تحریک کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے۔ کہ اس نے نہ کبھی پبلک سے چندہ مانگا ہے نہ قربانی کی کھالیں۔ نہ صدقات و زکوٰۃ کے پیسے جمع کئے ہیں۔ اس کے مرکزی اخراجات، پورے کرنے کا بنیادی ذریعہ میری کتابوں کی آمدنی ہے۔ یا کسی ہنگامی ضرورت کے لئے احباب کا تعاون، بزموں کے اراکین اپنی اپنی جگہ اس فکر کی نشر و اشاعت کا انتظام خود کرتے ہیں۔ اس تحریک کی یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے یہ، اس قدر عالمگیر مخالفت کے باوجود، کسی مقام پر رکی نہیں۔ دن بدن آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ وَ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ۔

میری پوزیشن

اس سلسلہ میں اتنا اور واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری پوزیشن، قرآن کریم کے ایک ادنیٰ طالب العلم اور مبلغ کی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں نے قرآن کریم پر غور و فکر کیا ہے اور اسی غور و فکر کے نتیجے کو میں اوروں تک پہنچاتا ہوں۔ اپنی فکر کو نہ میں حرفِ آخر سمجھتا ہوں، نہ سہو و خطا سے منزہ ـــ جو مجھے میری کسی غلطی سے آگاہ کرے میں اس کا شکر گذار ہوتا ہوں لیکن اس کے لئے یہ شرط ہے کہ مجھے یہ بتایا جائے کہ میری پیش کردہ فکر کس طرح قرآن کریم کے خلاف ہے کیونکہ میرے نزدیک دین میں سند خدا کی کتاب ہے۔ مجھے نہ مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ ہے

نہ دوسرے مسلمان بھائیوں سے کسی قسم کی الگ اور ممتاز حیثیت کا زعم ـــــ قرآن کریم نے ایمان کے جو اجزائے خمسہ متعین کئے ہیں ـــــ یعنی خدا، ملائکہ، انبیاء، کتب اور آخرت ـــــ ان پر میرا ایمان ہے۔ اور ایمان ہے ان تصریحات کے مطابق جنہیں خود قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے۔ اور میری دعوت کی حد آخر یہ ہے کہ وہی نظریۂ زندگی، وہی نظامِ حیات مستحقِ حمد و ستائش ہو سکتا ہے جو خدا کی صفت ربّ العالمینی کا مظہر ہو۔

تعلیمی اسکیم

خدا کی اس صفتِ ربّ العالمینی کو ایک زندہ حقیقت بنانے کے لئے ـــــ بالفاظِ دیگر اسلام کو بہ حیثیت ایک نظامِ زندگی متشکل کرنے کے لئے ـــــ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اس فکر کو زیادہ سے زیادہ عام اور اس تصور کو اجاگر کیا جائے۔ اس وقت تک میں نے یہی کیا ہے۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ یہ ہے کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کریں کہ اس نظامِ خداوندی کا قیام، ان کے جذبات کا تقاضا، ان کی آرزوؤں کا مرکز، ان کی کوششوں کا محور، اور ان کی زندگی کا مقصد بن کر ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے ـــــ بدقسمتی سے ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم بڑا ناقص اور ہماری ابھرنے والی نسلوں کے لئے سمِ قاتل ہے۔ میں نے اس اٹھارہ برس میں، قوم کی توجہ اس اہم اور بنیادی مسئلہ کی طرف منعطف کرانے کی کوشش کی۔ لیکن دیکھا یہ کہ قوم کو سردست

ہمارا نظامِ تعلیم

کسی سنجیدہ معاملہ کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں۔ اس نے زیادہ سے زیادہ کیا تو اتنا کہ اسکولوں اور کالجوں میں، اسلامیات کے پیریڈ کا اضافہ کر دیا۔ بی اے ایم۔ اے میں ایک مضمون کی حیثیت دیدی۔ اس "اسلامیات" نے نوجوان طالب علموں کو اور بھی مذہب گزیدہ بنا دیا۔ پہلے اگر وہ دین سے بیگانہ تھے تو اب وہ اس سے متنفر ہو گئے۔ اور اس کے بعد، یکسر سرکش ـــــ یہ ہیں وہ نوجوان جو اس وقت قوم کے لئے ایک مسئلہ (پرابلم) بن رہے ہیں ـــــ (حالانکہ یہ پرابلم خود قوم ہی کی پیدا کردہ ہے) یہی ہیں وہ نوجوان جو آیندہ چل کر خود ایک قوم بن جائیں گے۔

ان حالات میں، میں نے سوچا کہ اگر مروّجہ نظام و نصابِ تعلیم کو ملک گیر حیثیت سے بدلنا

میرے بس میں نہیں، تو کم از کم میں ایک ایسی درسگاہ (کالج) کے قیام کی کوشش کروں جس میں صحیح قرآنی تصورات کے مطابق تعلیم و تربیت کا انتظام ہو۔ جس میں طریقۂ تعلیم یہ ہو کہ طالب علم طبیعیات پڑھیں یا عمرانیات، تاریخ پڑھیں یا فلسفہ ـــ وہ معاشیات کا مطالعہ کریں یا سیاسیات کا ـــ غرضیکہ وہ علم کے کسی شعبہ سے متعلق کیوں نہ ہوں، انہیں یہ بتایا جائے کہ علم کا یہ شعبہ اس پروگرام کی تکمیل میں کس طرح ممد و معاون ہو سکتا ہے جسے قرآن نے انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ قرار دیا ہے۔

یہ پروگرام اس کے سوا کیا ہے کہ ـــ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں وحیٔ خداوندی کی روشنی میں نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے صرف کیا جائے ـــ بالفاظِ دیگر، اس تعلیم و تربیت کے ذریعے طالب علموں کے دل و دماغ میں اس حقیقت کو راسخ کر دیا جائے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو وحی کی متعین کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھنا ہی شرفِ انسانیت کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اس سے ان کی سیرت میں وہ پختگی، اور کردار میں وہ پاکیزگی پیدا ہو جائے گی جس کے فقدان کا ہم اس وقت اس قدر رونا روتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ جب تک اس انداز کی اپنی یونیورسٹی قائم نہ ہو، اس کالج میں عام تعلیم یونیورسٹی کے منظور شدہ قاعدے کے مطابق دی جائے تاکہ وہاں کا فارغ التحصیل طالب علم زندگی کے کسی شعبے میں دوسرے کالجوں کے طالب علموں سے پیچھے نہ رہ جائے ـــ یاد رکھیئے! ـــ میں اپنی قوم کے نوجوانوں کی طرف سے مایوس نہیں ہوں! ـــ ان میں بڑی صلاحیتیں ہیں۔ لیکن یہ ہماری غلط تعلیم اور تربیت کا نتیجہ ہے کہ ان کی یہ صلاحیتیں، صحیح اقدار کے ساحلوں کے اندر رہ کر، جوئے حیات بخش بننے کے بجائے، حدود ناآشنا سیلابِ بے پناہ بن جاتی ہیں جس کا نتیجہ تباہیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اگر ان کی صلاحیتوں کو انسانیت ساز اقدار کا پابند بنا دیا جائے تو آپ دیکھیئے کہ یہی نوجوان، کس طرح تقدیرِ ملت کے درخشندہ ستارے نہیں بن جاتے!

میرے پیشِ نظر کالج کا مقصود یہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی عمر کے اس آخری حصہ میں، اپنی قوم کے بچوں اور بچیوں کو لے کر بیٹھ جاؤں، اور کم از کم آنے والی نسلوں کے لئے ایک طیّب اور صالح خمیر تیار کر جاؤں ـــ وَمَا تَوْفِيقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ـــ اس مقصد کے لئے "قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی" کے نام سے ایک سوسائٹی بنالی گئی ہے جسے حکومت کے ہاں سے رجسٹرڈ کرالیا گیا ہے۔ ۲۵ بی۔ گلبرگ (لاہور) اس سوسائٹی کا دفتر ہے اور محترم مرزا محمد خلیل صاحب اس کے خزانچی ہیں۔

نام پر عطیہ جات موصول ہوتے ہیں ۔ اس سوسائٹی کے قواعد وضوابط چھپ چکے ہیں۔ اور اس اسکیم میں دلچسپی لینے والے حضرات انہیں سوسائٹی کے دفتر سے حاصل کرسکتے ہیں۔ اس میں دیئے جانے والے عطیات کو سنٹرل گورنمنٹ نے، انکم ٹیکس سے بھی مستثنیٰ قرار دیدیا ہے۔ یہ سوسائٹی، ادارہ طلوع اسلام سے الگ ہے اور اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا حساب کتاب بھی الگ ہے!

یہ ہے عزیزانِ من! میرے سامنے (یوں کہیئے کہ) میری زندگی کا آخری نصب العین لیکن اس کا حصول، ظاہر ہے کہ میرے اکیلے کے بس کی بات نہیں۔ میں ان تمام احباب سے، جو میری قرآنی فکر سے متفق ہیں اور اس درسگاہ کی اسکیم کو مفید خیال کرتے ہیں، اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے اس سوسائٹی سے تعاون کریں۔ اگر آپ احباب کی رفاقت سے یہ درسگاہ قائم ہوگئی تو مجھے یقین ہے کہ یہ، ہمارے تعلیمی نظام میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے مثال کا کام دے گی۔ اس سے ہماری قوم ایک نیا موڑ مڑ جائے گی۔ اس سے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل جائے گا۔ اور اس میں حصہ لینے والوں کا نام زمانے کے صفحات پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ جس طرح سرسید کا دارالعلوم، تشکیل پاکستان پر منتج ہوا، چہ عجب کہ یہ درسگاہ پاکستان کو ایک صحیح اسلامی مملکت میں تبدیل کرنے کا موجب بن جائے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز—! میرا آخری پیغام

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

---

۲۰ مارچ۔ ۳ بجے بعد دوپہر

آخری کھلا اجلاس

ٹھیک تین بجے بعد دوپہر کنونشن کا یہ آخری اجلاس شروع ہوا۔ نو پنڈال کی حاضری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ مفکرِ قرآن کے خطاب کا موضوع تھا — "خدا کی مرضی" — ہر معاملہ اور ہر بات میں "خدا کی مرضی" کے الفاظ قدم قدم پر سننے میں آتے ہیں۔ لیکن "خدا کی یہ مرضی" ہے کیا—؟ اس پر علیٰ وجہ البصیرت شاید ہی کبھی کسی نے غور کیا ہو — "خدا کی مرضی" — (تقدیر کا مسئلہ) — بجائے خود

ایسا موضوع تھا جس کی حقیقت کشائی کے لیئے ہر شخص بے تاب دکھائی دیتا تھا۔ لاہور کے اہل علم و فکر طبقہ کی خاصی تعداد جوق در جوق شریک اجلاس ہوئی تھی۔ اور جب پرویز صاحب نے اپنی مخصوص نشست سنبھالی تو پورا پنڈال گوش برآواز تھا۔ اس اہم خطاب کا آغاز انہوں نے اپنے مخصوص دلنشین (بلکہ محاکاتی) انداز میں کیا۔ انہوں نے مائی بھولی کے اکلوتے نورِ نظر کی جوانی کی موت، اشہاد بدمعاش کے ہاں دولت کی فراوانی اور جاہ وحشم، نادرہ کی خانہ ویرانی کی روزمرہ کی داستانوں سے "خدا کی مرضی" کا مروجہ مفہوم واضح کیا اور اس مرضی کے سامنے انسان کی مجبوری اور بے بسی پر" ارباب شریعت کی مہرِ تصدیق" کا پس منظر بے نقاب کرتے ہوئے ان آیاتِ قرآنی کی تفصیل پیش کی جن کے خود ساختہ اور گمراہ کن مفہوم سے "خدا کی اس مرضی" کا ناگزیر تسلط وجہ جواز کے طور پر ذہن انسانی پر مرتسم کیا جاتا ہے اور پھر ایک ایک کر کے ان آیات کے حقیقی مفہوم کو علی وجہ البصیرت نمایاں کیا۔

مفکرِ قرآن ذہنِ انسانی کی ان غلط اندیشیوں کے پردے چاک کرتے ہوئے آگے بڑھے اور قرآنی تعلیم کا وہ نقطۂ ماسکہ پیش کیا جو قانونِ مکافاتِ عمل کی حیثیت سے انسانی زندگی کے فیصلوں کا سرچشمہ قرار پایا ہے۔ یعنی اعمالِ انسانی کا ہر نتیجہ کسی دھاندلی یا لاابالیت سے نہیں بلکہ خدا کے مقررہ قوانین کی رو سے سرانجام پاتا ہے اور افراد و اقوام کی قسمتوں کے فیصلے کسی ادنیٰ رد و رعایت یا زیادتی کے بغیر الٰہی قوانین کے مطابق تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔ اس مقام پر انہوں نے اس وضاحت کی ضرورت محسوس کی، کہ تقدیر الٰہی کے اس گمراہ کن تصور نے اُمت کے عقاید میں کیونکر سازشِ عجم کے ہاتھوں راہ پائی۔ اور ہمارے ہاں کی ملوکیت نے اپنی ذاتی مفاد پرستیوں کی خاطر اسے کس عیاری اور مکاری سے عوام کے ذہنوں میں راسخ کر کے افیون کے تیکے کی طرح انہیں صدیوں کی گہری نیند سُلا دیا۔ اور اپنے ظلم و استبداد کی کارفرمائیوں کو تقدیر خداوندی کے اٹل فیصلے قرار دے کر اندیشہ ہائے دور دراز سے فارغ ہوگئے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں اس کے المناک انجام کو سامنے لاتے ہوئے ان کی یہ درد بھری آواز فضا میں گونجی کہ ؎

"تن بہ تقدیر" ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

یعنی جس قوم کی نگاہوں سے کبھی زمانے کی تقدیریں بدل جایا کرتی تھیں وہ صدیوں سے اپنی تقدیر کا

رونا روتی چلی آرہی ہے۔ ان کا یہ اہم خطاب ایک دعوتِ انقلاب کی صورت میں تقدیر کے اس قرآنی مفہوم پر ختم ہوا کہ ؎

تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں!

خطاب ختم ہوا تو حاضرین انکشافِ حقیقت کے ایک نئے اور نور افشاں ماحول میں کھڑے تھے۔ قرآن کے ایک عظیم طالب علم نے اپنی بصیرت قرآنی سے وہ تمام پردے چاک کر دیئے تھے جو تقدیر کے پُرفریب مفہوم کو قلب و نگاہ پر مسلط کرکے صدیوں سے انسانی قوتِ عمل کو مفلوج کئے چلے آرہے تھے۔

اس نشست کے بعد کنونیشن کا آخری اجلاس منعقد ہوا جس کے آخر میں پرویز صاحب نے حسب معمول اپنے رفقاء سے الوداعی خطاب فرمایا۔

یہ خطاب ختم ہوا تو بکھرے ہوئے آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے۔ رات شروع ہو چکی تھی اور سالانہ کنونشن کا آخری مرحلہ حسن و خوبی سے تکمیل پا چکا تھا۔

فالحمد للہ علیٰ ذالک

باسمہٖ تعالیٰ

نوائے صبح گاہی

طلوعِ اسلام کی دسویں کنونشن

منعقدہ ۔ ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور
۹ تا ۱۲ نومبر ۱۹۶۷ء

روئیداد ماخوذ از
دسمبر ۱۹۶۷ء

مشو اے غنچۂ نورستہ دلگیر
لبِ جو، بزمِ گل، مرغِ چمن گیر

ازیں بستاں سرا دیگر چہ خواہی
صبا۔ شبنم۔ نوائے صبح گاہی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

یہ ۲۵ بی۔ گلبرگ ہے۔

تحریک طلوع اسلام کی دسویں سالانہ کنونشن میں شرکت کی غرض سے مندوبین پورے مغربی پاکستان سے چلے آرہے ہیں۔ "استقبالیہ" کے خوبصورت شامیانہ تلے احباب اپنی آمد کی اطلاع دے رہے ہیں۔ منتظمِ استقبالیہ متعلقہ احباب کی فہرست، کی پڑتال کے بعد انہیں شناختی نشان دیتے ہیں اور آنے والے مہمان، ایک اور کارکن کی معیت میں کیمپ میں اپنی مخصوص آرامگاہ میں پہنچ رہے ہیں۔ کیمپ تین کشادہ اقامت گاہوں پر مشتمل ہے۔ ۲۳/بی اور ۲۴/بی کی اقامت گاہیں مندوبین کی آرامگاہ، مطبخ اور طعام کے لئے وقف ہیں۔ جبکہ مفکرِ قرآن کی اقامت گاہ ۲۵/بی پر ایوانِ اجلاس کا کتبہ نصب ہے۔ یہ پوڈر خود بھی سرگودھا سے آمدہ ایک عزیز مندوب کو ان کی آرامگاہ تک پہنچانے آیا تھا کہ کیمپ کے وسط میں ۲۴/بی کے مغربی گوشے میں بہت سے احباب کے جمگھٹے نے اس کے قدم روک لئے۔ یہ ذوقِ تجسس میں مجمع کو چیرتا ہوا اگلی صف میں پہنچ گیا۔ ایک طائرانہ نظر پیشِ منظر پر ڈالی، چھوٹے اور بڑے سائز میں قسم قسم کے خوشنما اور جاذبِ نظر رنگوں میں کتنے حسین امتزاج کے ساتھ دیوار پر آویزاں کرنے کا عمل جاری تھا۔ کچھ کتبے آویزاں کئے جاچکے تھے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہ بزم کراچی ہے جس کے نمائندہ نے اپنے پُرعزم رفقا کی معاونت سے اپنی بزم کی اٹھارہ ماہ کی کارکردگی کے نقوش کو

ان کتبوں پر ثبت کر دیا تھا۔ کیمپ کا یہ گوشہ جہاں احباب کراچی کی خدمات، جو ان کتبوں کے واسطے سے ناظرین تک پہنچیں، سب سے زیادہ مرکز توجہ بنا رہا۔ راقم السطور بزم کراچی کی اس نگارش گاہ سے لوٹا تو یاران کہن کا ایک اور قافلہ کیمپ میں داخل ہوتے نظر آیا۔ یہ انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے لپکا۔ ادھر سے ایک صاحب کھلے بازوؤں، تیزی سے اس کی طرف بڑھے اور بغلگیر ہو گئے۔ اسے حیرت تھی کہ اس قدر گرمجوشی کا مظاہرہ آخر چہ معنی دارد، جبکہ اسے اس سے پیشتر ان سے کبھی شرف ملاقات نہ ہوا تھا۔ وہ اس حیرت کو بھانپ گئے۔ "بھیّا! حیران نہ ہوئیے گا۔ فکر قرآنی نے ہمارے درمیان سے زمان و مکان کا بعد اور بیگانگی کا احساس ختم کر دیا ہے۔ ہم سب ایک ہیں، صدیوں سے ایک۔" انکی اس حقیقت افشائی پر زبان گنگ تھی۔ اور دل اخوت و یگانگت کے حسین و کیف آور جذبات سے لبریز۔ احباب جوق در جوق آتے رہے اور کیمپ میں اپنی مخصوص آرام گاہوں پر پہنچتے رہے، سر شام پہلی بار غیر رسمی طور پر سب سینہ چاکان چمن مطبخ کے وسیع گوشے میں جمع ہوئے۔ اور شغل کام و دہن کی لطف یابی کے بعد مختلف ٹولیوں کی شکل میں آہستہ آہستہ "ایوان اجلاس" میں داخل ہونے لگے۔

۹ رنومبر — تعارفی نشست

آپ آگئے تو رونق کاشانہ ہو گئی

ایوان اجلاس میں اسٹیج اور نشستوں کو غیر معمولی طور پر حسن کارانہ انداز میں ترتیب دیا گیا تھا۔ مندوبین حضرات اپنی اپنی نشستوں پر جمے بیٹھے تھے کہ باہمی تعارف کا سلسلہ شروع ہوا جس کا ایک حصہ اسی اجلاس میں، اور دوسرا ۱۰ رنومبر کی صبح میں وجۂ بالیدگی قلب و نظر ہوا۔ اس کے بعد مفکر قرآن نے اپنا استقبالیہ پیش کیا جو آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آرہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نوائے صبح گاہی

قافلۂ بہار را' انجمن انجمن نگر

بادہ نوشانِ خمکدۂ قرآنی! آپ پر خدا کا ہزار سلام و رحمت ہو۔

للہ الحمد، کہ آج، قریب ڈیڑھ سال کی صبر آزما مفارقت کے بعد، ہمیں پھر سے مل بیٹھنے کی مسرت نصیب ہوئی ہے۔ کسقدر وجۂ شادابیٔ فکر و سیرابیٔ جذبات ہوتے ہیں وہ اجتماعات جن کے شرکاے محفل میں، کامل ہم آہنگیٔ قلب و نگاہ، اور یک رنگیٔ تصور و خیال ہو۔ اور پھر جب اس یک نگہی و ہم نظری کی بنیاد، خدائے عظیم کی کتابِ جلیل و جمیل کی عطا کردہ بصیرت ہو، تو اس محفل کے دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہونے میں شبہ کیا ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ آپ کے والہانہ جذباتِ ذوق و شوق میں برکت اور آفاق گیر عزائم میں اس قدر استقامت عطا فرمائے کہ جس شمعِ قرآنی کو لے کر آپ شبہائے عصر کی تاریکیوں کا گریبان چاک کرنے کے لئے اٹھے ہیں، اسے وجۂ تابانیٔ عالم بنا کر دم لیں، اور اس طرح آپ مخالفت کی ہر قوت سے، نہایت خندہ پیشانی سے کہہ سکیں کہ ع

دیدۂ آغازم و انجام نگر!

ڈیڑھ سال کے اس طویل عرصہ میں، میں کن ہمت طلب مراحل سے گزرا، اگرچہ ان کی یاد سخت دل خراش اور ان کا تصور بڑا زہرہ گداز ہے، لیکن میں ستمہائے روزگار کی ان تمام چیرہ دستیوں کو فراموش کر کے، انتہائی سکونِ قلب کے ساتھ اس نشید جانفزا کو آپ کے لئے فردوس گوش بنانے کی مسرت

حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ

تم جو اپنے شریک حال رہے
گردشِ آسماں سے کچھ نہ ہوا

ویسے بھی میری تو اب کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ زندگی کے جتنے لمحات باقی ہیں، (غالب کے الفاظ میں) خونِ جگر کے ان قطروں کو ودیعتِ مژگانِ یار سمجھتا ہوں۔ اس لئے اپنے وقت اور توانائی کے ایک شمہ کو بھی دیگر افکار و آلام میں صرف کرنے کو اس امانت میں خیانت تصور کرتا ہوں۔ اس سلسلہ میں بیاز سرِ نیاز بدرگاہِ رب العزت سجدہ ریز ہے جس نے حوادثِ زمانہ کی اس قدر اضطراب انگیز تلاطم خیزیوں میں مجھے سکون گہر کی جنت سے نوازا۔ ؎

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد!
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

رفیقانِ محترم! ایک عرصہ کی بات ہے۔ دہلی میں میرے ایک عزیز دوست تھے، ڈاکٹر حمید (ہومیوپیتھ۔ جو تقسیم کے بعد کراچی تشریف لے آئے تھے اور اب مرحوم ہو چکے ہیں)، ان کا معمول یہ تھا کہ رات کو مطب سے فارغ ہونے کے بعد میرے ہاں تشریف لے آتے۔ ان کا ذوق بڑا پاکیزہ اور قلب نہایت شفاف تھا۔ اس لئے ان کی صحبت بڑی پُر لطف ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی قرب و جوار کے احباب ان سے علاج معالجہ کے لئے بھی آجاتے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے وہیں میرے کمرے میں دوائیوں کا ایک بکس رکھ چھوڑا تھا۔ ایک دفعہ، آدھی رات کے وقت، میرے ہاں ایک بچی کو ایسا درد اٹھا کہ دیکھتے دیکھتے اس کی حالت غیر ہو گئی۔ آدھی رات ادھر، آدھی اُدھر، کوئی ڈاکٹر قریب نہیں، سواری کا بھی کوئی انتظام نہیں۔ بچی کی تکلیف اور اپنی بے بسی کے احساس سے، میں نے جس کرب و اذیت سے اس شب کو سحر کیا۔ ہے، اس کی یاد آج بھی میری روح میں کپکپی پیدا کر دیتی ہے۔ علی الصبح ڈاکٹر حمید صاحب کو اطلاع دی۔ وہ آئے، بچی کو دیکھا اور اس کے سرہانے رکھا ہوا دوائیوں کا بکس نہایت اطمینان سے کھولا۔ ایک شیشی سے دوائی نکالی۔ چند لمحوں میں بچی آرام سے سو گئی۔ سارے گھر کو سکون نصیب ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب چلے گئے تو میری فکر کا رُخ دوسری طرف مڑ گیا۔ میں نے سوچا کہ آج ملتِ اسلامیہ کی

حالت بعینہٖ یہی ہو رہی ہے۔ ساری قوم حوادثِ زمانہ سے انتہائی درد و کرب کے عالم میں، مضطرب و حزین ہے دوائیوں کا بکس سرہانے رکھا ہے لیکن چونکہ ان کے علم سے محروم ہے۔ اس لئے اس جانکاہ درد و الم سے پڑی تڑپ رہی ہے اور مرض کا کوئی مداوا سمجھ میں نہیں آرہا۔ اس مریض کی شفایابی کے لئے کرنے کا کام فقط اتنا ہے کہ اسے بکس میں بند دوائیوں کی تاثیر و خواص سے آشنا کرا دیا جائے۔ حضور نبی اکرمؐ کو جب خدا نے حکم دیا تھا کہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۔ (۵/۶۷)۔ جو کچھ تیرے نشو و نما دینے والے نے تیری طرف نازل کیا ہے اسے دوسروں تک پہنچا دے۔ اور آپ کا فریضہ مقدسہ یہ بنایا تھا کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲/۲) وَ يُزَكِّيْهِمْ (۲/۱۲۹)۔ وہ انہیں قوانین خداوندی اور ان کی غرض و غایت کی تعلیم دیتا ہے اور اس طرح ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما کا اہتمام کرتا ہے۔ اس سے مقصود یہی تھا کہ اس آسمانی بکس کو، جس میں شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ کے لئے حسین علاج کی دوائیاں سربمہر شیشیوں میں بند ہیں، ہر مریض تک پہنچا دو اور اسے ان کے خواص و اثرات سے روشناس کرا دو۔ اس طریقِ عمل سے، عالمگیر انسانیت کو کس قدر صحتمندانہ شباب حاصل ہو گیا۔ اس کی شہادت تاریخ کے اوراق سے لیجئے۔ حضورؐ نے ایسا کچھ کر دکھایا لیکن کچھ عرصے کے بعد کیفیت یہ ہو گئی کہ یہ بکس تو ہر گھر میں موجود رہا لیکن اس کے اندر بند دوائیوں کے علم سے اہلِ خانہ نے اپنے آپ کو محروم کر لیا۔ اس کا جو نتیجہ ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

قوم کے اس صدیوں کے مجرمانہ تغافل کے بعد، یہ فریضہ آپ احباب نے اپنے ذمّہ لیا ہے۔ لیکن یہ فریضہ بظاہر جس قدر آسان ہے، درحقیقت اسی قدر مشکل اور صبر آزما بھی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ مریض کے صحیح علاج سے، عطائیوں، کشتہ فروشوں، مجمع سازوں، اور گنڈہ تعویذ کے توہم پرستانہ جال پھیلانے والوں کے مفاد پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے ان کی طرف سے اس سائنٹفک طریقِ علاج کی مخالفت اور سخت مخالفت ناگزیر ہے۔ دوسری طرف عمر بھر کا مریض، کچھ اس طرح مرض کا خوگر ہو چکا ہے کہ اسے اپنی بلا کا احساس ہی نہیں رہا۔ ان حالات میں، مریض کو صحیح علاج پر آمادہ کرنے، اور اسے ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے مدعیوں کے دامِ تذویر سے بچانے کا کام بڑا صبر آزما اور ہمت طلب مرحلہ ہے۔ اس کے لئے بڑی اولوالعزمانہ ہمت، استقامت، حوصلہ اور پتّہ مارنے کی ضرورت ہے۔ یہ مرحلہ کس قدر صبر طلب اور ہمت آزما ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ نوعِ انسان کے اس طبیبِ مشفق (صلعم)

کو، کہ جس کا صبر و ثبات، ہجوم مخالفت اور اژدہام معاندت کی تلاطم خیزیوں میں تمام عالمِ انسانیت کیلئے روشنی کے مینار کا کام دیتا ہے، قدم قدم پر، خدا کی طرف سے اس قسم کی تاکیدی ہدایات ملتی تھیں کہ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (۲۰/۱۳۰)۔ "جو کچھ یہ لوگ تیرے خلاف کہتے ہیں، اس پر ثبات و استقامت سے کام لو" فَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ (۷۶/۲۴)۔ اپنے نشو و نما دینے والے کے فیصلوں پر جم کر ٹھہرا رہ: فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (۴۶/۳۵)۔ اس استقامت سے کام لے جو اولوالعزم انبیائے سابقہ کا شعار تھا۔ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ (۳۰/۶۰)۔ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم رکھتے ہوئے، صبر و استقامت سے کام لو۔ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا (۷۰/۵): وہ صبر نہیں جو مجبوری کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ نہایت حسن کارانہ انداز کا صبر، کہ مخالفتوں کے ہجوم کا استقبال، دل کے فردوس آگیں اطمینان اور نگاہوں کے تبسمِ جنت فروش سے کیا جائے۔

میں نے، زمیلانِ گرامی قدر! قرآن کریم کی اسی راہ کو چراغِ راہ بناتے ہوئے اس تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا مقصد، نہایت سکون و خامشی، لیکن انتہائی التزام و استحکام کے ساتھ، قرآنی فکر کو عام کئے جانا ہے۔ اس میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی اور تماشا گری کو کوئی دخل نہیں۔ ہمارے دستورِ اساسی کی پہلی شق یہ ہے کہ ہم عملی سیاسیات میں حصہ نہیں لیں گے۔ اس لئے اس تحریک کے ساتھ وابستگی سے نہ تو کوئی سیاسی مفادِ عاجلہ حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں نمود و نمائش کی کوئی گنجائش اور شہرت و ناموری کا کوئی مقام ہے۔ یہاں تو دنیا بھر کی مخالفت کو نہایت سکون و اطمینان سے برداشت کرنا، اور لب تک ہلائے بغیر اپنی دُھن میں آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔ اس بزمِ شوق میں پروانے کی طرح جل مرجانا اور زبان سے اُف تک نہ کرنا ہے۔ دوسری طرف، مفادِ عاجلہ کے جہانِ رنگ و بو سے یوں بیگانہ وار گذر جانا ہے کہ اس کی کوئی کشش و جاذبیت آپ کی دامنگیر نہ ہو۔ قرآنی تحریک کی یہی وہ نادر خصوصیت تھی جس سے متاثر ہو کر، جرمن مفکر گوئٹے نے اسے پُرسکون ندی کی روانیوں سے تشبیہ دیتے ہوئے بارگاہ رسالتمآبؐ میں وہ والہانہ ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے جس کی مثال، منقبت کے لٹریچر میں بہت کم ملے گی۔ گوئٹے کی پیش کردہ، اس خراماں خراماں ارم، جوئے آب کی کیفیت (اقبالؒ کے فارسی ترجمہ کے الفاظ میں) یہ تھی کہ؎

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود   در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

راستے کی ساحرانہ کشش وجاذبیت کا یہ عالم کہ؂

در راہ او بہار پری خانہ آفرید
نرگس دمید ولالہ دمید وسمن دمید

لیکن اس کی شانِ بے ہمگی کا یہ عالم کہ؂

ناآشنائے جلوہ فروشانِ سبز پوش
صحرا برید وسینۂ کوہ وکمر درید

اور اس طرح ——— درخود یگانہ ازہمہ بیگانہ می رود

یوں یہ سکوت افزا ندی ———

ازتنگنائے وادی دکوہ ودمن گذشت ——— اور
ازکاخ شاہ ودبارہ وکشت وچمن گذشت

اور اس طرح ——— دربرگرفتہ ہم سفرانِ زبون وزار
زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
باصد ہزار گوہرِ یکدانہ می رود

آپ کے اس کاروانِ شوق کو، اس پرسکوت ندی کی طرح، ہرقسم کی عناں گیر کشش وجاذبیت سے دامن کش، اور دوسری طرف، ہرنوع کی شورانگیزیوں اور تلاطم خیزیوں سے غیرمتاثر، 'درخود یگانہ ' ازہمہ بیگانہ، رواں دواں جانبِ منزل جادہ پیما رہنا چاہیئے۔

عزیزانِ من! قرآن کریم نے نبی اکرمؐ سے، ثبات واستقامت کی تاکید کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھاکہ فَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ (۴۶/۳۵)۔ اس باب میں عجلت مت کرو۔ قرآن کی اسی تاکید کو دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے وہ دلولہ خو ارباب شوق آجاتے ہیں جو ہماری تحریک کے نہایت سطحی نظر سے مطالعے کے بعد ہم سے ہمنوا ہو جاتے ہیں لیکن تھوڑی دور ساتھ چل کر اس قافلہ کی سست رفتاری سے اکتا جاتے ہیں، اور تقاضے شروع کر دیتے ہیں کہ اس کے پروگرام میں سیاسی ہنگامہ آرائیاں اور شورش انگیزیاں شامل کرنی چاہئیں۔ جب ان کا یہ تقاضا پورا نہیں ہوتا تو وہ اس قسم کی بحثیں شروع کر دیتے ہیں جن سے افراد کارواں کے ذہنوں میں انتشار ابھرے اور دلوں میں افسردگی پھیلے۔

اس قسم کا عنصر ہماری تحریک کے لئے بہت نقصان رساں ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں قریب قریب ہر کنونشن میں اس کی تاکید کرتا چلا آرہا ہوں کہ یہ عنصر آپ کے ہاں بار نہ پانے پائے ورنہ آپ کی مدت العمر کی محنت دنوں میں بگولے کی گرد بن کر اڑ جائے گی۔ آپ قرآنی تحریک کی نرم روی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کا آغاز مکے سے کیا۔ آج کی کثرتِ آبادی کی نسبت سے اُس زمانے کا مکہ، بس یوں سمجھئے جیسے ایک مختصر سا قصبہ' یہ آبادی' اور حضور رسالتمآبؐ جیسے داعیٔ انقلاب۔ آپ نے عمرِ نبوت کا قریب ساٹھ فی صد حصہ اسی مختصر سی آبادی میں دعوت و تبلیغ میں صرف فرما دیا۔ اور اس کا ماحصل قریب تین سو نفوس تھے۔ آپ سوچئے کہ کسی دعوت کی رفتار اس سے زیادہ بھی سست کی جا سکتی ہے؟ لیکن یہ اس دعوت کی سست روی نہیں تھی۔ یہ خام لوہے کو پختہ بنانے کا عمل مسلسل تھا۔ یہ قطرہ کو گہر بنانے کا صبر طلب پروگرام تھا۔ اس کے برعکس ہمیں اپنی حالت پر غور کرنا چاہیئے۔ ساری دنیا کے مسلمان تو ایک طرف، آپ صرف مغربی پاکستان کے مسلمانوں کو لیجئے۔ اور سوچیئے کہ ان کی تعلیم کتاب و حکمت کا اہتمام تو بہت دور کی بات ہے، کیا ہم ان سب تک قرآن کا پیغام پہنچا بھی سکے ہیں؟ جب ہماری منزلِ اول میں ہنوز یہ کیفیت ہے تو ہنگامہ آرائیوں کے تقاضوں کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ہم جو کچھ تھوڑا بہت اس وقت کر رہے ہیں' اسے بھی چھوڑ بیٹھیں۔

تحریک میں شریک ہونے والے

لہذا' عزیزانِ من! ہمارا طریقِ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ جو صاحب آپ کی فکر سے ہم آہنگ ہونے کی بنا پر آپ کی بزم میں شریک ہونا چاہیں۔ آپ انہیں پہلے متفقین کی فہرست میں رکھیئے اور اس امر کا جائزہ لیجئے کہ انہوں نے آپ کی تحریک کا کس قدر گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا اور اسے کس قدر صحیح سمجھا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ ان کے مزاج میں جذبات کی شدت اور تلون تو نہیں۔ ان میں نمود کی خواہش اور بڑا بننے کا جذبہ تو نہیں۔ جب آپ اس طرح ایک عرصہ کے تجربہ کے بعد مطمئن ہو جائیں کہ وہ آپ کے زمیلِ سفر بن سکتے ہیں تو پھر انہیں شریکِ کارواں کیجئے۔ یاد رکھئے! ناپختگانِ راہ کو شریکِ سفر کرنے سے پہلے تو خود کارواں میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب آپ مجبوراً انہیں الگ کرتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو

حق بجانب ثابت کرنے کے لئے آپ کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کردیتے ہیں اور یوں آپ کا قیمتی وقت اور توانائیاں ان خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن چھڑانے میں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اگر آپ کی بزموں میں ایسے احباب موجود ہوں تو پہلے تو آپ انہیں اپنی تحریک کا مقصد و مسلک سمجھائیے اور اگر وہ اس پر بھی اپنی روش میں تبدیلی نہ کریں تو اُن سے عرض کر دیجئے کہ وہ تحریک سے الگ ہو کر جو پروگرام جی میں آئے اختیار کرلیں۔ لیکن تحریک کے اندر رہتے ہوئے انہیں اس قسم کے مطالبات کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اُن سے کہیئے۔ کہ ؎

عشق اپنا مزاج رکھتا ہے
تو وفا کر یا بے وفائی کر
ہم صبر طلبیٔ عشق کو، کسی کی بے تابیٔ تمنا پر قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں!

کوئی راز نہیں

بعض گوشوں سے اس قسم کی تجاویز بھی سامنے لائی جاتی ہیں۔ (اور ایسا کرنے والے بھی اُسی قسم کے نوواردانِ بساطِ ہوائے دل ہوتے ہیں جن کا تذکرہ ہم نے ابھی ابھی کیا ہے) وہ کہتے ہیں کہ ہمیں بھی چاہیئے کہ ملک کی دیگر جماعتوں کی طرح، مختلف ناموں سے کچھ اور تنظیمیں جاری کردیں جن کا بظاہر ہم سے کوئی واسطہ نہ ہو لیکن بباطن ہماری تحریک سے وابستہ ہوں۔ ایسے سیاست زدہ ذہنوں سے بلاتوقف و تامل برملا کہہ دیجئے کہ اس قسم کی تجاویز تو ایک طرف اس قسم کی ذہنیت بھی ہمارے ہاں بار نہیں پا سکتی۔ ہم ہر قسم کی نقاب پوشی کو (خواہ وہ کیسے ہی نیک مقصد کے لئے کیوں نہ ہو) فریب کاری سمجھتے اور دروغ گوئی کو جرم عظیم قرار دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں کسی قسم کا کوئی رازِ درونِ پردہ نہیں۔ کوئی سرِ نہاں خانہ نہیں۔ کوئی زیرِ زمین پروگرام نہیں۔ ہم جو کہتے ہیں علانیہ کہتے ہیں، اور جو کچھ کرتے ہیں برملا کرتے ہیں۔ قرآنی فکر کو عام کرنا ہمارا نصب العین، اور اس کے لئے واضح اور کھلے ذرائع نشر و اشاعت اختیار کرنا ہمارا پروگرام ہے۔ ہمارا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ ہم ان میں سے نہیں جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ؎

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح   دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس پر

وَ نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا

فرقہ اہلِ قرآن

اس سلسلہ میں، عزیزانِ محترم! ایک اور تخریبی عنصر کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ ہماری تحریک کی ایک بنیادی شق یہ بھی ہے کہ ہمارا نہ کسی سیاسی پارٹی سے تعلق ہے نہ مذہبی فرقہ سے واسطہ۔ ہماری بزموں میں جو احباب شریک ہوتے ہیں وہ، اس سے پہلے، لامحالہ کسی نہ کسی فرقے سے متعلق ہوتے ہیں۔ بلّٰہ الحمد کہ اس وقت تک کہیں سے اس قسم کی شکایت نہیں آئی تھی کہ وہ بزم میں، یا بزم سے باہر طلوعِ اسلام کا نام لے کر کسی فرقہ وارانہ بحث میں الجھتے ہوں۔ لیکن میرے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ فرقہ اہلِ قرآن سے متمسک حضرات بزموں میں شریک ہو جاتے ہیں اور وہاں تین نمازوں اور نو دن کے روزوں کی بحثیں چھیڑ دیتے ہیں۔ میں تمام بزموں کے نمایندہ حضرات سے گذارش کروں گا کہ اگر ان کی بزم میں ایسے لوگ شریک ہوں اور اپنی روش و ذہنیت تبدیل کرنے کے لئے تیار نہ ہوں، تو انہیں بادلِ ناخواستہ بزموں سے الگ کر دیں۔ مجھے کسی کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ان کی نیت کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو، میری بصیرت کے مطابق، ان حضرات کی ایک بنیادی غلطی نے قرآنی پیغام کے عام ہونے کے راستے میں بڑی رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔ قرآنی نظام یہ ہے کہ جائز و ناجائز (معروف و منکر) کی جزئیات متعین کرنا (جسے فقہ قرآنی کہتے ہیں) اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔ جب تک یہ فریضہ اسلامی مملکت سرانجام دیتی رہی، امت میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا۔ لیکن جونہی یہ فریضہ افراد کے سپرد ہو گیا اور ان کی مرتب کردہ فقہ پر عملدرآمد شروع ہو گیا، فرقے وجود میں آ گئے۔ طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ ملک میں ایسا نظامِ مملکت قائم کیا جائے، جو قرآن کریم کو اصل و بنیاد تسلیم کر کے، قوانینِ شریعت مرتب اور نافذ کرے۔ جب تک ایسا نہ ہو سکے، مسلمانوں کے مختلف فرقے جس انداز سے اسلامی شعائر (نماز۔ روزہ۔ وغیرہ) ادا کرتے چلے آ رہے ہیں، ان میں رد و بدل نہ کیا جائے کہ اس سے خواہ مخواہ مزید تشتت پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ان حضرات کی نگاہوں سے یہ اہم حقیقت اوجھل رہی۔ اور انہوں نے، مسلمانوں کے دیگر فرقوں کی طرح، فقہ مرتب کرنے کا فریضہ افراد کے سپرد کر دیا اور اس کے مطابق عمل بھی کرنے لگ گئے

اسی سے اُن کا بھی ایک الگ فرقہ وجود میں آگیا۔ یہ دعویٰ، کہ دوسروں کی فقہ کا ماخذ روایات ہیں اور ہماری فقہ کا سرچشمہ قرآن ہے، اس باب میں کچھ فرق پیدا نہیں کرتا۔ فقہ کا ماخذ، کچھ بھی کیوں نہ ہو، جونہی وہ انفرادی ہوئی، فرقہ وجود میں آگیا۔ یہ وجہ ہے جو یہ حضرات، قرآن کے ساتھ، اس قدر وابستگی کے مدعی ہونے کے باوجود قرآنی پیغام کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہیں۔

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے مسلک میں اور فرقہ اہلِ قرآن کے مسلک میں کس قدر بنیادی فرق ہے۔ لہذا، اس فرقے سے متعلق حضرات، یا وہ حضرات جو اس قسم کا نظریہ رکھتے ہوں ہماری تحریک میں شامل نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی ہماری بزموں میں اس قسم کی بحثیں چھڑنی چاہئیں۔ اس سے خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

احتسابِ خویش

عزیزانِ گرامی قدر! اب مجھے ان خارجی امور سے آگے بڑھ کر، اپنی داخلی دنیا کی طرف آنا چاہیئے۔ قرآن کریم نے اہلِ کتاب کے پیشوایانِ مذہب کے متعلق کہا تھا کہ

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○ (2/44)

تمہاری حالت یہ ہے کہ لوگوں کو تو بھلائی کی تلقین کرتے ہو، لیکن خود وہ کچھ نہیں کرتے جو دوسروں سے کہتے ہو۔ حالانکہ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم کتابِ خداوندی کا اتباع کرتے ہو۔ تم اگر ذرا بھی عقل و بصیرت سے کام لو تو یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اتباعِ کتاب کا پہلا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیئے کہ خود تمہاری اپنی اصلاح ہو۔ لیکن تم ہو کہ دوسروں کی اصلاح کے پیچھے تو لٹھ لئے پھرتے ہو، لیکن اپنی اصلاح کی کوئی فکر ہی نہیں کرتے۔

عزیزانِ من! ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ کیا قرآن کریم کا یہی اعتراض خود ہم پر تو وارد نہیں ہوتا؟ میں نے یہاں تک حالات کا جائزہ لیا ہے۔ ہم میں بیشتر احباب ایسے ہیں کہ قرآنی فکر ان کے دماغ تک تو پہنچی ہے لیکن ان کے قلب میں نہیں اتری۔ قرآن کے الفاظ میں — وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ

فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ۔۔۔ یاد رکھئے! قرآن کریم کا حقیقی مقصد انسان کی سیرت و کردار میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اور یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک قرآنی فکر انسان کے قلب کی گہرائیوں تک نہ اترے۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت لطیف نکتہ کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ بعض جرائم ایسے ہیں جو معاشرہ میں بالبداہت معیوب قرار دیئے جاتے ہیں ۔۔۔ مثلاً شراب نوشی، قماربازی، فحش کاری وغیرہ ۔۔۔ اس قسم کے جرائم سے مجتنب رہنا نہایت ضروری ہے۔ لیکن فقط ان سے اجتناب سے سیرت و کردار میں تبدیلی نہیں آجاتی۔ ہم اپنے بچپن کی غلط تعلیم و تربیت اور ماحول کے اثرات سے بہت سی نفسیاتی پیچیدگیاں (COMPLEXES) اور تحت الشعوری گرہیں (INHIBITIONS) لے کر پروان چڑھتے ہیں۔ قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ وہ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ان تمام نفسیاتی عوارض کو دور کر کے ایک متوازن شخصیت (BALANCED PERSONALITY) عطا کر دیتا ہے۔ سیرت و کردار کی بلندی، متوازن شخصیت ہی کا دوسرا نام ہے ۔۔۔ محسوس جرائم ۔۔۔ شراب نوشی، قماربازی، فحش کاری وغیرہ سے مجتنب رہنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اس میں تو خود سوسائٹی کی نظروں میں گر جانے کا خیال بھی روک تھام کا باعث بن جاتا ہے۔ لیکن نفسیاتی پیچیدگیاں اور تحت الشعوری عوارض، وہ غیر محسوس شیاطین ہیں جو انسان کے خون میں حلول کئے ہوتے ہیں۔ انہیں وہاں سے نکالنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ اور جب تک یہ نہ نکلیں، انسان کی سیرت میں توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایک غیر متوازن شخصیت کس طرح خود بھی جہنم میں رہتی اور اپنے وابستگان دامن کو بھی جہنم کے عذاب میں مبتلا رکھتی ہے، اس کا تجربہ ہمارے گھروں کی زندگی اور نجی محفلوں سے لگ سکتا ہے ۔۔۔ ایسے لوگ آپ کی نگاہ میں ہوں گے جن میں اس قسم کا کوئی عیب نہیں جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ صوم و صلوٰۃ کے بھی پابند ہوں گے۔ لیکن اتنی سی بات سے کہ انہیں اپنے آپ پر کنٹرول نہیں انہوں نے اپنے گھر کو جہنم اور دوستوں کی محفل کو "ضیق النفس" کا مریض بنا رکھا ہوگا۔ یہ کیا ہے؟ ۔۔۔ وہی نفسیاتی پیچیدگی، جو تحت الشعور میں جاگزین ہے۔ ایسے لوگ، شراب خوری اور فحش کاری کو تو جرم (گناہ) سمجھتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی کمزوریوں کو اپنی "عادت" کہہ کر خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔ قرآن کریم ان نفسیاتی عوارض کا علاج کر کے، انسانی شخصیت کو متوازن بنا دیتا ہے۔ اس بات کے پرکھنے کا معیار (کہ کسی کی شخصیت کس حد تک متوازن ہو چکی ہے) یہ ہے کہ اس میں

(علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کا انعکاس کس حد تک ہوتا ہے۔ اسی کو خدا کے رنگ میں رنگے جانا کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں صفاتِ خداوندی (الاسماء الحسنیٰ) کا تذکرہ اس اصرار و تکرار کے ساتھ آیا ہی اس لئے ہے کہ وہ ہماری سیرت کے پرکھنے کا نہایت واضح خارجی معیار بن سکیں۔

سو اے ہمصفیرانِ چمنستانِ قرآنی! اگر ہماری شخصیت میں اس قسم کی تبدیلی نہیں آرہی، تو ہماری قرآن فہمی شاعری کی داد سے زیادہ کچھ نہیں۔ بلکہ اس کا نقصان یہ ہے کہ اس سے انسان اس خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں دوسروں کے مقابلہ میں بہت آگے ہوں۔ اور اس طرح اُن سے نفرت کرنے لگ جاتا ہے۔ جو اس فریب میں مبتلا ہو دا سے سمجھ لینا چاہیئے کہ اسے قرآن کی بارگاہ سے کچھ بھی بہرہ نصیب نہیں ہوا۔ ہم اگر دوسروں سے آگے ہو سکتے ہیں تو صرف اپنی سیرت کی بلندی کی بنا پر ہو سکتے ہیں۔ محض طلوعِ اسلام کے مسلک سے متفق یا قرآنی فکر سے آشنا ہونے کے زعم پر دوسروں سے آگے اور اونچے نہیں ہو سکتے اس خیالِ خام کو دل سے نکال دیجئے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ جو ہم سے متفق نہیں وہ پاکیزگیٔ سیرت میں ہم سے آگے ہو۔ اس لئے آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ جو شخص طلوعِ اسلام سے متفق نہ ہو، آپ اس سے نفرت کرنے لگ جائیں۔ ہمارے لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم قدم قدم پر اس امر کا جائزہ لیتے جائیں کہ ہمارے گھر کی زندگی میں جنت کا سا سکون ہے یا نہیں۔ احباب کے ساتھ ہمارے تعلقات میں کس حد تک خلوص و یگانگت ہے۔ دوسروں کے ساتھ معاملات میں ہماری دیانت و امانت کی کیا کیفیت ہے۔ جو عہد ہم نے اپنی تحریک کے ساتھ باندھا ہے، اس میں کس حد تک استواری اور وفا شعاری ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ دوسروں کا دُکھ درد بٹانے کے لئے ہمارے اندر کس حد تک ایثار و خود فراموشی کا مادہ ہے۔ اور ایسا کرنے کے بعد، ہمارا نفس کسی قسم کی نمود و ستائش کا متمنی تو نہیں۔ اگر آپ کے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو رہی ہے تو قرآنی فکر سے وابستگی آپ کے لئے نفع بخش ہے۔ اگر ایسا نہیں تو یہ محض تفریحِ طبع سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس صورت میں، لوگ بجا طور پر آپ کو یہ طعنہ دے سکیں گے کہ؎

خزاں تو موردِ الزام ہی سہی، لیکن
یہ فیضِ بادِ صبا بھی تو گل کہیں نہ کھلے!

اور اگر آپ نے اپنے اندر اس قسم کی جنت آفریں تبدیلی پیدا کر لی تو آپ بصد وجد و کیف گل کدۂ قرآنی سے کہہ سکیں گے کہ؎

ابدی باد بہارِ تو کہ در انجمنت
کفِ خاکِ آدم و جوشِ بہاراں رفتیم

حوصلہ افزا

اب میں رفیقانِ محترم! اس بساطِ جائزہ کے اس گوشے کی طرف آتا ہوں جس کا تصور میری روح میں بالیدگی اور جس کا خیال میری نگاہوں میں شادابی پیدا کر دیتا ہے اور جس کی بہار آفرینیوں کو دیکھ کر میرے روئیں روئیں سے آپ احباب کے لئے دعائیں نکلتی ہیں۔ آپ نے سابقہ کنونشن میں طلوعِ اسلام کی اشاعتی اسکیم کو اپنے پروگرام کی بنیادی کڑی قرار دے کر اس ضرورت کو پورا کیا جس کی کمی ہماری فکر کی راہیں روکے کھڑی تھی۔ اس اسکیم نے جو خوشگوار نتائج پیدا کئے ہیں، اس کے متعلق میں ذاتی طور پر اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اس سے میری عمر برسوں بڑھ گئی ہے۔ میرے حوصلے پھر سے جوان اور میرے ولولے تازہ دم ہو گئے ہیں۔ اس نے ملک کی فضا کو کس حد تک متاثر کیا ہے اس کا اندازہ قدم قدم پر لگایا جا سکتا ہے۔ قوم کے اہلِ فکر و نظر طبقہ نے اب اسی نہج پر سوچنا شروع کر دیا ہے حتیٰ کہ خود محراب و منبر بھی مجبور ہو رہے ہیں کہ اپنی افسانہ طرازیوں — اور داستان گوئیوں کو چھوڑ کر، قوم کے سامنے حقائق پیش کریں۔ اس لئے کہ اب قوم اُن اساطیرِ کہن کو سننے کے لئے تیار نہیں۔ مذہبی پیشوائیت کا تقدس دلوں سے اُٹھ چکا ہے اور ان کا وجود محض ایک معاشرتی رسم بن کر رہ گیا ہے۔ آپ جہاں جائیں گے، دیکھیں گے کہ الفاظ کچھ ہی کیوں نہ ہوں، روح ہر جگہ طلوعِ اسلام کی بول رہی ہے۔ بلکہ اب تو الفاظ اور اصطلاحات بھی اسی سے مستعار لی جا رہی ہیں ؎

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ملک میں خالص فکری تحریک آپ کی ہے، باقی سب وقتی ہنگامہ آرائیاں ہیں، جن میں اسلام کا نام اس طرح لیا جاتا ہے جیسے خطوں کی پیشانی پر (۷۸۶) لکھ دیا جاتا ہے کہ اسے نفسِ مضمون سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، بالسے اپنی مفاد پرستیوں کے لئے بطور

سپر استعمال کیا جاتا ہے۔ سلطانی ہو یا درویشی، اسلام کو ہر جگہ (EXPLOIT) کیا جاتا ہے، اس کے درد کا مداوا کوئی نہیں سوچتا۔ حقیقت یہ ہے ؎

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے
گلوں کے چاک گریباں کی بات کون کرے

یہ بات آپ ہی کرتے ہیں۔ اور آپ کا پروگرام ہی یہ ہے کہ آپ گلوں کے رنگ اور خوشبو سے بے نیاز ہو کر، ان کے چاکِ گریباں کی بات کئے جائیں۔ اگر آپ نے اپنی کوششوں کو اسی طرح جاری رکھا تو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ یہ زمین کس طرح اپنے نشو ونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھتی ہے۔ میں عزیزانِ من! بڑا پُر امید ہوں، میری انگلیاں نبضِ زمانہ پر اور میری نگاہیں رفتارِ عالم پر ہیں۔ میں علیٰ وجہ البصیرت دیکھ رہا ہوں کہ دنیا کی قومیں اپنے خود ساختہ معبودوں کے ہاتھوں تنگ آچکی ہیں اور اب انہیں کسی ایسے آستاں کی تلاش ہے جہاں پہنچ کر وہ دل کے پورے سکون و اطمینان سے کہہ سکیں کہ ؎

از برائے سجدۂ عشق آستانے یافتم
سرزمینے بود مقصود، آسمانے یافتم

باقی رہی اس فکر کی مخالفت۔ سو میرے عزیزو! میرے رفیقو! میرے ہمسفرو! قرآنی فکر و نظام کے خلاف یہ یورشیں صرف چند روزہ ہیں۔ آپ اسی طرح ہمت کئے جائیے، یہ ریت کے ذرّوں کی طرح منتشر ہو جائیں گے۔ یہ روئی کے گالوں کی طرح اڑ جائیں گی۔ یہ دریا کی جھاگ کی طرح بہہ جائیں گے۔ یہ خس و خاشاک کی طرح خاکستر ہو جائیں گی۔ آپ اس حقیقت پر یقین رکھئے کہ

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے!

ہم کسی پارٹی کے حریف نہیں، ہم کسی تنظیم کے رقیب نہیں ہم خدا کی کتابِ عظیم کی شمعِ فروزاں کو لے کر اس لئے مصروفِ سفر ہیں کہ اس سے انسانیت کی راہیں روشن ہو جائیں۔ اگر مفاد پرست گروہ اسے اپنی مخالفت سمجھتا ہے تو ہم ان کی خاطر انسانیت کو تاریکیوں میں نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر چمگادڑ طلوعِ سحر سے پیچ و تاب کھاتا ہے تو اس کی خاطر، سورج شب کی رِداؤں کے پیچھے چھپا نہیں رہ سکتا۔

اور جس طرح ہم شپرہ چشموں کی مخالفت سے مرعوب ہو کر قندیلِ قرآنی کو چراغِ تہِ داماں

نہیں بنا سکتے، اسی طرح ہم اس صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر کسی غیر قرآنی راہرو کے پیچھے بھی نہیں چل سکتے قرآنی پرچم کو لے کر اٹھنے والوں کا تو اعلان یہ ہوتا ہے کہ

ہم بدلتے ہیں رُخ ہواؤں کا
آئے دنیا ہمارے ساتھ چلے

ہمارا قافلہ بے شک بے سروسامانوں کا ہے۔ ہمارے پاس متاعِ سفر نہ ہونے کے برابر ہے ہمارے وسائل محدود اور ہمارا سازو یراق ازبس قلیل ہے۔ لیکن ہم نے جس امانتِ خداوندی کو لے کر رختِ سفر باندھا ہے، وہ اس قدر گراں بہا اور عظیم الثمن ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہم ہر رہزن و قزاق کے سامنے سینہ سپر ہو جانے کے لئے تیار ہیں۔ ایسے رہزنوں اور قزاقوں سے فطرت کی بے صوت صدا پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ کہ ؎

ان کو لوٹا تو اجڑ جاؤ گے
جن کا سامان ہے بے سامانی

لہٰذا، میرے مشفق و غمگسار ہم سفرو! قرآن کی اس آواز کو بلند کرتے ہوئے آگے بڑھتے جاؤ، منزل آغوش واکردہ تمہارے انتظار میں چشم براہ ہے۔ ؎

سحر در شاخسارِ بوستانے
چہ خوش می گفت مرغِ نغمہ خوانے
برآور ہر چہ اندر سینہ داری
سرودے، نالۂ، آہے، فغانے

نہ ستائش کی تمنّا نہ صِلہ کی امید

لیکن عزیزانِ من! اس سفر میں ایک گھاٹی ایسی بھی آتی ہے جہاں کوئی باہر کا رہزن ڈاکہ زنی نہیں کرتا وہاں خود اپنے اندر کا چور کمین میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ گھاٹی ایسی ہے جہاں سے پاؤں پھسلے تو انسان سیدھا جہنم کے عمیق غاروں میں جا گرتا ہے۔ اور وہ گھاٹی یہ ہے کہ آپ اس سلسلہ میں جو کچھ کریں اس میں کسی دنیاوی اجر و معاوضہ کا خیال تو ایک طرف، نمود و نمائش کا شائبہ تک بھی نہ آنے پائے، کہ یہ وہ شرک کی

چنگاری ہے جو سب متاع عمل کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے۔ قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کو بڑے بصیرت افروز انداز سے بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ ــــ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ (۱۷/۷)۔ تم کوئی اچھا کام کرتے ہو تو وہ کسی دوسرے کے لئے نہیں، بلکہ خود تمہاری اپنی بھلائی کے لئے ہوتا ہے وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ (۲/۲۷۲)، جو کچھ تم بظاہر دوسروں کو دیتے ہو وہ درحقیقت خود اپنے آپ کو دیتے ہو۔ اب آپ سوچئے کہ کبھی ایسا ہوا ہے کہ تم ایک مکان اپنے لئے بناؤ اور اس کا احسان اہل محلہ کے سر دھرو۔ تم کھانا خود کھاؤ اور اس کے شکریے کے متمنی اپنے دوست سے ہو۔ یہی کیفیت اس کام کی ہے جسے آپ قرآنی تحریک کے لئے کرتے ہیں ــــ خواہ وہ مالی خدمت ہو یا صرف محنت یا ایثارِ وقت ــــ اگر آپ سمجھ لیں کہ یہ سب کچھ آپ اپنے لئے کرتے ہیں تو پھر آپ کے دل میں کسی اجر و معاوضہ کی تمنا یا صلہ وستائش کی آرزو پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن اگر اس سے آپ کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ بیدار ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ ابلیس کا افسوں ہے جس سے وہ آپ کے اعمال کو رائیگاں بنا رہا ہے۔ انسان تو ایک طرف، قرآنی ذہنیت تو اپنے خدا سے بھی یہ کہتی ہے کہ ؎

شانِ عطا کو تیری عطا کی خبر نہ ہو!
یوں بھیک دے کہ دستِ گدا کو خبر نہ ہو!

غریبوں کی دُنیا

اس کے ساتھ ہی ہمیں اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے قافلہ میں بیشتر افراد ایسے ہیں جن کے پاس زادِ سفر تک نہیں۔ وہ اس تحریک کی مالی مدد نہیں کر سکتے۔ لیکن وہ خلوص و صداقت کی اُس متاع عظیم کو لے کر شریک کارواں ہوئے ہیں جس کی قیمت کوئی ادا ہی نہیں کر سکتا۔ ان نادار پیکران صدق و صفا کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد دل کے کانوں سے سن لیجئے کہ اگر آپ کی محفل میں، کسی اشارہ یا کنایہ تک سے بھی، ان غریبوں اور ناداروں کے دل میں یہ احساس بیدار ہو گیا کہ وہ اُن لوگوں کے مقابلہ میں فروتر سمجھے جاتے ہیں جو مالی امداد کرتے ہیں، تو یاد رکھئے، آپ کی وہ محفل ابلیس کی رقص گاہ ہوگی، خدائے رب العالمین کی رحمتوں کی جولانگاہ نہیں ہوگی۔ ان خلوص و صداقت کے پیکروں کو ہماری محفلوں میں بلند ترین مقام ملنا چاہیئے۔ یہ اگر مفلس و نادار ہیں تو اس کے ذمے دار ہم ہیں۔ ہمارا غلط معاشرہ ہے۔

توکیا یہ ظلمِ عظیم نہیں ہوگا کہ ہم اپنے جرائم کی سزا ان بے گناہوں کو دیں؟ یہ سرمایہ داری کا ابلیسی نظام ہے جس میں دولت، معیارِ تکریم قرار پاتی ہے۔ آپ، اس نظام کو مٹا کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی قائم کرنے کے لئے اٹھے ہیں۔ لیکن اگر آپ کے ہاں بھی دولت ہی معیارِ تکریم رہی تو آپ کا ہر دعویٰ باطل اور آپ کی ہر آرزو سراب ہے۔ آپ ابلیس کے اس فریب سے بچئے۔ ورنہ آپ سب کچھ کرنے کے باوجود کہیں کے نہیں رہیں گے۔

ایفائے عہد

آخر میں مجھے ایک اور حقیقت کو بھی سامنے لانا ہے، آپ ملک کے دور دراز گوشوں سے، سفر کی صعوبات برداشت کر کے، یہاں جمع ہوتے ہیں۔ وقت، توانائی، پیسہ، صرف کرتے ہیں۔ تین دن تک باہمی مشاورت کے بعد کچھ فیصلے کرتے اور انہیں قراردادوں کی آئینی شکل دے کر اپنے ساتھ لیجاتے ہیں۔ لیکن اکثر ہوتا یہ ہے کہ یہ قراردادیں آپ کے کاغذات میں لپٹی کی لپٹی رہ جاتی ہیں۔

عزیزانِ گرامی قدر! آپ نے کبھی سوچا بھی ہے کہ آپ کی منظور کردہ قراردادوں سے مفہوم کیا ہوتا ہے؟ ان سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے خدا سے عہد کرتے ہیں کہ ہم (قرآن کی خاطر) یہ کچھ کریں گے۔ اب آپ خود ہی سوچئے کہ جب آپ ان قراردادوں کو عمل میں نہیں لاتے تو آپ بارگاہِ ایزدی میں کس قدر مجرم قرار پاتے ہیں۔ لہٰذا، میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ کسی قرارداد کو پاس کرتے وقت سوچ لیجئے کہ یہ وہ وعدہ ہے جو آپ اپنے خدا سے کر رہے ہیں۔ اس لئے آپ وہی قرارداد پاس کریں جسے آپ نے پورا کر کے دکھا دینا ہو۔ ورنہ "لاکھ روپیہ نہر کو جل" قسم کی رسمی قراردادوں کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ آپ مفت میں عدالتِ خداوندی میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہو جائیں۔

رفیقانِ محترم! میں نے اس ابتدائی نشست میں آپ سے جو کچھ کہنا تھا، وہ کہہ چکا۔ آخر میں میری دعا رہے ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ تمام احباب کو خوش و خرم رکھے اور زندگی کے ہر بلند مقصد میں کامیاب و شادکام فرمائے۔ آپ کی رفاقت میری زندگی کے اس آخری مرحلہ میں، میرے لئے

وجہ صد توانائی اور آپ کی محبت باعث ہزار شکیبائی ہے۔ میری خلوتوں میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اور میری جلوتوں میں آپ کی موجودگی سے یہ عالم کہ

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر!
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

خوشا نصیب ہے وہ رہ نورد جسے اس قسم کے رفقائے کار داں مل جائیں۔ یقین فرمائیے! آپ کے ساتھ ہوتے ہوئے ناساعدت حالات کے جھلاوے میرے لئے ذرا بھی وجہ خوف و باعث ہراس نہیں ہو سکتے۔ میں جانتا ہوں کہ ایک دنیا میری مخالف ہے، لیکن مجھے ان کی مخالفت کا احساس ذرا بھی ستا نہیں سکتا

مجھے غم نہیں ہے اس کا کہ بدل گیا زمانہ
میری زندگی ہے تم سے کہیں تم بدل نہ جانا

اور میں اسی یقین کے سہارے زندہ ہوں کہ کچھ بھی ہو، تم نہیں بدل جاؤ گے۔ کس قدر حیرت افروز ہے یہ یقین، اور کیسا محکم ہے یہ سہارا ——— خدا اسے ہمیشہ قائم رکھے۔

والسلام
پرویز

---

۱۰ نومبر پہلا کھلا اجلاس

دسویں سالانہ کنونشن کا پہلا عام اجلاس ۲½ بجے دوپہر شروع ہوا۔ تلاوت کلام الہٰی کے بعد محترم پرویز صاحب نے اپنا خطبہ پیش کیا جس کا عنوان تھا — "احادیث کا صحیح ترین مجموعہ جسکے ایک لفظ میں بھی کسی مسلمان کو ذرہ برابر شک و شبہ نہیں ہو سکتا"۔ جب اس خطاب کا اعلان ہوا تھا تو ہر شخص اپنے دل میں سوچتا تھا کہ دیکھیں یہ مجموعہ کونسا ہے اور پرویز صاحب کو کہاں سے ہاتھ

آگیا ہے۔ لیکن جب خطاب سامنے آیا تو ہر شخص نے دیکھا کہ وہ مجموعہ خود اس کے اپنے پاس موجود ہے۔

سامعین سے بھرے پنڈال پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی گئی تو مفکرِ قرآن کے تحقیقی مقالے کی افادیت کا گہرا تاثر ہر سننے والے کے بشرے سے صاف صاف عیاں ہو رہا تھا۔

۱۱ر نومبر (ہفتہ) شب

محفلِ استفسارات

ہمارے دہلوی شاعر نے کہا تھا۔

بجھو دیتا دُ تو تمہیں اللہ کی قسم
یہ کیا ہے صبح سے جو دعائیں ہیں شام کی

لیجئے۔ بالآخر وہ شام آگئی جس کے لئے ایک صبح سے نہیں، ڈیڑھ سال ہر صبح، دعائیں مانگی جارہی تھیں۔ یہ وہ شام ہے جس میں بزمِ استفسارات آراستہ ہونے والی ہے۔ طلوعِ اسلام کنونشن میں اس محفل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں سامعین کو اجازت ہی نہیں، دعوت دی جاتی ہے کہ وہ زندگی کے عملی مسائل سے متعلق جو سوال جی میں آئے، پوچھیں۔ مفکرِ قرآن اس کا جواب اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق دیں گے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ سوالات کس قدر متنوع اور زندگی کے کون کون سے گوشوں سے متعلق نہ ہوں گے — روٹی کا مسئلہ۔ قرآنی نظام نظامِ ربوبیت اور نظامِ سرمایہ داری میں بنیادی فرق۔ آزادیٔ نسواں — عورت کا صحیح مقام۔ شادی میں فریقین کی رضامندی کے حدود — خاندانی منصوبہ بندی۔ نظریۂ ارتقاء۔ تخلیقِ آدم — تعمیرِ خودی۔ توبہ کی حقیقت جیسے فکر انگیز سوالات اور دوسری طرف اس انداز کے بھی کہ — تم مجدّدِ زمان کی بیعت کیوں نہیں کرتے، میں نے جنات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اور تم ان سے انکار کرتے ہو — مُلّا کے مذہب میں کیا خرابی ہے — وغیرہ جیسے استفسارات۔ ان سوالات کے جواب میں مفکرِ قرآن کا انداز بھی منفرد، اور ان کی عام تحریر و تقریر سے جداگانہ ہوتا ہے۔ وہ اس میں دستیق سے دقیق حقائق کو ایسے شگفتہ انداز سے بیان کرتے ہیں کہ اس سے ذہنوں کے پردے چھٹنے اور دلوں کی کھڑکیاں کھلنے کے ساتھ ہی، معترض کی طبیعت میں شگفتگی اور بشاشت پیدا ہو جاتی ہے اور

بعض اوقات پوری کی پوری محفل زعفران زار بن جاتی ہے۔ لیکن اس ظرافت میں بھی کیا مجال جو متانت اور وقار کا دامن ذرا بھی ہاتھ سے چھوٹنے پائے۔ حقیقت یہ ہے کہ مبدا فیض نے اس صاحب فکر و نظر کو فکر کی بلندی، نگاہ کے عمق اور قلب کی کشادگی کے ساتھ، ذوقِ جمالیات سے جو بہرہ وافر عطا کیا ہے اس نے ان کی طبیعت میں عصائے کلیمی کے ساتھ ید بیضا کا نہایت حسین امتزاج پیدا کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اس قدر عمیق اور دقیق سوالات کے جواب میں نہایت برجستہ اشعار۔ بے ساختہ محاورات کا استعمال۔ نادر تشبیہات حسین استعارات۔ ملاحت آمیز مزاح۔ بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس محفل میں شرکت سے استہزاء اور مزاح میں لطیف فرق سامنے آجاتا ہے۔ دوسری طرف نزاکت احساس کا یہ عالم کہ محفل میں طاہرہ بیٹیاں اور بہنیں بھی کافی تعداد میں موجود ہوتی ہیں۔ کیا مجال جو ان کے احترام اور وقار پر کسی قسم کی پرچھائیں بھی پڑ جائے۔ ایسا مزاح جس میں بیٹیاں اور بہنیں بھی برابر کی شریک ہو سکیں ــــ کار ہر دیوانہ نیست۔

اور یہ وجہ ہے جو اس شام کا صبح سے انتظار ہوتا رہتا ہے۔ ڈھلی رات تک یہ محفل کہ جس کا ہر گوشہ دامانِ باغبان و کفِ گلفروش سے کم نہ تھا، جاری رہی۔

---

۱۲ نومبر۔ آخری کھلا اجلاس

پایم بہ پیش از سرِ ایں کو نمی رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست؟

یوں تو طلوع اسلام کنونشن کا آخری اجلاس ہمیشہ "حاصل مشاعرہ" کی حیثیت لئے ہوتا ہے لیکن اس دفعہ پرویز صاحب کے مقالہ کے موضوع "انسانیت کا آخری سہارا" نے اس میں خاص دل کشی پیدا کر دی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دس بجے سے بہت پہلے سارا پنڈال بھر گیا تو طعام گاہ سے میزیں اٹھا کر کرسیاں بچھوا دی گئیں۔ اس پر بھی تنگیٔ داماں گلہ سنج ہوا تو کنونشن کے مندوبین فرش پر بیٹھ گئے۔ اور اس اہتمام کے باوجود، سینکڑوں افراد کو کھڑے رہنا پڑا۔ ٹھیک دس بجے تلاوت قرآن پا

اور کلامِ اقبال کے بعد مُفکّرِ قرآن' اسٹیج پر آئے تو...... قرطاسِ ذہن پر بے ساختہ میر کا یہ شعر منعکس ہو گیا کہ :-

وہ آئے بزم میں، اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

وہ جوں جوں اپنے خطاب میں آگے بڑھ رہے تھے جیسے دورِ آدم سے لے کر عہدِ جانسن تک کی ساری تاریخ انسانیت، ایک دل کش فلم کی طرح پردۂ سیمیں پر جلوہ بار ہے۔ وہ خطاب پیش کر رہے تھے اور سامعین ان کے تبحرِ علمی، رفعتِ فکری اور وسعتِ نگہی کے احساس سے انگشت بدنداں تھے۔ یوں نظر آتا تھا جیسے علم وحقائق کا ایک بحرِ مواج ہے جو اپنی تلاطم خیزیوں سے ایک سمندر کی انتہائی گہرائیوں سے گہر ہائے آبدار کو سطحِ ذہنی پر لا رہا ہے، اور دوسری طرف باطل کے ہر نظام کو خس وخاشاک کی طرح بہائے چلا جا رہا ہے پورے خطاب کے دوران، ساری محفل، واہ ____ اور ____ آہ کا مرقع نظر آتی تھی۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے ۲½ گھنٹہ کے بعد اپنا مقالہ ختم کیا تو سامعین ہی نہیں خود صاحبِ صدر کی آنکھیں بھی نم آلود تھیں اور اپنی اشکبار آنکھوں سے انہوں نے اپنے صدارتی تاثرات کو پیش فرمایا جو بجائے خویش اثر ودرد کی ایک پُرکیف داستان لئے ہوئے تھے ____ ڈیڑھ بجے کے قریب یہ محفل ____ کہ جس میں ساڑھے تین گھنٹے تک کسی شخص نے آنکھ تک نہیں جھپکی تھی ____ یوں ختم ہوئی کہ سامعین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کس عالم سے کس دنیا میں آ گئے۔

پرویز صاحب کا یہ مقالہ کتابچہ کی شکل میں الگ شائع کیا گیا ہے۔ لیکن خطاب کے بعد صدرِ جلسہ' محترم خواجہ شہاب الدین صاحب، مرکزی وزیر' اطلاعات ونشریات نے جو اپنے تاثرات ارشاد فرمائے وہ اس قابل ہیں کہ اس مقام پر درج کر دیئے جائیں۔

تاثراتِ صدارت

حضرات!

میں ادارہ طلوعِ اسلام کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے کنونشن کے اس خلاع

میں شرکت کی دعوت دی، اور اس اجلاس کی صدارت سے نوازا۔ اس تقریب میں شرکت میری زندگی کے یادگار واقعات میں سے ہوگی۔

مجھے محترم پرویز صاحب سے ایک عرصے سے ذاتی تعارف کا فخر حاصل ہے اور اگر مرکزی حکومت سے وابستگی کے سلسلہ کو نسبت قرار دیا جائے، تو، میں کہہ سکتا ہوں کہ ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
اُو بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم!

لیکن ان کے ساتھ معنوی تعارف ان کی قرآنی فکر کے ذریعے ہوا۔ اور یہ وہ تعارف ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ جس کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مجھے اس امر کے اعتراف میں نہ صرف یہ کہ کوئی تامل نہیں بلکہ فخر ہے کہ میں نے ان کی قرآنی فکر سے بہت استفادہ کیا ہے جس کے لئے میں ان کا شکرگذار ہوں۔ یوں تو ان کی تصنیفات میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو بلند علمی پایہ کی نہ ہو، لیکن میری بصیرت کے مطابق، ان میں ان کی "لغات القرآن" اور "مفہوم القرآن" یقیناً صدیوں تک زندہ رہیں گی۔

لیکن علمی تصنیفات کے علاوہ پرویز صاحب کی عملی خدمات بھی کچھ کم مستحق ستائش نہیں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، ہمیں ہندو اور انگریز کے خلاف جو جنگ لڑنی پڑی تھی وہ بجائے خویش بڑی ہمت طلب تھی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ مہیب لڑائی وہ تھی جو اس تحریک کی مخالفت کرنے والے علماء کے ساتھ لڑنی پڑی۔ (ضمناً، یہی لوگ جنہوں نے اس زمانے میں تحریکِ پاکستان کی اس قدر مخالفت کی تھی، اب پوری ڈھٹائی سے کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے اس کی قطعاً مخالفت نہیں کی تھی۔ حالانکہ یہ لوگ، تحریکِ پاکستان کے حامیوں کو جنت الحمقاء میں بسنے والے بتایا کرتے تھے)۔ بہرحال محترم پرویز صاحب نے ان کے خلاف سخت لڑائی لڑی۔ اس لڑائی میں انہوں نے جس معرکہ آرائی کا ثبوت دیا، طلوعِ اسلام کے اس زمانے کے فائل اس پر شاہد ہیں ___ اور یہ وہ زمانہ تھا جب پرویز صاحب انگریزوں کی حکومت میں ہندوؤں کے ماتحت ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ ان حالات میں اس قسم کی کھلی ہوئی جنگ کرنا انہی کا کام ہے۔ لیکن ان کی یہ جنگ تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ختم نہیں ہوئی۔ یہ اب تک جاری ہے۔ اب ان کی یہ جنگ ہے قدامت پرستی کی تاریکیوں کے خلاف

جہادِ مسلسل۔ اس جنگ میں بھی ان کا انداز منفرد ہے۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ ہنگامہ آرائیوں اور شورش انگیزیوں سے آپ فساد تو برپا کر سکتے ہیں لیکن قوم میں صحیح انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا، جب تک قوم کے قلب و دماغ میں تبدیلی پیدا نہ کی جائے۔ اور یہی وہ جہاد ہے جس میں یہ گذشتہ بیس سال سے مسلسل مصروف ہیں اور جس کے نتائج بحمد للہ بڑے خوشگوار ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اس جہاد کو بغیر کسی خارجی امداد کے تنہا جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس جنگ میں ان کی قوت کا راز قرآن مجید کی محکمیت اور اکملیت اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و عظمت پر ان کا یقینِ محکم ہے جس کی ایک جھلک آپ نے ان کے آج کے خطاب میں بھی دیکھ لی ہے۔

قرآن مجید فطرت کے قوانین کی طرح تمام نوعِ انسان کے لئے کھلا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔ جس طرح فطرت اپنے حقائق کے منکشف کرنے میں کوئی بخل نہیں برتتی۔ جو بھی اس کی نقاب کشائی کے لئے ہاتھ بڑھائے عروسِ فطرت مسکراتی ہوئی بے حجابانہ اس کے سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح خدا کی یہ کتابِ عظیم بھی اپنی راہ نمائی میں ما اور شما میں کوئی تفریق نہیں کرتی ــــ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ــــ خدا کا ارشاد ہے، یعنی جو بھی ہمارے بارے میں جدوجہد کرے گا، ہم اسے اپنی طرف آنے والے راستے دکھا دیں گے۔ شرط صداقت کے ساتھ جدوجہد کی ہے اور بس ؎

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

لیکن کسی جدید راستے کی تلاش تو اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان اس راستے کے غلط ہونے کا احساس کرے جس پر وہ چلا جا رہا ہے۔ جیسا کہ پرویز صاحب نے اپنے خطاب میں وضاحت سے بتایا ہے، اس وقت اقوامِ عالم کا ہیجان و اضطراب اس امر کی بشارت دیتا ہے کہ وہ اپنے موجودہ راستوں کی صحت کے متعلق غیر مطمئن ہو چکے ہیں، اس لئے وہ ان کی جگہ ایک جدید راستے کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اور چونکہ وہ اپنے ذہن کے تراشیدہ راستوں کو ایک ایک کر کے آزما چکے ہیں، اس لئے اب امید کی جا سکتی ہے کہ ان کا اگلا قدم اس راستے کی طرف اٹھے گا جسے قرآن مجید نے متعین کیا ہے اور جو کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود کی طرف لے جائے گا۔ اُن لوگوں کا نوعِ انسان پر

احسان ہے جو اس راہ گم کردہ قافلے کے لئے صحیح راستے کی نشاندہی کرتے ہیں - پرویز صاحب یقیناً ان افراد میں بلند مقام رکھتے ہیں۔

میں پھر ایک بار ارباب ادارہ طلوع اسلام کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اس جلسے کی صدارت اور محترم پرویز صاحب کے عمیق خیالات سے مستفید ہونے کا شرف بخشا!

والسلام

شہاب الدین

الوداعی تقریب

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں

محبت کا زمانہ آ رہا ہے

لیجئے! اب فراق کی وہ گھڑی آ گئی جس کی تاب، نہ جانے والے لا سکا کرتے ہیں نہ انہیں رخصت کرنے والا - مفکر قرآن ـــ الوداع کے چند لمحات کی دل گدازی کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جسے نہ زبان سے بیان کیا جا سکتا ہے نہ قلم سے لکھا ـــ لہٰذا اس سعیٔ لاحاصل کی جسارت کیوں کی جائے ـــ اور اس عکاسی کو صاحب فکر کے اس الوداعی پیغام پر کیوں نہ ختم کر دیا جائے کہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد

ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

اور اس کے بعد اب منظر یہ سامنے ہے کہ

آگ بجھی ہوئی اِدھر ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر

کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں